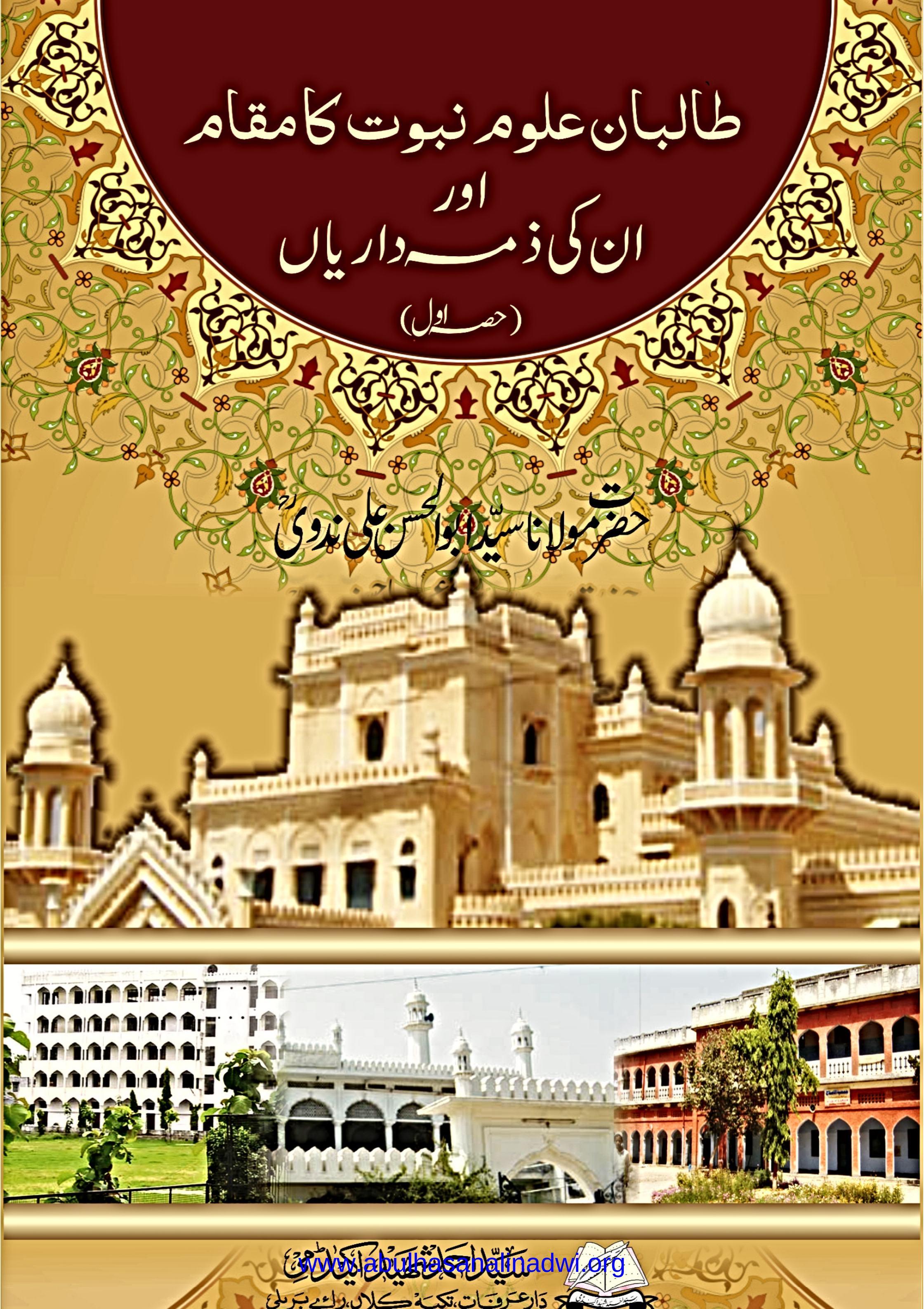
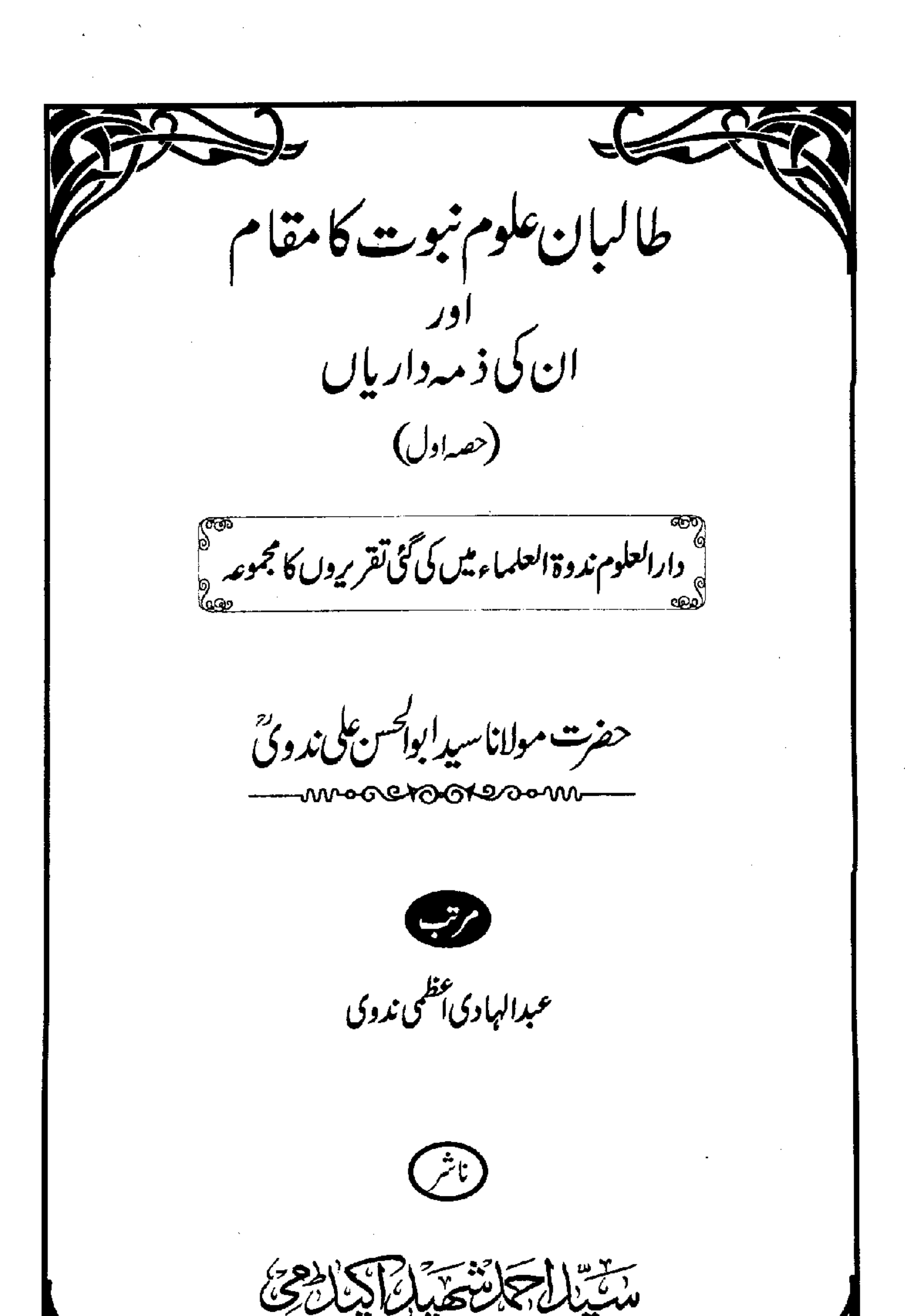


طالبان علوم نبوت کا مقام
اور
ان کی ذمہ داریاں
(حصہ اول)
حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
سیّد احمد شہید اکیڈمی
www.abulhasanalinadwi.org
دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی



طالبانِ علومِ نبوت کا مقام
اور
ان کی ذمہ داریاں

(حصہ اول)

دار العلوم ندوۃ العلماء میں کی گئی تقریروں کا مجموعہ

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ

مرتب

عبد الہادی اعظمی ندوی

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

صفر المظفر ۱۴۳۴ھ - دسمبر ۲۰۱۲ء

کتاب : طالبانِ علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں (حصہ اول)

مصنف : حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

ترتیب : عبدالہادی اعظمی ندوی

صفحات : ۲۴۸

تعداد : ایک ہزار (۱۰۰۰)

سیٹنگ : سید محمد مکی حسنی ندوی

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، رائے بریلی

☆ مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ☆ الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ الجدیدۃ، ندوہ روڈ لکھنؤ

ناشر :

سیّد احمد شہیدؒ اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

فہرس

بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیل رہبانی

(۱۵-۱۷)

عزم صادق اور اخلاص ہر کامیابی کی کلید ہے

خودشناسی اور خداطلبی

تھوڑے دن کی تکلیف اور ہمیشہ کا آرام

(۴۲-۴۵)

عزم اور اخلاص

عالمِ اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ

کثرت مطالعہ کی ضرورت

(۷۹-۸۰)

سارا انحصار تمہارے فیصلہ پر ہے

فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے........

مدارس کا اصل سرمایہ

ایک بڑی ضرورت

تقویٰ اور صبر کامیابی کے دوستون

چار باتیں
(۱۲۴-۱۲۵)

زبان وادب خدمت دین کا مؤثر ذریعہ

زبان وادب سے علمائے دین کا رشتہ

علمی طبقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت پیدا کیجیے!
(۱۴۲-۱۴۵)

حضرت یوسف (علیہ السلام) کے قصہ کا پیغام

زبان وادب کی اہمیت اور اس کی ضرورت

حفاظتِ دین کے مراکز

چراغ سے چراغ جلتے ہیں

فضلائے ندوہ اور ان کی ذمہ داریاں

اپنے کو نیلامی کی منڈی میں نہ پیش کیجیے!

تحفظ دین کا عہد کیجیے!

وقت کا جہاد

ناظم ندوۃ العلماء کا پیغام فارغین ندوہ کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

تعلیم و تربیت کا جو کام مدارس اسلامیہ نے ہر دور میں کیا ہے، اس سے تاریخ پر نگاہ رکھنے والا ہر انسان واقف ہے۔ ان ہی مدارس نے امت کو وہ افراد فراہم کیے ہیں جنھوں نے مشکل سے مشکل ترین زمانہ میں بھی امت کی رہنمائی کا کام کیا اور کشتی کو بھنور سے نکالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان ہی مدارس نے امت کو مجددین و مصلحین بھی فراہم کیے، اور علمائے کبار بھی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان ہی مدارس سے بڑے بڑے مسلمان فلسفی، سائنس داں اور اطباء پیدا ہوئے، فکر اسلامی کے ماہرین اور معتدل مزاج اور فکر رکھنے والے علماء بھی ان ہی مدارس کے فیض یافتہ نظر آتے ہیں۔

اس سلسلہ کی بنیاد زمانۂ نبوت میں پڑی تھی، اور دربار نبوت سے ملے ہوئے اصولوں کی روشنی میں علم کا یہ سفر جو شروع کیا گیا تھا، ساتویں صدی ہجری میں وہ نقطۂ عروج پر پہنچا اور ساری دنیا میں اس کو روشنی پھیلی، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جس جمعیت خاطر اور فکر مندی و اتحاد کے ساتھ یہ عمل جاری تھا، وہ اس طرح جاری نہ رہ سکا اور مسلمان آہستہ آہستہ پیچھے ہوتے چلے گئے، بالآخر زندگی کا سرا ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، اور مدارس میں جس زندگی اور روح کی ضرورت تھی، اس میں کمی ہوتی چلی گئی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اجتماعی انحطاط کے باوجود اس پورے دور میں (جو کئی سو سال پر محیط ہے) ہمیں وہ بڑی بڑی شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ کے کچھ افراد بچے کھچے رہ گئے تھے، جن کو اللہ نے بعد کی صدیوں کے لیے رکھا تھا، جنھوں نے علم و دین کے میدان میں زبردست تجدیدی کام انجام دیے، جن میں ہندوستان کے عظیم مجدد و مصلح حضرت شیخ احمد سرہندیؒ، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مجاہد کبیر امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں۔ لیکن عالمی سطح پر اگر دیکھا جائے تو پوری گہرائی کے ساتھ جو وسعت و کثرت ہمیں ابتدائی آٹھ صدیوں میں نظر آتی ہے وہ بعد

میں نظر نہیں آتی، اس کی بنیادی وجہ مسلمانوں کا باہمی انتشار اور علم سے دوری ہے، جس کی بہت واضح مثال اندلس کی دی جاسکتی ہے جو ایک زمانہ میں علم کا مرکز تھا، لیکن آہستہ آہستہ وہاں کے حکمران آپس کے جھگڑوں میں ایسے الجھے کہ ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہوگئے، اور ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو زیر کرنے کے لیے عیسائیوں سے مدد لینے میں کوئی عار محسوس نہیں کی، اس کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ ہوا، آج کا اسپین کوئی جاکر دیکھے تو وہ خاص یورپ کا ایک ایسا ملک ہے جہاں کوئی اسلامی شناخت نظر نہیں آتی، علمی مراکز اور بڑے بڑے ادارے اپنی تباہی پر نوحہ خواں نظر آتے ہیں۔

کئی سو سال کے علمی جمود کے بعد بیداری کا دور آیا، جس کو ''نہضۃ اسلامیۃ'' کہتے ہیں، علمی ادارے قائم ہوئے، مدارس دینیہ کی بنیاد ڈالی گئی، پھر خاص طور پر ہندوستان میں جہاں انگریزوں نے مسلمانوں کو نشانہ بنایا تھا، علماء کو جگہ جگہ تختۂ دار پر چڑھایا گیا تھا، مدارس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی، مدارس کا اپنی صحیح فکر کے ساتھ باقی رہنا مشکل ہوگیا تھا، علماء نے بڑی حکمت اور دوراندیشی سے کام کیا، لیکن جب ملک آزاد ہوا تو اس کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی گئی کہ مدارس میں پھر وہی روح اور تازگی اور زندگی پیدا کی جائے جو مدارس کا امتیاز رہا ہے، اور ان کو صرف علوم کے تحفظ کا ذریعہ نہ بنایا جائے، بلکہ ان سے تحفظ ملت کا کام لیا جائے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کا بھی یہی بنیادی مقصد تھا: علماء کے اندر اتحاد پیدا کرنا اور ان کے اندر دین کی صحیح روح کے ساتھ زمانہ کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا، اور ایسے افراد تیار کرنا جن کی امت کو ضرورت ہے۔ ندوہ نے ایسے جامع افراد کی کھیپ تیار کردی جنھوں نے دینی تصلب کے ساتھ حالات کو سمجھا، اور ان سے نبرد آزما ہونا نہ صرف یہ کہ سیکھا بلکہ امت کو سکھایا، ان میں دو نام بہت نمایاں ہوئے، ایک سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کا اور ایک مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا۔

حضرت مولاناؒ کو ندوہ کی خدمت کا طویل موقع حاصل ہوا، ان کے صرف دور نظامت کو دیکھا جائے تو وہ تقریباً چالیس سال کی مدت پر محیط ہے، یہ ندوہ کی تاریخ کا زریں دور ہے جس میں ندوہ کی شہرت پوری دنیا میں ہوئی، اور آج دنیا کے مختلف ملکوں میں ندوہ کے فضلاء علمی و دینی کام میں مشغول ہیں، اگر دیکھا جائے تو اس میں حضرت مولاناؒ کے دردِ دل اور فکر مندی کو خاص دخل ہے، حضرت مولاناؒ نے ہر لحاظ سے ندوہ کو مکمل دیکھنا چاہا، اور الحمد للہ اس

میں حضرت مولاناؒ کو بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی، وہ زبانِ ہوش مند، فکرِ ارجمند اور دلِ دردمند کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔

حضرت مولاناؒ نے اس کے لیے جو ذرائع اختیار کیے، ان میں ایک ذریعہ اساتذہ وطلبہ میں مسلسل خطابات کا ہے، اور تقریروں میں حضرت مولاناؒ نے خاص طور پر طلبہ کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے، اور ان کی زندگی کا سراغ دیا ہے، اس میں ان کا مقام بھی بتایا ہے، اور ذمہ داریاں بھی بتائی ہیں۔ حضرت مولاناؒ کی ان تقریروں کا پہلا مجموعہ جس میں ندوہ اور دوسرے اداروں کی تقریریں شامل ہیں ''پاجا سراغِ زندگی'' کے نام سے راقم کے والد ماجد مولانا سید محمد الحسنیؒ نے مرتب کیا تھا، اور اس پر زوردار مقدمہ بھی تحریر فرمایا تھا، اس مجموعہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور عام طور پر طلبہ کے لیے زادِ سفر ثابت ہوا۔

بڑی خوشی اور سعادت کی بات ہے کہ ''پاجا سراغ زندگی'' میں جو تقریریں آنے سے رہ گئی تھیں، یا اس کی اشاعت کے بعد کی گئی تھیں اور مختلف رسالوں میں منتشر تھیں، یا ابھی تک قلمبند بھی نہیں ہوسکی تھیں، وہ سب جمع کی گئیں، اور اب دو حصوں میں ان کو شائع کیا جارہا ہے۔ پہلا حصہ ندوہ میں کی گئی تقریروں پر مشتمل ہے، اور دوسرے حصہ میں وہ تقریریں جمع کی گئی ہیں جو دوسرے مدارس میں حضرت مولاناؒ نے کی ہیں۔ ''طالبانِ علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں'' کے عنوان سے یہ مجموعہ ہدیۂ ناظرین ہے، امید ہے کہ اس سے بھی اسی طرح فائدہ اٹھایا جائے گا جو ''پاجا سراغ زندگی'' سے اٹھایا گیا ہے۔

راقم عزیز گرامی مولوی عبد الہادی اعظمی ندوی سلمہٗ کا مشکور ہے جنھوں نے حضرت مولاناؒ کی تقریروں اور مضامین کو جمع کرنے کا بیڑا اُٹھا رکھا ہے، اور اس سلسلہ کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، اور متعدد کتابیں تیار ہیں، جو ان شاء اللہ جلد ہی شائع کی جائیں گی۔ عزیز موصوف ہر شائق علم کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے حضرت مولاناؒ کی ان چیزوں سے استفادہ آسان بنادیا جہاں تک ہر خاص وعام کے لیے پہنچنا مشکل تھا۔

اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور ان تمام عزیزوں کو بھی اس اجر میں شریک فرمائے جنھوں نے کتاب کی اشاعت کے لیے محنت کی۔

بلال عبد الحی حسنی ندوی

مرکز الإمام أبي الحسن علي الندوي
دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ

بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیل رہبانی

عزیزو! انسانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے حالات کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے رہیں، آپ کے منصب اور آپ کی حیثیت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ آپ کو بار بار یہاں بلایا جائے، اور آپ سے گفتگو کی جائے، لیکن جس طرح پرندہ ساری دنیا سے اپنے آشیانہ کے لیے تنکے چن چن کے لاتا ہے، اور وہ اس بات کو گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کے نشیمن پر کوئی صیاد ڈاکہ ڈالے، اسی طرح ہم اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتے کہ چمنِ دنیا کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے یہ پرندے ضرر رساں صفات اور عادتوں کو اختیار کریں اور اپنی رسوائی کے ساتھ ساتھ ''آشیانہ'' کو بھی نقصان پہنچائیں۔

حالانکہ آپ کے یہاں آنے پر کسی انتخابی توجہ کو دخل نہیں ہے، بلکہ اس پرآشوب زمانہ میں آپ کو علم نبوی حاصل کرنے یہاں آنا خود آپ کے منتخب ہونے کی دلیل ہے، یہ آپ کے والدین کی عظیم قربانی ہے کہ انھوں نے آپ کے مستقبل کی معاشی اعتبار سے پرواہ نہ کرتے ہوئے آپ کو دین سیکھنے کے لیے وقف کردیا، اگر ہمارے پاس ایک جمِ غفیر ہوتا تو ہم کو کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کتنے بھی ضائع ہوجاتے، لیکن ان حالات میں جب کہ انسانوں کے اس جنگل میں تم جیسے لوگ ملنا ایک بہت تلاش و کاوش کی بات ہو، تم ہمارے لیے گو ہر شب چراغ کی حیثیت رکھتے ہو، ہم اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتے کہ تم میں سے ایک بھی دانہ ضائع ہوجائے، ہم چاہتے ہیں کہ تم میں سے ہر ایک اس زندگی کے میدان میں ایک مردِ کامل کی حیثیت سے نکلے اور کارہائے نمایاں انجام دے، ایسی صورت میں جب تم ہمارے خیالات اور توقعات کے برعکس کوئی کام کرتے ہو تو ہم کو بعینہ ایسی ہی تکلیف پہنچتی ہے جیسے کہ

کوئی شخص نہایت محنت و مشقت اور مشکلات برداشت کر کے ایک محل بنائے اور کوئی ظالم اس کو ڈھانے کا ارادہ کرے یا ڈھادے، اس لیے ہم اس بات کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ تم ہماری امیدوں کے اس شیش محل کو ذرا بھی ضرر پہنچانے کا باعث بنو، نوجوانوں نے تاریخ میں کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اور زمانے کی کس طرح قیادت و رہنمائی کی ہے، اس کا تم کو اچھی طرح علم ہے، تمہارے سامنے رافع بن خدیج، سمرۃ بن جندب، عمیر بن ابی وقاص، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، محمد فاتح وغیرہ کی اولوالعزمانہ زندگی موجود ہے، اور تم صرف ان کے حالات زندگی کے مطالعہ کرنے والے نہیں، بلکہ ان کی اس تاریخ ساز شجاعت، بہادری، مردانگی، حوصلہ مندی، جرأت گفتار و صلابت کردار کے وارث اور امین بھی ہو، یہ تمھارے آباء واجداد ہیں، تمھارا ان سے نسلی اور ملی رشتہ بھی ہے، اب اگر اولاد صالح اور نیک ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ان پرکھوں کے نام کو ان کی صفات حسنہ کو اپنے کردار میں جگہ دے کر بلند و بالا اور قائم و دائم رکھے، ورنہ ہم ان کے صحیح وارث کہلائے جانے کے حقدار نہیں ہو سکتے۔

عزیزو! قوموں کی صلاحیتوں اور ان کی عظمت کا دارومدار ان کی جسمانی وضع، فارغ البالی یا اور کسی مادی تفوق پر موقوف نہیں ہوا کرتا، بلکہ ان کے جذبات و خیالات اور ان کے بلند عزائم پر موقوف ہوا کرتا ہے، کسی بھی قوم کا نوجوان اپنے نئے اور بلند عزائم اور اپنے پاکیزہ جذبات سے قوم میں ایک نیا خون دوڑا دیا کرتا ہے، جب بھی کسی قوم پر کوئی پرآشوب وقت اور ناگہانی مصیبت آجایا کرتی ہے، اس وقت اس قوم کے نوجوان سنجیدہ ہو جایا کرتے ہیں، وہ اپنے عمل اور اپنے کردار سے قوم کی زندگی میں ایک نئی روح دوڑا دیا کرتے ہیں، آج ایسا ہی پرآشوب دور مسلم قوم پر آپڑا ہے، آج ساری قوم میں ایک مردنی اور یاسیت کی کیفیت چھائی ہوئی ہے، قوم اپنے نوجوانوں کی طرف حسرت اور امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے، آج تم کو چاہیے کہ اپنی قوم کی ان توقعات کو پورا کرو، اور اپنے عمل و کردار سے ثابت کر دو کہ مسلم قوم کی کوکھ ابھی سوکھی نہیں ہے، اس مٹی میں نمی کی کسر ہے، اگر اس میں کردار کی حرارت اور اخلاق کی گرمی، قربانی و ایثار کی نمی پیدا کر دی جائے تو آج بھی یہ مٹی بہت زرخیز ہے۔

نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اور جو صلاحیتیں اور چیزیں تمھارے بزرگوں میں نہیں ہیں، وہ اپنی محنتوں سے اپنے اندر پیدا کرکے اپنی قوم کی باگ دوڑ سنبھالیں، آج مسلم قوم جس نازک دور سے گزر رہی ہے، مسلمان نوجوانوں کو عموماً اور طالبانِ علومِ نبوت کو خصوصاً چاہیے کہ وہ اس کا احساس کریں۔

عزیزو! میں پھر کہتا ہوں کہ تم اپنی ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالو، اور دیکھو اور غور کرو کہ تم کون ہو، تم محمد بن قاسم کے وارث ہو، تم طارق بن زیاد کے وارث ہو، تمھاری رگوں میں دنیا کے فاتحین کا خون دوڑ رہا ہے، تمھارے تقدس کی فرشتے بھی قسم کھاتے تھے، میرے عزیزو! اپنے بزرگوں کی ثقافت اور ان کی شرافت کو دھبہ نہ لگاؤ، ان کی روحوں کو قبر میں شرمندہ نہ کرو، تمھاری اپنی روشن تاریخ ہے، تمھارا اپنا تابناک ماضی ہے، اور اب تم جس ادارہ میں آئے ہو، اس کی بھی کچھ روایات ہیں، تم اپنی خوش قسمتی سے اس کے بھی وارث بنائے گئے ہو، تم شبلیؒ کے خواب کی تعبیر ہو، تم محمد علی مونگیریؒ کی علمی خدمات کے امین ہو، تم سے کسی بھی قسم کی رکیک حرکت کی شکایت کرنا انتہائی شرم کی بات ہے۔

میرے عزیزو! دیکھو کہ زمانہ تم سے کیا چاہتا ہے، وہ کس قسم کی حرکات کا تم سے متوقع ہے، اگر تمھارے اوپر یہ حقیقت منکشف ہوجائے کہ آج کل کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اور گتھیوں کو سلجھانے لیے کس قسم کی پاکیزہ انگلیوں کی ضرورت ہے، جن کے ذریعہ مسائل کی پیچیدہ گتھیوں کی گرہ کشائی کی جائے، تم یقیناً لہو ولعب سے ہی اجتناب نہیں کرو، بلکہ بزرگوں کی طرح دن رات فکر کے سمندر میں غوطہ زن رہو، اور قوم کا غم تمھیں ایک پل بھی چین سے رہنے نہ دے، کاش کہ یہ غم اور بے چینی تمھاری زندگی کا حصہ بن سکے اور تم دنیا کی نجات کا ذریعہ بن سکو۔ (۱)

---

(۱) ۱۹۶۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کچھ مخصوص حالات پیدا ہوجانے کے سبب منعقد ایک ہنگامی جلسہ میں طلبۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سامنے کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا اشفاق مشہدی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ہفت روزہ ''ایاز'' بھوپال، (شمارہ ۱۶/ جون ۱۹۷۴ء)۔

عزم صادق اور اخلاص ہر کامیابی کی کلید ہے

عزیز طلبہ! یہ آپ کا تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے، اور ہر طرح مناسب ہے کہ سال کے شروع میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کی جائیں، اور قیام و تعلیم کے کچھ مشورے دیے جائیں، آپ کو زیادہ یقین دلانے کی ضرورت نہیں کہ جو اچھی سے اچھی باتیں ہو سکتی ہیں، اور زندگی کے سارے مطالعے اور تجربات کا نچوڑ ہو سکتا ہے، وہ آپ کے سامنے رکھا جائے گا، اس لیے کہ ہر وہ قیمتی سے قیمتی بات جو برسوں کے تجربہ کے بعد حاصل ہوتی ہے اور جو مدتوں سے سینے میں امانت ہے، اگر آپ سے اس وقت نہ کہہ دی جائے تو کس وقت اور کس موقع پر کہی جائے گی؟ میرے نزدیک آپ سے زیادہ اس کا کوئی حقدار نہیں ہے۔

یوں تو باتیں بہت کچھ کہنے کی ہیں، لیکن میں جس وقت یہ خیال کرتا ہوں کہ مجھے ان عزیز طلبہ سے خطاب کرنا ہے جو بہت دور سے اپنے سینوں میں بہت سی امیدیں لے کر آئے ہیں، اور جن کے والدین نے بہت سی توقعات وابستہ کر کے ان کو بھیجا ہے، تو مجھے اچھی خاصی کشمکش پیش آتی ہے، کہ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں، پھر بھی ہر چیز کی ایک خوراک ہے، اگر خوراک سے زیادہ دوا دی جائے تو بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوتا ہے، میرا تجربہ ہے کہ جب باتیں زیادہ ہوتی ہیں تو انسان کا ذہن ان کو برداشت نہیں کر پاتا، اور وہ اس کو بھول جاتا ہے، اس لیے اگرچہ میرے ذہن میں اس وقت بہت سی باتیں ہیں، لیکن میں ان میں سب سے اہم اور ضروری باتیں کہوں گا۔

سارا دارومدار آپ کی محنت اور طلب پر ہے

پہلی بات یہ ہے کہ عام طور سے جب کسی مدرسہ میں طلبہ کا استقبال کیا جاتا ہے تو ان

سے کہا جاتا ہے کہ اس مدرسے میں آپ کے مقصد کی تکمیل کے لیے ہر قسم کا سامان مہیا ہے، بہترین اساتذہ موجود ہیں، شفیق مربی ہیں، کھانے اور رہنے کا معقول انتظام ہے، اور سب سے بڑھ کر تعلیم کا ماحول ہے، لیکن میں آج آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ اس مدرسہ کی کیا خصوصیات ہیں، یہاں کیسے کیسے فاضل اساتذہ موجود ہیں، تعلیم و تربیت کا کیا سامان مہیا ہے، کتنا وسیع کتب خانہ ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ان تمام باتوں کا یہاں معقول ترین انتظام ہے، میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں، لیکن میں جان بوجھ کر آپ سے یہ باتیں نہیں کہوں گا، اس لیے کہ اس سے وہ قوت ارادی ظاہر نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے، اس سے طالب علم کے اندر اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں جس حالت میں بھی رہوں، ارادہ کروں یا نہ کروں، درس میں محنت کروں یا نہ کروں، منزل مقصود پر بہر حال پہنچ جاؤں گا۔

میں اس وقت اپنے لیے ایک نازک راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں، جو ممکن ہے میرے حق میں مضر ہو، لیکن میں بصراحت کہتا ہوں کہ یہاں جو کچھ بھی ہوگا، وہ آپ کی محنت، جذبہ اور عزم سے ہوگا، اگر مجھے یہ اطمینان ہوتا کہ آپ کشمکش اور غلط فہمی میں نہیں پڑ جائیں گے، تو میں کہتا کہ یہاں آپ کو عالم فاضل بنانے کے لیے یا آپ کی امیدوں کو پورا کرنے کے لیے کوئی سامان نہیں، لیکن اس پر زور دینے سے اندیشہ ہے کہ معلوم نہیں آپ کیا سمجھ بیٹھیں، آپ میں ہر قسم کے لڑکے ہیں، بڑے بھی ہیں اور چھوٹے بھی ہیں، ذہنوں میں تفاوت ہے، پھر بھی بالکل صفائی سے کہوں گا کہ یہاں جو کچھ بھی ہوگا، آپ کی محنت سے ہوگا، آپ کے جذبہ اور عمل سے ہوگا، اگر آپ کے اندر یہ جذبہ ہے کہ آپ یہاں سے عالم فاضل بن کر جائیں، علوم اسلامیہ کی خدمت کریں، دنیا کے گوشے گوشے میں دین کی اشاعت کریں، علوم اسلامیہ کے کسی شعبہ میں مہارت پیدا کرنا چاہیں تو یہ آپ ہی کی محنت سے ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں ہوسکتی، میرا تاریخی تجربہ ہے اور آپ بھی جب کبھی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوں گے تو آپ کو تاریخ میں کچھ شخصیتیں ابھری ہوئی نظر آئیں گی، تاریخ میں بھی اونچ نیچ ہے، جس طرح آپ کی زمین اونچی نیچی ہے، اسی طرح تاریخ بھی ہے، تاریخ میں

آپ کو کچھ شخصیتیں نظر آتی ہیں جو آپ کے سامنے مجسم بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد و قامت اور عظمت کے پیچھے ہماری پوری تاریخ چھپ گئی ہے، یہ وہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے اپنی محنت وطلب سے یہ کمال پیدا کیا اور جو کچھ بھی حاصل کیا اپنے عزم سے حاصل کیا، بے شک تاریخ میں ان کے اساتذہ کا بھی تذکرہ ملے گا، تاریخ یہ بھی بتائے گی کہ ان پر ان کے اساتذہ کا بڑا احسان ہے لیکن اگر آپ ان کی آواز سن سکیں اور ان کا جذبۂ احسان مندی وتشکر اس کی اجازت دے تو وہ یقیناً یہی کہیں گے کہ عزیزو! اساتذہ کے فیض کا انکار نہیں ہے، لیکن ہمیں جو کچھ ملا ہے ہماری محنت سے اور ہمارے عزم سے ملا ہے، اور تمہارے لیے کارآمد بات یہی ہے، صحابہ کو چھوڑ کر، اس لیے کہ وہ حضور پرنور (ﷺ) کی کیمیا اثر صحبت کا ثمرہ تھے، تم جس فرد کو بھی دیکھو، تمہیں صاف نظر آئے گا کہ جو کچھ بھی کسی کو ملا ہے وہ اس کو اپنی محنت سے ملا ہے۔

عزیزو! تمہارے لیے لکھ لینے کی بات ہے، اگر اس پورے مجمع میں دو چار دس آدمی ایسے ہوتے جو تمہارے مستقبل کو دیکھ سکتے تو انھیں یہ معلوم ہوتا کہ تم میں جو بھی باکمال نکلیں گے، وہ وہی ہوں گے جنھوں نے آج ہی عزم کر لیا ہے کہ انھیں ساری مشکلات کے باوجود، ساری رکاوٹوں اور دشواریوں کے ہوتے ہوئے، تمام مصائب وآلام کا سامنا کرتے ہوئے باکمال اور صاحب فیض بن کر نکلنا ہے۔

اللہ کا ایک قانون

اگر تمہارے اساتذہ، تمہارے والدین، تمہارا پورا ماحول، غرض کہ دار العلوم کا ذرہ ذرہ یہ طے کر لے کہ فلاں کو امام غزالی بنانا ہے، اول تو کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا، اور نہ کوئی یہاں امام الحرمین جیسا ہے جس نے امام غزالی جیسا حجۃ الاسلام بنا دیا، لیکن اگر دار العلوم ندوۃ العلماء کے سارے ارکان انتظامی بھی یہ طے کر لیں کہ وہ اپنا سارا کاروبار چھوڑ کر، اپنی ساری مصروفیات کو پس پشت ڈال کر زید، عمر، بکر یا کسی بھی طالب علم کو امام غزالی بنا کر دم لیں گے، اور وہ سب کچھ چھوڑ کر یہاں چلے آئیں، اور اللہ کے فضل سے ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے،

ایسے بہت سے اللہ کے بندے موجود ہیں کہ اگر ان کے کان میں ادنیٰ سی بھنک بھی پڑ جائے کہ ان کے یہاں چلے آنے سے ان کا لڑکا اور ان کا چشم و چراغ صاحب فیض ہو جائے گا، تو وہ اس میں ادنیٰ تامل نہیں کریں گے، اور فوراً ساری مصروفیات کو خیر باد کہہ کر یہاں آ جائیں گے، اگر اس باغ کا پتہ پتہ اور زمین کا ذرہ ذرہ غرض کہ ساری خارجی اور داخلی طاقتیں مل کر ایک آدمی پر محنت کریں اور چاہیں کہ تم ایک صالح مخلص اور باعمل بن کر نکلو تو ایسا نہیں ہو سکتا، یہ اللہ کا قانون ہے کہ اس نے ہر انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں کہ جس کو باکمال بننا ہے، اس کے اندر عزم کی صلاحیت بھی ہے، یہ فیض الٰہی ہی نہیں، عدل الٰہی کے عین مطابق ہے، اس نے والدین پر بوجھ نہیں ڈالا، اساتذہ پر ذمہ داری نہیں عائد کی، یہ قانون الٰہی نہیں کہ درخت کوئی لگائے اور پھل کوئی کھائے، جس کو پھل کھانا ہے، اسی کو درخت لگانا ہے اور اس کی آبیاری بھی کرنا ہے، اس لیے میرے عزیزو! یہ تمہاری بڑی ذمہ داری ہے، تمہارے والدین کی دعائیں بے شک مستجاب ہیں، تمہارے اساتذہ کی دعائیں اور دوائیں بے شک کارگر ہیں، کسی مدرسے کا حسن انتظام، کتب خانہ کی وسعت اور خارجی انتظامات ان سب کا اثر پڑتا ہے، لیکن یہ سب مل کر اگر چاہیں کہ کسی کو عالم بنا دیں تو نہیں کر سکتے۔

عزم وارادہ

اگرچہ اس وقت میں اس مدرسہ کی حق تلفی کر رہا ہوں، اور اس کے ساتھ ناانصافی کر رہا ہوں، لیکن میں تم سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر تم یہ سمجھ کر آئے ہو کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ بہت باکمال ہیں، اس کی شہرت بہت زیادہ ہے، یہاں کی سندیں بڑی بڑی جامعات اور یونیورسٹیوں میں مقبول ہیں، یہاں کی تاریخ بہت روشن ہے، اگر تم نے اس میں سے کسی بات پر تکیہ کیا تو تم اسی وقت اس غلط فہمی کو دور کر لو، مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے کہ تم میں سے دو چار دس لڑکے جو اس امید پر آئے تھے واپس چلے جائیں گے، میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ اگر تمہارا خیال ہے محض دروس میں شریک ہونے سے، یہاں رہنے سے، یہاں کی کتابوں کی ورق گردانی سے تم منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے، تو اس غلط فہمی کو اسی وقت دور کر لو۔

ہاں اگر تم نے عزم کرلیا ہے کہ اگر یہ سارا ماحول مل کر میری مخالفت کرے، میرے راستے میں روڑے اٹکائے، لیکن جب تک میری جان میں جان ہے، میں نے عزم کرلیا ہے کہ یہاں سے با کمال اور صاحب فیض بن کر نکلوں گا، میں وہ شخصیت بن کر نکلوں گا جو اس امت کو اس پُرفتن دور میں مطلوب ہے، یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید، اگر تم نے یہ عزم کرلیا ہے تو تمہارے لیے سب کچھ یہیں ہے، تمہارا مکہ یہیں ہے، تمہارا مدینہ یہیں ہے، شام ومصر کا نام کیا لوں، میں سب کچھ دیکھ چکا ہوں، اور ہر وادی سے گزر چکا ہوں ع

مرے دیکھے ہوئے ہیں مشرق و مغرب کے میخانے

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سرزمین تمہارے لیے متبرک ہے، یہ کنواں جو تم دیکھ رہے ہو، یہ زمزم کا کنواں ہے، یہ مسجد جس کے مینارے نظر آرہے ہیں، نعوذ باللہ بیت اللہ ہے، ایسا تو کوئی کافر ہی کہہ سکتا ہے، بلکہ یہ ایک عام شہر ہے جو معصیتوں اور آلائشوں سے پر ہے، فتنوں اور ظلمتوں سے پر ہے، لیکن میں ایک بار کہوں گا کہ تمہارا مکہ یہیں ہے، تمہارا مدینہ یہیں ہے، تمہیں مکہ تک پہنچانے والا راستہ یہیں سے ہو کر گزرا ہے، بلکہ تمہیں علم نبوی کے خزانے تک پہنچانے والا راستہ یہیں ہے۔

اگر تم نے ندوہ کو شیطان کے محل تک پہنچنے کا ایک پل نہیں سمجھا، اگر تم نے یہ نہیں سوچا ہے کہ محمد (ﷺ) کی زبان سیکھ کر، حضرت عمر وحضرت خالد (رضی اللہ عنہما) کی زبان سیکھ کر — جن کی ایک لغزش مستانہ نے ساری دنیا کو ہلا دیا — دنیا کے ٹھیکروں کے حصول کا ایک ذریعہ بناؤ، اگر تم بت خانہ کے آزر نہیں بننا چاہتے تو میں تم سے کہتا ہوں کہ تم کو ابراہیم تک پہنچانے والا راستہ یہی ہے، یہاں سے تم سیدھے بیت اللہ تک جا سکتے ہو، تمہاری عظمت کا خزانہ یہیں ہے، اگر تم نے عزم کرلیا ہے کہ تمہیں یہ خزانہ تلاش کرنا ہے، اپنا خون پسینہ بہا کر اپنے سینہ پر تیشہ چلا کر، تو تمہیں اپنی روزی یہیں ملے گی۔

میرے عزیزو! اسی زمین کے اندر تمہاری قسمت کا خزانہ دفن ہے، اگر تم نکالنا چاہتے ہو تو یہیں سے نکال سکتے ہو، اگر تمہیں نہیں نکالنا ہے تو حرم کی متبرک زمین بھی تمہیں نکال کر نہیں

دے گی، اگر تم غزالی ورازی بننا چاہتے ہو، بات تو بہت بڑی ہے، چھوٹا منھ بڑی بات، لیکن اگر تم نے عزم کرلیا ہے کہ تمہیں غزالی ورازی بننا ہے تو تم یہیں بن سکتے ہو۔

افسوس ہے کہ آج ہمارے مدرسوں میں تو بے دین پیدا ہو رہے ہیں، تارک الصلاۃ پیدا ہو رہے ہیں، اور یونیورسٹیوں میں، لندن و فرانس کے کالجوں میں، یاجوجیت و ماجوجیت کی آغوش میں، بتکدۂ آزری میں ابراہیم پیدا ہو رہے ہیں، جس طرح آزر کی گود میں ابراہیم پیدا ہوئے، اسی طرح آج یورپ کے بتکدے میں ابراہیم کی دعوت کے حاملین پیدا ہو رہے ہیں۔

میرے عزیزو! تاریخ میں جتنی بھی عظیم شخصیتیں نظر آ رہی ہیں، ان کے ساتھ ان کے اساتذہ کا بھی تذکرہ ہے اور ہونا بھی چاہیے، دنیا اتنی احسان فراموش نہیں ہے اور مستقبل کا مورخ بھی جب تمہاری سوانح لکھے گا تو وہ تمہارے اساتذہ کا تذکرہ ضرور کرے گا، لیکن یہ یاد رکھو کہ بغیر تمہارے عزم کے اور بلا تمہاری محنت کے کچھ بھی نہیں ہوسکتا، میں دس سال تک ندوہ میں درس دے چکا ہوں، اور پندرہ سال سے معتمدی و نظامت کے کاموں سے متعلق رہا ہوں، میری اس پچیس سالہ تدریسی و تنظیمی زندگی کا تجربہ ہے، اساتذہ کو جتنا تجربہ ہوتا ہے وہ کسی بھی بڑے سے بڑے ماہر نفسیات کو نہیں ہوسکتا، مجھے معلوم ہے کہ کتنے ہی بچے آتے ہیں ان کے ساتھ ان کے سرپرست آتے ہیں، اس طرح سفارش کرتے ہیں کہ دل بھر آتا ہے، اور ان کو داخل کرنے کے بعد بھی طرح طرح سے ہدایا بھیج کر خطوط کے ذریعہ توجہ دلاتے رہتے ہیں، لیکن وہ بچے بالکل ناکارہ ہوتے ہیں، اس کے برعکس بہت سے بچے ایسے آتے ہیں جو بالکل گمنام ہوتے ہیں، لاوارث ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ان کا کوئی سرپرست بھی نہیں آتا، ادھر ادھر سے پوچھ کر داخلہ لے لیتے ہیں، لیکن وہ باکمال ہو کر جاتے ہیں، اور جب کوئی امتیاز پیدا کرتے ہیں، تب میں ان سے واقف ہوتا ہوں، اساتذہ چاہیں، والدین چاہیں، لیکن بچہ نہ چاہے تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا، اور اگر کوئی نہ چاہے لیکن بچہ چاہے تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔

میرے عزیزو! اگر کوئی لاکھ چاہے کہ میرا بیٹا ایسا ہو جائے اور بیٹے نے نہیں چاہا تو ایسا

نہیں ہوسکتا، کتنے ہی علم دوست بلکہ عالم بادشاہ گزرے ہیں، کیا انھوں نے نہیں چاہا ہوگا کہ میرا بیٹا بھی عالم ہوجائے؟ دور مت جایئے، اورنگ زیب ہی کو دیکھ لیجیے، اشوک واکبر کے بعد کوئی بھی بادشاہ اتنے بڑے تخت کا مالک نہ رہا ہوگا، اور اتنا بڑا علم دوست اور ذی علم بادشاہ کم از کم دہلی کے تخت پر نہ بیٹھا ہوگا، اس نے ملک کے بڑے بڑے علماء کو جمع کرکے فتاوی ہندیہ (جس کو فتاوی عالمگیری بھی کہتے ہیں) مرتب کرادیا، کیا وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا یا نہ کیا ہوگا کہ ان میں چند علماء کو منتخب کرکے اپنے لڑکے اعظم شاہ یا معظم شاہ کی تعلیم پر مقرر کردے، لیکن ان کی اولاد میں کوئی بھی عالم نہ ہوا، کتنے ہی ایسے علماء گزرے ہیں جو عالم ہونے کے ساتھ ساتھ عالم گر اور عالم ساز تھے، لیکن ان کی اولاد عالم نہ ہوسکی، کیا انھوں نے نہ چاہا ہوگا کہ ان کا بیٹا بھی عالم ہوجائے، اور سب سے آخر میں حضرت نوح (علیہ السلام) کی مثال لے لیجیے، جس کے بعد اور کوئی مثال نہیں ہوسکتی، وہ اپنے بیٹے کو نہ شریک حیات کرسکے اور نہ شریک آخرت۔

میرے عزیزو! تم یہ بات لکھ لو کہ اگر تم نے ارادہ کرلیا ہے کہ یہاں سے استعداد پیدا کرکے نکلنا ہے تو تم انشاء اللہ کامیاب ہوگے، میں دیکھ رہا ہوں، تم میں کچھ ایسے طلبہ ہیں جو اس پرآشوب اور معصیت افزوں دور میں صاحب کمال بن کر نکلیں گے، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت عربی زبان و ادب کا جو نصاب موجود ہے، اس سے بہتر نصاب کبھی ہندوستان میں نہیں تھا، یہ میرے گھر کا موضوع ہے، میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں، خود دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی زبان وادب کا اس سے بہتر نصاب نہیں ہوسکا، جیسا کہ اس وقت ہے، نہ عربی زبان وادب کے استعمال کرنے والے ایسے تھے جیسے اس زمانہ میں ہیں، جب میں آج سے بیس پچیس سال پہلے خود ندوہ کا نصاب دیکھتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عربی زبان سے واقف کرانے کے لیے اس نصاب کو کیسے رکھا گیا، لیکن اس نصاب کو پڑھ کر سید سلیمان ندوی نکلے جو علم میں اپنے اکثر اساتذہ سے کہیں آگے تھے، اسی نصاب کو پڑھ کر مولانا مسعود عالم ندوی نکلے جن کو خط لکھتے ہوئے ایک بہت بڑے مستشرق نے لکھا کہ میں آپ کو علامہ لکھ رہا ہوں اگرچہ آپ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے ہیں، لیکن آپ کا علم مجھے

علامہ لکھنے پر مجبور کررہا ہے، اسی نصاب کو پڑھ کر مولانا محمد ناظم ندوی نکلے جن کا آج پورے پاکستان میں جواب نہیں، یہ وہ علماء ہیں جن کا عالم عربی کے ادباء لوہا مان گئے، حالانکہ اس وقت عربی کا ناقص نصاب تھا، لکھنے پڑھنے کے ایسے وسائل مہیا نہیں تھے، نہ کسی عرب سے ملاقات کی نوبت آتی تھی، مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مولوی گنج میں ایک عرب آئے تھے تو ہم لوگ شدرحال کر کے ان سے ملاقات کرنے گئے تھے، لیکن آج تم گھر بیٹھے ریڈیو سن سکتے ہو، اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین پڑھ سکتے ہو، وقتاً فوقتاً عرب وفود سے ملاقات بھی ہوتی رہتی ہے، پھر کیا بات ہے کہ تم میں کوئی مسعود عالم ندوی جیسا اہل قلم پیدا نہیں ہوتا؟ اس کا صرف ایک جواب ہے، وہ یہ کہ ان کو ایک جنون تھا کہ عربی کے اعلیٰ سے اعلیٰ صحافی بنیں، ان کو عربی لکھنے پڑھنے سے دلچسپی تھی، اس لیے وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچے، لیکن آج اتنی آسانیاں ہیں اس کے باوجود تمہاری انشاء کی کاپیاں یا مقالے دیکھتا ہوں تو ڈرنے لگتا ہوں کہ میں خدا کو کیا جواب دوں گا؟ وجہ یہی ہے کہ وہاں عزم تھا یہاں عزم نہیں ہے، وہاں ارادہ تھا یہاں ارادہ نہیں ہے۔

صاحب فیض کی صحبت کی ضرورت

میرے عزیزو! دوسری بات یہ ہے کہ علماء اسلام نے بلاشبہ اپنی تصنیفات میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے، وہ آسمان سے تارے توڑ کر لائے ہیں، اور ان کو کتابوں میں بند کر دیا ہے، اسلام کو یہ فخر ہے کہ اس امت میں ایسے لاتعداد علماء ومصنفین پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے سمندروں کو کوزے میں بند کر دیا ہے، مصنفین اسلام کی یہ ساری تحقیق وجستجو تسلیم، مگر قرآن و حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے میں اعلان کرتا ہوں کہ انسان کے سینے میں جو علوم وفنون موجود ہیں، ان کا ہزارواں حصہ بھی کتابوں میں نہیں آسکا ہے، میری یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ نے انسان کے ذہن، قلب اور دماغ میں جو کمالات ودیعت کیے ہیں، یہ سارے علوم وفنون ان کی ایک فیصدی بھی نمائندگی نہیں کر سکتے، اس لیے کہ جو کچھ ملا ہے وہ انسانوں سے ملا ہے، ہم نے اپنے سارے تجربات کا نچوڑ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور برابر تمہارے نصاب میں

ضرورت کے مطابق ترمیم کرتے رہتے ہیں، اور ہمیں یہ اعتماد ہے کہ اس زمانہ میں بہتر سے بہتر جو نصاب ہوسکتا ہے وہ موجود ہے، لیکن سمجھ لو کہ تم کو جو کچھ انسان سے مل سکتا ہے وہ کتابوں سے نہیں، ایک صاحب فیض کی صحبت، صرف تھوڑی دیر کی صحبت وہ فیض پیدا کرسکتی ہے جو ان سارے کتب خانوں میں نہیں ہے، یہ تسلیم ہے کہ تم اپنے اپنے دماغوں میں علوم و فنون کا خزانہ جمع کرلو، لیکن یہ خزانہ کبھی الحاد و زندقہ کا سبب بھی بن سکتا ہے، اگر اس کے مصرف کو سمجھنا ہے تو یہ کسی انسان کی صحبت سے حاصل ہوگا، ہر چیز کو فائدہ مند بنانے والا اکسیر ذوق ہے، تم بہتر سے بہتر کتابیں پڑھ سکتے ہو لیکن اس کا کیا علاج کہ تم پڑھتے ہو مگر تم میں کوئی اثر نہیں ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ تمھارے اندر وہ ذوق نہیں ہے، تم تاریخ میں نشیب و فراز دیکھتے ہو، کوئی امام غزالی ہے اور کسی کا ہم نام بھی نہیں جانتے، کوئی ابن تیمیہ ہے، اور ان کے زمانے میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو علم و فضل میں ان سے بڑے تھے، لیکن ان کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، فرق معلومات کا نہیں ہے، نگاہ اور ذوق کا فرق ہے، وہی کتاب الٰہی (اور کسی کتاب کا نام کیا لوں) شیخ عبدالقادر جیلانی نے پڑھی اور وہی ان کے معاصروں نے، لیکن ان کی عظمت کا راز معلومات نہیں ہیں، وہ فرق فائدہ اٹھانے کی صلاحیت کا ہے، اور اثر و تاثر کا ہے جو ان کے اندر کتاب اللہ پڑھنے سے ہوتا ہے۔

میرے عزیزو! میں مانتا ہوں کہ تم نے بہت کچھ پڑھ لیا، تم نے تفسیر میں، فقہ میں یا حدیث میں مہارت حاصل کرلی، تقریر بھی سیکھ لی، تحریر کی بھی صلاحیت آ گئی، لیکن وہ ذوق کہاں سے لاؤ گے جو قلب میں تاثر پیدا کردے اور تم کو تڑپا دے ؎

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرور عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

اصل چیز یہ ذوق ہے جس سے تم اچھے برے کو سمجھنے لگو، اور تم میں وہ اخلاص پیدا ہوجائے کہ تم ہر چیز کو اپنے مقصد کے تابع کرلو، اور یہ چیز صحبت سے حاصل ہوتی ہے، تم سمجھتے ہو کہ چند کتابوں کے پڑھنے سے یا درس میں شریک ہونے سے تم باکمال بن جاؤ گے، ایسا

ہرگز نہیں، تم کو ایسے لوگوں کی صحبت کی ضرورت ہے جن کی ایک نظر سے تم بہت سی ایسی چیزوں سے واقف ہوجاؤ جو محض تجربہ کا نتیجہ ہیں، تم اپنے اساتذہ کی صحبت کو غنیمت جانو، اور اس سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

ناشائستہ کاموں سے اجتناب

تیسری بات یہ ہے کہ اس موقع پر مجھ سے یہ توقع کی جاتی ہے اور بجا بھی ہے کہ میں تم سے کہوں کہ تم ایک دینی درسگاہ کے طالب علم ہو، تم میں فلاں فلاں کمزوریاں نہیں ہونی چاہئیں، تم اس درسگاہ کے طالب علم ہو جس سے سید سلیمان ندوی نکلے، مولانا عبدالباری ندوی نکلے، کیا تم سے ایسی امید کی جاسکتی ہے کہ تم کوئی ایسی حرکت کروگے جو تمہارے مقصد کے خلاف ہے؟ اگرچہ تجربے نے مجبور کردیا ہے کہ تم کو ان باتوں سے منع کیا جائے، لیکن پھر بھی میں گوارا نہیں کرسکتا کہ تم سے ایسی بات کہوں، اور اگر میں یہ کہوں تو تم کو احتجاج کرنا چاہیے کہ حضرت ہم ایسے گئے گزرے نہیں ہیں کہ ہم کو ان باتوں سے منع کیا جائے، اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ کوئی شخص کسی ایسے شہزادہ کو سمجھائے جس کے خاندان میں پشتہا پشت سے سلطنت چلی آرہی ہو، اور اس سے کہے: میاں! دیکھو کہیں سڑک پر گری پڑی چیزیں نہ اٹھا کے کھانا، کبھی گری پڑی ہڈیوں کو نہ چبانا، کسی بھنگی کے دسترخوان پر کھانا نہ کھانا، تو اس کا انجام کیا ہوگا کہ وہ مار کر دربار سے نکال دیا جائے گا، تمہاری شان اس سے بھی بلند ہے، تمہارا تعلق سرچشمۂ نبوت سے ہے، تم نبوت کے دسترخوان کے مہمان ہو، جب اس شخص سے اس قسم کی باتیں نہیں کہی جاسکتیں تو پھر تم لوگوں سے کیسے کہی جائیں؟

میں اپنی گفتگو ختم کررہا ہوں اور آخر میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ آپ کا مکہ یہیں ہے، آپ کا مدینہ یہیں ہے، آپ کو عزم کی ضرورت ہے، میں نے شام و مصر بھی دیکھا ہے، جامعہ ازہر اور جامعہ دمشق کو بھی دیکھا ہے، اور میں بہت سی جگہوں کا مشیر بھی ہوں، بہت سی جگہوں کی عاملہ میں ہوں، میں تم کو مدینہ جانے سے نہیں روکتا، اتنا ضرور کہتا ہوں کہ تم پہلے اپنے اندر مدینہ جانے کی صلاحیت پیدا کرلو، تم وقت سے پہلے نہ پکو، پہلے اپنے اساتذہ کی سند

حاصل کرو، اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرو، اور ہم کو مجبور کردو کہ ہم لوگ تم سے خود کہنے لگیں کہ اب تم مدینہ جاسکتے ہو، کسی ایک نحوی نے دوسرے نحوی پر اعتراض کیا تو اس نے جواب دیا: قـــد زبـيـت قبـل أن تـحـصـرم، تم گدر ہونے سے پہلے پک گئے، کہیں تم بھی ایسے ہی نہ ہو جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں جانے پر یہ صدا آئے۔

بہ طواف کعبہ رفتم بحرم رہم نہ داند

تو بروں در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

میرے عزیزو! تمہاری عظمتوں کا خزانہ یہیں دفن ہے، تم اس کو یہیں رہ کر برآمد کرسکتے ہو، اور اس کو اپنے لیے، سارے ملک کے لیے، عالم اسلام کے لیے اور پوری انسانیت کے لیے مفید بنا سکتے ہو۔ (۱)

---

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء میں نئے تعلیمی سال کے آغاز کے موقع پر افتتاحی جلسہ میں سلیمانیہ ہال میں ۶/ مارچ ۱۹۶۵ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا عبدالعلیم بستوی ندوی نے قلمبند کی، اور مولانا معین الدین احمد ندوی مرحوم نے اس کو مرتب کیا، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۱۰/ مارچ ۱۹۶۵ء)۔

خودشناسی اور خدا طلبی

بہت بڑی سعادت

بھائیو اور عزیزو! آپ لوگوں نے جن الفاظ کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا اس کے ہم بہت شکر گزار ہیں، درحقیقت یہ اتنی بڑی دولت ہے جس پر ایک دوست دوسرے دوست کو اور ایک عزیز دوسرے عزیز کو مبارک باد دے سکتا ہے، آپ کے سامنے ہمارے سفر کا تذکرہ کیا گیا، اس موقع پر اگر آپ کے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ ہم اپنے سفر کے حالات سنائیں گے تو یہ بالکل حق بجانب اور قدرتی بات ہوگی، جب کوئی شخص کہیں جاتا ہے اور خاص طور پر ایسے مبارک سفر پر تو وہاں سے اپنے بھائیوں عزیزوں کے لیے تبرک اور سوغات لاتا ہے، اور خاص طور پر حج سے آنے والوں کا تو قدیم رواج ہے کہ وہاں سے تبرکات لاتے ہیں، مثلاً زمزم، کھجور، تسبیح یا مصلے وغیرہ، ہم کو افسوس ہے کہ ہم اپنے عزیزوں کو یہ تبرکات پیش نہیں کر سکے، اس لیے کہ یہ ہمارا سفر اس نوعیت کا نہیں تھا۔

اب اگر آپ کو یہ خواہش ہے کہ کوئی سوغات نہ سہی کم از کم وہاں کے حالات و واقعات ہی سنائے جائیں تو آپ اس میں بالکل حق بجانب ہوں گے، لیکن میں اس وقت آپ کے سامنے اپنے یا اپنے ساتھیوں کے حالات سفر نہیں بیان کروں گا اور نہ یہ بتاؤں گا کہ ہم لوگوں نے وہاں کیا کیا؟ اول تو ہم نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا، وہاں لاکھوں اللہ کے بندے حج کو جاتے ہیں اور ان میں کیسے کیسے اولیاء اور کیسے کیسے خدا رسیدہ بزرگ ہوتے ہیں، ان خدا والوں کے سامنے ہماری کیا حیثیت، لیکن اگر ہم نے وہاں کچھ کیا تو یہ ہمارا فرض تھا، اگر ہم نے وہاں کچھ کہا تو ہم نے اسی دن کے لیے عربی پڑھی تھی اور اسی کے لیے ایک عمر عربی سیکھنے

میں صرف کی تھی، انسان کی اس سے بڑھ کر اور کیا معراج ہو سکتی ہے کہ وہ عربی سیکھے اور پھر اسی کے ذریعے دینی علوم وفنون میں مہارت حاصل کرے، اور پھر جو دولت ان سے حاصل کی ہو بڑی نیازمندی سے سر جھکا کر ان کو پیش کرے اور یہ دولت نہایت ہی تشکر و امتنان کے ساتھ ان کے قدموں پر ڈال دے اور یہ کہے: ''هَذِهِ بِضَاعَتُكُمْ رُدَّتْ إِلَيْكُمْ''، اگر ہم نے کچھ کیا تو یہ ہماری انسانیت کا تقاضا تھا، ہماری شرافت کا تقاضا تھا اور اس خدا کی رحمت کا تقاضا تھا جس نے ہم کو اس لائق کیا۔ اگر ہم رونگٹے رونگٹے سے، عضو عضو سے وہاں خدا کی حمد بیان کریں، اس کے اور اس کے رسول کے احسانات کا اعتراف کریں، اور ہر ہر رونگٹے میں سو سو زبانیں ہو جائیں اور سب بولنا شروع کر دیں، اور وہ زبانیں بھی سحبان وائل کی طرح ہوں، اور دن رات شکر خداوندی کے ترانے گائیں، تب بھی ہم اس بارگاہ کا شکر نہیں ادا کر سکتے، لیکن پھر بھی یہ بہت بڑی سعادت ہے، اور ایک دینی طالب علم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی فخر و مباہات کی بات نہیں ہو سکتی۔

آپ کے لیے سب سے بڑی سوغات

ہم نے عرب میں جو کچھ بھی دیکھا اور سنا ہو، اور جو کچھ بھی احساسات ہمارے دل میں پیدا ہوئے ہوں، لیکن آپ کے لیے یہی سب سے بڑی سوغات ہے کہ آپ اپنی عربیت کو ترقی دیں اور آپ نے جو دولت پائی ہے اور ''لا إلـــــه'' کے جو دو لفظ سیکھے ہیں، یہ لفظ کوئی معمولی لفظ نہیں، جس لفظ نے دنیا میں عظیم ترین انقلاب پیدا کیا اور جس سے بڑھ کر باوقار اور جس سے زیادہ انقلاب انگیز لفظ دنیا کی کسی زبان اور کسی لغت میں نہیں، آپ اپنے اندر اس کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

میرے عزیزو! اگر ان مضمرات پر نظر ڈالی جائے جو تمہارے اندر خوابیدہ ہیں، ان طاقتوں اور عظیم صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جائے جو تمہارے اندر ودیعت ہیں، اور جن کے تم امین ہو، اور اگر کوئی تمہاری ان پوشیدہ صلاحیتوں پر نظر ڈالے تو تمہارے لیے سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ تم اپنے کو پہچانو، اس لعل بے بہا کی قدر کرو جو تمہارے سینے میں چمک رہا ہے، تم

اپنے کو دیکھو، تم میں سے ہر ایک مستقبل میں ایک بڑا عالم، محدث، فقیہ اور مفسر بننے والا ہے، تم اس امانت کی قدر کرو اور پہچانو جو تمہارے اندر ودیعت کی گئی ہے۔

ہمیشہ انسان کی سب سے بڑی ناکامی یہ رہی ہے کہ اس نے موجود کو دیکھا غیر موجود کو نہیں دیکھا، یافت کو دیکھا نایافت کو نہیں دیکھا، موجودات کو دیکھا ممکنات کو نہیں دیکھا، انبیاء نے انسان کو ہمیشہ یہی سبق دیا کہ وہ اپنے کو پہچانے، انھوں نے ہمیشہ ممکنات کی طرف ہدایت کی، انھوں نے ہمیشہ اس عالم سے ماوراء کی طرف رہنمائی کی، انبیاء کے علاوہ کسی نے یہ سبق نہیں دیا کہ اس کے اندر کون سی طاقتیں خوابیدہ ہیں؟ وہ کہاں کہاں پہنچ سکتا ہے؟ وہ کہاں کہاں اپنی کمندیں ڈال سکتا ہے؟ وہ کیا کیا آفاق ہیں، علم کے آفاق، محبت کے آفاق، تسخیر کے آفاق ہیں جہاں انسان پہنچ سکتا ہے؟ انسان کی بہت بڑی بدقسمتی رہی ہے کہ ہمیشہ بتانے والوں نے موجودات کا درس دیا، اسے یہ بتایا کہ وہ کیا ہے، یہ نہیں بتایا کہ کیا ہوسکتا ہے اور کن کن آفاق کی تسخیر کرسکتا ہے؟ یہ ان کی سب سے بڑی خیانت اور کوتاہ نظری تھی، بلکہ اس سے بڑھ کر ایک مجرمانہ سازش تھی کہ انھوں نے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کو چھپانے کے لیے ہمیشہ یہ دکھایا کہ انسان نے کیا کیا پایا اور کہاں کہاں پہنچا، اور کبھی یہ نہیں بتایا بلکہ اگر کسی نے بتانے کی کوشش کی تو انھوں نے اس بات کو ٹالنے کی کوشش کی کہ وہ کیا کیا پاسکتا ہے، انھوں نے ہمیشہ یہ چاہا کہ انسان موجودات کی طرف دیکھے، اس کے اندر تخیل کا جذبہ نہ پیدا ہونے پائے، انھوں نے ہمیشہ تخیل کا گلا گھوٹنے کی کوشش کی تاکہ ان کی بے بضاعتی کا راز نہ کھلنے پائے۔

تم کیا کیا بن سکتے ہو؟

میرے عزیزو! تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم ہمیشہ یہ دیکھتے ہو کہ لوگ کیا کیا بن گئے اور کہاں کہاں تک پہنچ گئے، تم نے یہ کبھی نہ دیکھا کہ ہم کیا کیا بن سکتے ہیں اور کہاں کہاں تک پہنچ سکتے ہیں، اور پھر اس میں تمہاری پرواز بھی کوئی بہت اونچی نہیں، کبھی تو تم اپنی بہادری اور حلقہ سے آگے نہیں بڑھ پاتے، اور کبھی وطن اور معاشرے سے باہر نہیں جاسکتے، تمہارے سامنے ایسی بہت مثالیں ہیں، تم دیکھتے ہو کہ جنھوں نے دین سیکھا اور عربی پڑھی انھوں نے یہ یہ پایا، ان

ان بلند مدارج پر پہنچ گئے، لیکن تم یہ نہیں دیکھتے کہ تم کہاں تک پہنچ سکتے ہو، جنھوں نے اپنے تخیل اور تمناؤں کو زمانے کی کامیابیوں اور پروازوں کے تابع نہیں کیا، وہ کہاں کہاں تک پہنچ گئے، میری سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ تم سمجھو کہ تم کیا بن سکتے ہو؟ اگر کوئی تم سے یہ کہے یا صرف کہتا ہوا گزر جائے اور اس کی معمولی سے بھنک تمہارے کان میں پڑ جائے اور اس پر بھی تم کو شبہ ہو کہ واقعی کسی نے کہا ہے یا نہیں، کہ فلاں جگہ فلاں درخت کے نیچے یا فلاں کمرے میں ایک دفینہ ہے، تم اس کو کس کس طرح تلاش کرو گے اور کس کس طرح راتوں کو چپکے چپکے کھودو گے کہ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے۔

لیکن اگر تم سے کوئی کہتا ہے اور وہ بھی کہنے والا کون؟ خدا کا پیغمبر اور مخبر صادق، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ جس نے خود انسانوں کو پیدا کیا ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ [1] اور وہ کہے جو تمہارے رگ و پے سے واقف ہے کہ تمہارے سینوں میں ایک ایسا دفینہ ہے کہ جیسا کسی نے آج تک دفن نہیں کیا اور نہ نکالا، تو پھر تمہارے اندر ایک جذبہ کیوں نہیں اٹھتا اور ایک شرارہ کیوں نہیں پھڑک اٹھتا کہ تم اس کو نکالنے کی کوشش کرو، تمہارے اندر اللہ نے جو صلاحیتیں رکھی ہیں اور جس طرح تم انسانوں اور دنیا کے اندر محبت و معرفت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتے ہو، تم ساری دنیا کو اپنا گرویدہ اور عاشق بنا سکتے ہو، اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس دفینہ کو نکالنے کے لیے بیتاب اور بے قرار ہو جاؤ، تمہارے اندر کیسے کیسے معلم ہیں، کیسے کیسے مبلغ ہیں، کیسے کیسے ہادی چھپے ہوئے ہیں، تمہارے اندر کیسی کیسی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں، تو تمہارے اندر کیوں نہیں ایسا جذبہ پیدا ہوتا کہ تم اس کو بروئے کار لاؤ، تم جب یہاں آئے تو ایک ان گڑھ پتھر تھے، لیکن خدا نے تم پر احسان کیا اور تم عالم ہو گئے، لیکن تم کو یہ نہیں معلوم ہے کہ تم کیا ہو؟ تم یہ نہیں سوچتے کہ تم کیا کیا بن سکتے ہو؟ اور اگر تم کو یہ معلوم ہو جائے، اس میں بھی خدا کی مصلحت ہے کہ معلوم نہیں ہوتا، اور تم اس سے واقف ہو جاؤ کہ دنیا کو تمہاری کس قدر ضرورت ہے، اور دنیا کس قدر تمہاری منتظر ہے، اور تم کیا کارنامے انجام دے سکتے ہو، تو سچی بات یہ ہے کہ تم اس کو برداشت بھی نہیں کر سکتے۔

---

(۱) سورۃ الملك: ١٤

وہ تریاق جس سے سارے وسائل تمہارے تابع ہو جائیں

میرے عزیزو! تم ایک مدرسے کے طالب علم ہو، تم میں امیر بھی ہوں گے، غریب بھی ہوں گے، اور متوسط بھی ہوں گے، تمہاری استعداد بھی متوسط ہے، اس حیثیت سے تم کوئی خاص قابل قدر نہیں، یہ دنیا یہی سمجھتی ہے کہ تم پڑھ لکھ کر زیادہ سے زیادہ چند آدمیوں کی ہدایت کر سکتے ہو یا اپنے لیے کوئی بہتر راستہ اختیار کر سکتے ہو، اور اس سے کمتر یہ ہے کہ اپنا معاشی مسئلہ حل کر سکتے ہو، یہ تو ہے تمہاری کل کائنات، لیکن یہ کہ کس طرح ہم پیغمبروں کی نیابت کر سکتے ہیں اور دنیا کے درد کی دوا بن سکتے ہیں، یہ کوئی نہیں سوچتا، یہ سب اس لیے ہے کہ ہماری نظر اس سے ہٹ گئی کہ اس سے کیا پا سکتے ہیں، اب تمہارا نصب العین محض یہ رہ گیا ہے کہ یہاں سے نکل کر کسی کالج میں داخلہ لے لیں گے یا کسی یونیورسٹی کا امتحان دے دیں گے، لیکن وہ تریاق جس سے سارے وسائل تمہارے تابع ہو جائیں گے اور یہ ساری یونیورسٹیاں اور ان کے چلانے والے تمہارے تابع ہو جائیں، اس تریاق کی طرف تمہیں کوئی توجہ نہیں، اسلام کی آمد کے بعد سے اور صحابہ کرام کے زمانہ سے لے کر اب تک کوئی ایسا دور نہیں آیا کہ جس میں ایسے نمونے نہ ہوں جن کے لیے اللہ نے دنیا کو مسخر کر دیا، اور اگر کوئی ایسا دور ہو سکتا تھا جس سے ناامیدی کی جا سکتی ہے تو وہ یہ دور ہے جہاں صرف مادیت ہی مادیت ہے، وسائل واسباب ہی اصل سمجھے جاتے ہیں، اس زمانے کے بارے میں شبہ کیا جا سکتا تھا کہ ابھی ایسی مثالیں شاید نہ مل سکیں، لیکن ہمارے اور آپ کے سامنے ایسے نمونے ہیں جنھوں نے اللہ کی رضا کے لیے دینی تعلیم حاصل کی، اور ذرا ہمت کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زمانہ ان کے سامنے جھک گیا۔

تاریخ میں امام غزالیؒ کے زمانہ سے بلکہ اور آگے حسن بصریؒ کے زمانہ سے لے کر اس زمانے تک کوئی ایسا مقام نہیں آیا کہ جس میں ایسے نمونے نہ پائے جاتے ہوں، تمہیں جو نمونے دکھائے جاتے ہیں ان سے یہ نمونے ہزار ہا درجہ بہتر ہیں جن کو تم نے سنا یا پڑھا ہے، یہ سنۃ اللہ ہے، ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا﴾ [1] اور ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ

(۱) سورۃ الأحزاب: ٦٢

تَحْوِیْلًا﴾ (۱)، خدا کتنی طاقت اور تاکید سے فرماتا ہے، ہمارے لیے تو معمولی طور سے بھی کہہ دینا کافی تھا، ہم تو مسلمان ہیں ہمارے لیے تو قرآن کا ادنیٰ اشارہ قابل حجت ہے، لیکن اس کے باوجود اس زور اور تاکید سے فرمایا کہ سنۃ اللہ یہ ہے کہ جب اتنی صلاحیت پیدا ہوجائے گی، جب استحقاق ثابت کرلیا جائے گا، اور ایسے صفات پیدا کر لیے جائیں گے تو انسان کو خاک سے اٹھا کر افلاک تک پہنچا دیا جائے گا، اور مٹی سے سونا، بلکہ سونا کیا وہ تو پھر بھی ایک معمولی چیز ہے، گوہر شب چراغ بنا دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ بار بار اپنے بندوں کے حالات بیان فرماتا ہے، حتیٰ کہ ایک پوری سورۃ ہی اسی بیان میں ہے، کہ جوہر ذاتی انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اور جوہر ذاتی

آپ نے سورۂ یوسف پڑھی ہوگی اور پڑھا نہیں تو سنا ضرور ہوگا، بہت مشہور قصہ ہے کہ ایک انسان کو گمنام کرنے کے لیے جتنے اسباب وذرائع ممکن ہوسکتے ہیں، وہ سب کے سب حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے استعمال کر لیے گئے، انسان کو سب سے زیادہ مدد اس کے گھر اور خاندان سے حاصل ہوسکتی ہے، لیکن ان کی کہانی ہی اس سے شروع ہوتی ہے کہ ان کے بھائیوں نے ہی ان سے دشمنی کی، اور ان کو گھر سے نکالنے اور باپ کی نظروں سے اوجھل کرنے کی پوری کوشش کی۔ جب گھر ہی نے کسی انسان کو رکھنے سے انکار کر دیا ہو تو اس کا کہاں ٹھکانا ہوسکتا ہے؟ ان کو گھر سے نکال دیا گیا، کنویں میں ڈال دیا گیا، لیکن کتنی بڑی آزمائش تھی کہ جن لوگوں نے کنویں سے نکالا وہ دور دراز کا ایک قافلہ تھا اور ان کی قدر شناسی کا یہ عالم تھا کہ اونے پونے داموں میں بیچ ڈالا: ﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ﴾ (۲) اور خریدا کس نے؟ عزیز مصر نے، اور وہ بھی غلام کی حیثیت سے خریدا۔

اور پھر ان پر وہ آزمائش آئی جو ایک نوجوان پر بڑی سے بڑی ہوسکتی ہے، اور ان پر دہ

---

(۱) سورۃ فاطر: ۴۳ (۲) سورۃ یوسف: ۲۰

داغ لگانے کی کوشش کی گئی جس کے بعد انسان شریفوں کی مجلس میں بیٹھ بھی نہیں سکتا اور ان سے باتیں بھی نہیں کرسکتا، سیاسی الزام تو کبھی اور خاص طور سے اس زمانے میں ترقی کا باعث بن جاتے ہیں، بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ انسان سیاسی جرم میں قید ہونے کے بعد مشہور ہوگیا ہے، اور ترقی کے اعلیٰ منازل پر پہنچ گیا ہے، لیکن دنیا کی اور انسانیت کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملے گی کہ کسی پر اخلاقی الزام لگا دیا گیا ہو اور وہ اس طرح چمکا ہو جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام، چنانچہ وہ جیل بھیج دیے گئے، وہاں بھی اخلاقی مجرموں کے ساتھ جن کا کوئی وقار نہیں ہوتا، لیکن اس لعل کی روشنی وہاں بھی پھوٹی اور یہ گوہر وہاں بھی چمکا، انھوں نے اپنی سیرت اور کردار سے ایسا مقام پیدا کرلیا جس سے لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت بیٹھ گئی، انھوں نے وہاں کے اخلاقی قیدیوں کی ہدایت شروع کردی، اور یہ ثابت کردیا کہ جو شخص جیل میں آیا ہے اور اس ناخوش گوار اور تاریک فضا میں مقید کردیا گیا ہے، وہ اس کا مستحق نہیں تھا، بلکہ وہ دنیا کی اعلیٰ ترین منازل کا مستحق تھا، ان کو اسیر زنداں کردیا گیا، جیل کے کٹھرے میں کھڑا کیا گیا، لیکن جوہر ذاتی چمکا اور اپنا بلند ترین مقام پیدا کرلیا، حتی کہ لوگ اس کے پاس آنے لگے اور اپنے اہم مسائل میں رجوع کرنے لگے۔

جیل کے دو ساتھیوں نے خواب دیکھا اور تعبیر پوچھی، آپ نے پہلے تو ان کو رشد و ہدایت کی دعوت کی تبلیغ دین کے فرائض انجام دیے، پھر تعبیر بتائی اور وہ تعبیر صحیح نکلی، اور کچھ ہی دنوں میں ایسا شہرہ ہوا کہ ملک کو اور ارباب ملک کو اس کا احساس ہوگیا کہ جس کو انھوں نے جیل بھیج دیا اس کی تو ملک کو ضرورت ہے، جس کو انھوں نے زنداں میں بند کیا ہے اس کو تو ملک کے اہم ترین مسائل حل کرنے ہیں، چنانچہ ان سے ملکی مسائل میں رجوع کیا جانے لگا، اور بادشاہ نے گزارش کی کہ وہ جیل سے باہر آئیں اور ملکی انتظامات میں حصہ لیں، لیکن صاف کہہ دیا کہ ﴿ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ﴾ [1] تاکہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ مل سکے کہ رعایت اور مراسم کی وجہ سے جیل سے

(۱) سورۃ یوسف: ۵۰

نکالے گئے ہیں، وہ درحقیقت مجرم تو تھے لیکن بادشاہ نے کسی وجہ سے ان کی پردہ پوشی کی اور جیل سے نکال دیا۔ اس بنا پر اس بندۂ خدا نے صاف صاف انکار کر دیا کہ جب تک میرے معاملے کی تحقیق نہیں ہو جائے گی میں جیل سے باہر نہیں ہو سکتا، چنانچہ تحقیق ہوئی اور وہ بالکل بری نکلے اور کہنے والے نے کہا کہ ﴿اَلْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ﴾(۱) تب وہ جیل سے آئے اور نہایت ہی اہم ذمہ داری لی، کہا کہ ﴿اِجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾(۲) کہ خدا نے مجھے حفاظت اور علم کی دو ایسی صلاحیتیں عطا کی ہیں جس کی بنا پر میں اس ذمہ داری کو ادا کر سکتا ہوں، چنانچہ ان کو وزارت خوراک جیسی نازک اور اہم وزارت سپرد کی گئی۔

آپ جانتے ہی ہیں کہ تمام ممالک میں خوراک کا مسئلہ کتنا نازک ہوتا ہے اور خاص کر ہمارے ملک میں تو نہایت ہی اہم مسئلہ ہے، پھر ان کے بھائی ان کے پاس دست بستہ حاضر ہوئے، غلہ لے گئے اور پھر جب انھیں شبہ ہوا تو کہا: ﴿أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوْسُفُ، قَالَ أَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَا أَخِيْ﴾(۳)

زمانہ جوہر ذاتی کے سامنے جھکتا ہے

اس کے بعد یوسف علیہ السلام نے جو دو لفظ فرمائے، میں چاہتا ہوں کہ آپ خوب غور سے سن لیں، یہ ہماری کم ہمتی اور ہماری بزدلی کی سب سے بڑی علامت ہے کہ ہم زمانے کو دیکھتے ہیں، جو نہ کبھی سازگار رہا ہے نہ کبھی سازگار رہے گا، زمانے نے خود بڑھ کر کسی کا استقبال نہیں کیا ہے، جو ہر ذاتی کے سامنے زمانہ جھکتا ہے، اخلاق اور کمال اخلاق زمانے کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بڑھ کر اس کو ہاتھوں ہاتھ لے، انھوں نے جو کچھ کہا وہ قیامت تک باقی رہے گا اور اسی طرح پائندہ و تابندہ رہے گا جیسے اب تک رہا ہے، وہ ہمیشہ ڈوبنے والوں کے لیے سہارا ہے، ہم جو کہتے ہیں کہ زمانے میں ہماری کوئی جگہ نہیں، ہم کو عربی کیوں پڑھائی جاتی ہے؟ ہم یہ بھی کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ اللہ ہمارے والدین کی مغفرت فرمائے، انھوں عربی لائن میں لگا کر ایک بہت بڑی غلطی کی ہے، اور اگر وہ زندہ ہیں تو اللہ ان کو ہدایت نصیب

(۱) سورۃ یوسف: ۵۱ (۲) سورۃ یوسف: ۵۵ (۳) سورۃ یوسف: ۹۰

فرمائے، انھوں نے عربی پڑھا کر ہماری زندگی برباد کی ہے، غرض ہماری شکایات کا ایک دریا ابلتا ہے کہ ہم کو یہاں کیوں بھیجا گیا۔

میرے عزیزو! اگر تم کو دودھ میں رکھا جاتا، اور اشرفیوں سے تولا جاتا، اور ہوا میں اڑایا جاتا لیکن تمہارے اندر جوہر ذاتی نہیں، اخلاق وصفات نہیں، حالات کا مقابلہ کرنے کی قوت نہیں، خدا پر اعتقاد اور اس کی اس بے بہا نعمت پر ناز نہیں، ایمان ویقین کی دولت نہیں، تو یہ کیا دنیا کی بڑی سے بڑی دانش گاہ، بڑی سے بڑی یونیورسٹی تم کو کسی کام کا نہیں بنا سکتی، دیکھو کتنے بڑے بڑے علماء، کتنے بڑے بڑے فضلاء اور کیسے کیسے عظیم الشان بادشاہ گزرے ہیں لیکن ان کی اولاد کسی کام کی نہیں ہوئی، کیا ان کو کسی چیز کی کمی تھی؟ اورنگ زیب عالمگیرؒ کو دیکھ لو کیسے کیسے اساطین علم اور کیسے کیسے ماہرین فن اس کے زمانے میں موجود تھے، اورنگ زیب کو اپنی اولاد کے لیے اچھے سے اچھے اساتذہ کے انتخاب میں کوئی دشواری نہیں تھی، اس کو بڑی سے بڑی دانش گاہ کے قائم کرنے میں کوئی دقت نہیں تھی، لیکن وہ ناکام رہا، اور اس کے شاہزادے معظم شاہ اور اعظم شاہ کسی کام کے نہ ہوئے، لیکن اس کے برعکس ایک غریب ابوحامد الغزالی جس کے باپ نے وفات کے وقت ان کو دوست کے سپرد کر دیا تھا، دوست نے ان کی تربیت کی اور تعلیم دی، لیکن باپ کی دولت ختم ہو چکی تو انھوں نے کہہ دیا: 'اب باپ کی کمائی ہوئی دولت ختم ہو چکی، اب تم جو چاہو کرو، اور جس طرح چاہو تعلیم حاصل کر سکتے ہو، لیکن دنیا نے دیکھا کہ وہ احمد ومحمد کیا بنے، اور اعظم شاہ اور معظم شاہ کیا بنے۔

صبر اور تقویٰ

حضرت یوسف علیہ السلام کا اعلان تمہارے لیے زندگی کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے، ان کو کنویں میں ڈالا گیا، زنداں میں ڈالا گیا اور ان پر سنگین ترین الزام لگایا گیا، غرض کہ دنیا کی ساری طاقتیں ان کی مخالفت کے لیے ابھر آئیں لیکن ان کا جوہر ذاتی چمکا، ان کا جلال، جمال، صداقت اور برتری واضح ہو کر آئی، ان کی عصمت، ان کا استحقاق، ان کی امانت، ان کی وفا آفتاب کی طرح چمکتی ہوئی سامنے آئی، اور انھوں نے کہا: ''قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا'' اور پھر

وہ عظیم سبب بیان کیا جو دنیا کے سارے درد کا درماں ہے، اور ہر انسان کی زندگی کے لیے مشعل راہ ہے، کیا کہا؟ ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۱)

یہ ایک ایسا عظیم جملہ ہے اور ایک ایسا با معنی اور پر تاثیر محرک ہے جو ہر انسان کو ترقی کے اعلیٰ منازل پر پہنچا سکتا ہے، اگر میری رائے مان لی جائے تو میں کہتا ہوں کہ تمام مدرسوں اور اداروں کے دروازے پر یہ لکھ کر آویزاں کر دینا چاہیے، انھوں نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ تقویٰ اور صبر ایسی طاقت ہے جو نامساعد سے نامساعد حالات میں بھی یوسف علیہ السلام کے درجے تک پہنچا سکتی ہے۔

تم سو بار عرب ہو آؤ، دنیا بھر کی سیر کر لو، اور ڈاکٹریٹ کر لو، کیمبرج اور آکسفورڈ کے طالب علم ہو جاؤ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں، قارون اپنے خزانے کے باوجود، فرعون اپنی سلطنت کے ساتھ، اور نمرود اپنے ان تمام وسائل کے ساتھ اور ذرائع کے ساتھ جو اس کے لیے مہیا تھے، ہمیشہ ناکام رہے، لیکن جن لوگوں نے اخلاص وصبر سے کام لیا وہ کامیاب رہے، دنیا کا بڑے سے بڑا عالم، محقق ناکام، لیکن صاحبِ اخلاص وتقوی وصبر کامیاب، اگر وقت اجازت دیتا تو میں نام لے لے کر کہتا کہ فلاں ادیب ناکام، فلاں مفکر ناکام، فلاں مصنف ناکام، اور یہ وہی لوگ ہیں جن کو تم بہت کامیاب سمجھتے ہو، لیکن اللہ کی نظروں میں ان سے بڑا ناکام کوئی نہیں، تاریخ بتاتی ہے اور دوست ودشمن سب اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ عمرؓ کامیاب اور عمر ابن عبدالعزیزؒ کامیاب، اور دنیا کے سارے ملکوں کے صدر ونائب صدر اور وزیر اعظم ناکام، اصل معیار یہی ہے: ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۲) ایک غریب جس کے اندر صبر وتقویٰ کا جوہر ہے وہ کامیاب ہے، اور اگر یہ نہیں ہے تو چاہے وہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، ناکام ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ اعلان صرف ان کے بھائیوں کے لیے نہیں تھا، یہ قیامت تک کے لیے ہے اور خاص طور سے تمہارے لیے ہے، یہ انسان کی ترقی ومحبوبیت اور کامیابی واستغناء کا مقام ہے کہ حکومتیں اس کے سامنے جھکتی ہیں اور درخواست پیش کرتی ہیں،

(۱) - (۲) سورۂ یوسف: ۹۰

لیکن ان حضرات کی استغناء کا یہ عالم ہے یہ باتیں سننا گوارا نہیں کرتے اور ان کو دیکھنا پسند نہیں کرتے، وہ خواب میں بھی اس کو دیکھنا پسند نہیں کرتے، اگر ان حضرات کو خواب میں بھی یہ نظر آ جائے کہ وہ کسی ملک کے اقتدار پر قابض ہیں، وہ کسی کرسی صدارت پر بیٹھے ہیں تو وہ گھبرا جاتے ہیں، مغفرت طلب کرتے ہیں، خدا سے دعائیں مانگتے ہیں، توبہ واستغفار کرتے ہیں کہ اے اللہ! مجھ سے کون سی غلطی ہوگئی ہے جس کے جرم میں مجھے یہ سزا دی گئی ہے؟

تمہاری قیمت

میرے عزیزو! تم دھوکے میں ہو، تم کو تمہارے ساتھیوں نے دھوکہ دیا ہے، تمہارے دماغوں نے دھوکہ دیا ہے، تمہارے ماحول نے تم کو دھوکہ میں مبتلا کر رکھا ہے، تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم ناکام ہو، اگر تم یہ سوچتے ہو کہ تم ناکام ہو تو تم سے بڑا ناکام کوئی نہیں، وہ اسکولوں اور کالجوں کے لڑکے تم سے زیادہ کامیاب ہیں جن کی نظریں محض دنیا کی طرف ہیں، بھلا وہ اپنے پاس ایک پرزہ تو رکھتے ہیں، وہ اپنے ذہن میں دوسری زبان کے چند الفاظ تو رکھتے ہیں، لیکن اگر تمہارے پاس وہ جوہر ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس تھا تو تم سے بڑا کامیاب کوئی نہیں، اس کے سامنے یہ حکومت اور دنیا کے ٹھیکرے اور قارون کے خزانے کیا چیز ہیں؟ اگر کوئی تم سے کہے کہ تم ناکام ہو تو اس کے ایمان میں شبہ ہے، اس کو اپنے ایمان کی خبر لینی چاہیے، اس لیے کہ قرآن تمہاری کامیابی کی ضمانت دے رہا ہے۔

ایک بزرگ تھے، جو لاہور میں ایک مرتبہ ایک خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے، جاڑوں کا زمانہ تھا، اور سب دھوپ کھا رہے تھے اور جوئیں مار رہے تھے، اتنے میں ایک شور ہوا، معلوم ہوا کہ اورنگ زیب کی سواری آ رہی ہے، انھوں نے کہا: لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ، میں سمجھا کوئی جوں پکڑی گئی ہے اور اسی کو مارا ہے، اورنگ زیبؒ سے اس کا تذکرہ کیا گیا تو اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، ان کی نگاہوں میں ہماری اتنی ہی وقعت ہے۔

تاریخ ان واقعات سے بھری ہوئی ہے، ایک بادشاہ آتا ہے خواجہ میر دردؔ کے پاس جو سالک کی حیثیت سے تو کم شاعری کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، پاؤں میں کچھ درد تھا،

بادشاہ نے پیر پھیلا دیا، انھوں نے فوراً ٹوکا کہ آداب مجلس کے خلاف ہے، بادشاہ نے عرض کیا کہ پاؤں میں تکلیف ہے، تو جواب ملا کہ پھر آنے کی کیا ضرورت تھی؟ غرض کہ اس طرح کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں اور ایسے ایسے اللہ والے گزرے ہیں جن کے وہم وگمان میں بھی یہ باتیں آجائیں تو اس کو بہت بڑی بدقسمتی سمجھتے تھے اور ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔

عزیزو! تم نے سمجھا کیا ہے؟ تمہارے اندر میں کیسے کیسے گردوں ہیں، کیسے آفاق و افلاک ہیں، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم سوچ رہے ہو کہ یہاں سے نکل کر کس یونیورسٹی میں امتحان دو گے، کس کالج میں داخلہ لو گے، تم نے اپنی بہت کم قیمت لگائی ہے، تم نے اپنے آپ کو نیلام کی منڈی میں پیش کیا ہے اور یقیناً جو شخص نیلام کی منڈی میں قیمت مانگے گا اس کو بہت کم قیمت ملے گی، لیکن اگر کوئی اپنے گھر پر بیٹھ کر کہے اور یہ اعلان کردے کہ کوئی ہے جو میری قیمت لگائے؟ تو دنیا تمہارے قدموں میں آجائے گی، دنیا ہر ایک کو سمجھتی ہے، اگر تم کہو گے لاؤ تو کوئی نہیں دے گا، اور اگر تم کہو کہ نہیں لوں گا تو سب تم کو دیں گے، اور خوشامد کر کے دیں گے، تم انگریزی کے نہیں عربی کے طالب علم ہو، اگر کوئی ان دونوں علوم کو متوازی سمجھے اور ایک صفحہ پر متوازی خطوط کھینچے، تو یقین مانو کہ مستقبل کے لحاظ سے انگریزی کا خط زیادہ روشن ہے، لیکن اگر تم نے اس کو برابر ماننے سے انکار کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ اس کے لیے یہ صفحہ کافی نہیں، ایک پورے عالم کا اور کائنات کا صفحہ بھی اس کے لیے ناکافی ہے، تو تم قابل قدر ہو، اگر تم نے کہا کہ عربی کی یہ قیمت ہے تو دنیا کہے گی پھر تو ہم کو اس کی کوئی ضرورت نہیں، اور اگر تم کہو کہ ہم قیمت کے طالب نہیں، تو دنیا آئے گی اور کہے گی کہ یہ میرا سب کچھ لے کر میری جھولی میں صدقہ ڈال دو، سچ ہے: ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۱)۔

تسخیر کا نسخہ

اب تمہارے لیے دو راستے ہیں، تم اپنے اندر تقویٰ اور صبر کے صفات پیدا کرو، ربانیت اور اخلاص کے حامل بنو، اور اللہ کی ہدایت اور تعلیم کو جذب کرنے کی کوشش کرو، اور یہ

(۱) سورۃ یوسف: ۹۰

ارادہ کرو کہ تم پڑھ لکھ کر دین اور صرف دین کی خدمت کرو گے، اگر ایسا کرو گے تو وہی ملے گا جو حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا تھا۔ یہ جملہ کسی کے لیے خاص نہیں، بالکل مطلق ہے، ہر عربی جاننے والا اور عربی سے دلچسپی لینے والا اس کے اطلاق کو بخوبی سمجھ سکتا ہے، میدان کھلا ہے جس کا جی چاہے تجربہ کرے، یہ ایک نسخۂ تسخیر ہے جس نے اس کو استعمال کیا وہ کامیاب رہا، ہم میں سے ہر شخص نے اس کا تجربہ کیا ہے، تم بھی اس کا تجربہ کرلو، اخلاص پیدا کرو، اور تقویٰ و صبر کی صفات پیدا کرو، پھر کوئی زمانہ ہو، کوئی ملک ہو اللہ تم کو کامیاب کرے گا، پھر تم کو کوئی شکایت نہیں ہوگی اور تمہاری زبان پر یہ الفاظ ہوں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَنْجَزَ وَعْدَهُ، وَ نَصَرَ عَبْدَهُ، وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ۔

بس میں ان الفاظ پر تقریر ختم کرتا ہوں، اور بجائے اس کے کہ میں اپنا سفر نامہ بیان کرتا، میں دعوت دیتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ تم اس لائق ہو جاؤ کہ خلق خدا تم سے وابستہ ہو، کہ تم خود اس سفر کے لائق بنو، راستہ کھلا ہے تم میں سے ہر ایک اس کو آزما سکتا ہے، بس صرف تقویٰ وصبر، محنت و ہمت کی شرط ہے، کامیابی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے اور یہی سنۃ اللہ ہے، ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلاً﴾۔ (۱)

---

(۱) ۱۹۶۵ء میں سفر حج سے واپسی کے بعد طلبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء کے دیے ہوئے ایک عصرانہ میں کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا عبد العلیم بستوی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ رجون و ۱۰ رجولائی ۱۹۶۵ء)۔

تھوڑے دن کی تکلیف اور ہمیشہ کا آرام

عزیز بچو! تم اس ملت کے نونہال ہو جس کے قیام میں بڑی قربانیاں پیش کرنی پڑی ہیں، تم اس باغ کے پھول ہو جس کو اللہ والوں نے اپنے خون سے سینچا ہے، تم اس دین کے علم وعمل کے طالب ہو جس کے لیے انبیاء (علیہم السلام) نے تکلیفیں اٹھائیں اور صحابہ کرام نے قربانیاں پیش کی ہیں، تم کو اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا ہے، اور اپنے مقام کی لاج رکھنی ہے، بڑے بزدل ہیں وہ لوگ جو مورچہ پر جانے والے سپاہیوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ افسوس تم ایسی جگہ جارہے ہو جہاں گولیاں چلیں گی، توپیں دغیں گی، بم برسیں گے، اور تمھاری جان کو خطرہ ہی خطرہ ہوگا، ایسے موقع پر بہادری اور صحیح ہمدردی یہ ہے کہ اپنے زور بیان سے سپاہیوں کو قربانی کے لیے بے قرار کردیا جائے، اسی طرح تم خود فیصلہ کروگے کہ بڑا بدخواہ ہے وہ شخص جو تم سے یہ کہے کہ بڑا ظلم ہے تم پر کہ صرف ونحو بھی لاد دیا اور انشاء وادب پہ بھی مجبور کیا، انگریزی اور فارسی بھی لازم کی، ریاضی اور تجوید کو بھی ضروری کیا۔

اسی طرح میں تم کو بتاتا ہوں کہ ہرگز وہ تمھارا ہمدرد نہیں جو تم سے زمانہ طالب علمی کی پابندیوں پر اظہار افسوس کرتا ہے۔

عزیزو! میں یا تمھارے ماسٹر عرشی صاحب تم میں سے کسی کو کسی خاص کام کے لیے منتخب کریں تو منتخب کیا جانے والا خوش ہوگا کہ مجھے اہل جانا گیا، اسی طرح تمھیں فخر کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس پرآشوب دور میں، اس فتنہ کے زمانہ میں اپنے دین کے علم کا طالب بنایا، عزیزو! غور کرو برگد کا درخت کتنا بڑا ہوتا ہے اور اس کا بیج کتنا چھوٹا، اب اگر کوئی کہے کہ برگد کے اس ذرا سے بیج میں برگد کا بہت بڑا درخت ہے تو تعجب معلوم ہوگا، لیکن اگر کوئی قسم

کہا جائے کہ اس ننھے سے بیج میں آسمان سے باتیں کرنے والا، ہزاروں کو اپنے نیچے بٹھا لینے والا، کروڑوں پتیوں، اربوں بیج اور سیکڑوں شاخوں والا درخت موجود ہے تو قسم جھوٹی نہ ہوگی، اور اگر ایسی کوئی خوردبین ایجاد ہوتی تو تم کو اس ننھے سے بیج میں بڑے برگد کا سب کچھ دکھایا جاسکتا تھا، لیکن وہ چھوٹا سے بیج برگد کب بنے گا؟ جب اپنے کو دنیا کے باغ و بہار سے ایک عرصہ کے لیے محروم کرکے مٹی میں دفن کرلے گا، پھر وہی بیج زمین کے سخت پردہ کو چیز کر باہر آئے گا، اب ابھی اس کو قدرتی ترقی کے راستوں سے گزرنا ہے، اور برسوں کے محنت ومجاہدہ اور دیکھ ریکھ کے بعد وہ بڑا ابر گدبن جائے گا، جس کے نیچے سیکڑوں مخلوق خدا سایہ وپناہ حاصل کرے گی، بالکل اسی طرح تمھارے اندر فقیہ ومحدث پوشیدہ ہیں، عالم ربانی اور اولیاء اللہ چھپے ہیں، لیکن کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں جس سے دیکھ کر بتایا جاسکے کہ کون تم میں محدث ہے، کون مفسر، کون محقق ہے اور کون ولی اللہ؟ تم میں سے ہر ایک میں اس کی صلاحیت موجود ہے، لیکن اسی برگد کے بیج کی طرح یہاں بھی ایک قدرتی راستہ ہے، اپنی چاہتوں کو قربان کرو، اپنے دلوں کو دباؤ، جی چاہے تفریح کا مگر تم دل کو دبا کر پڑھنے میں لگ جاؤ، جی چاہے سونے کا لیکن تم پڑھنے کے لیے جاگو، جی چاہے نہ پڑھنے کا مگر پڑھو، تو انشاء اللہ تمھیں میں سے بڑے بڑے علماء وفضلاء نکل کر دنیا وعقبیٰ کی ناموری حاصل کریں گے۔

عزیزو! اگر غیبت نہ ہوتی تو میں نام لے لیتا کہ میں نے طالب علمی کے زمانہ میں کئی ایسوں کو دیکھا ہے جن کے کپڑوں کو شکن نہیں آتی تھی، سر پر ٹوپی ٹیڑھی ہوتی جس کے نیچے سے انگریزی بال جھانکتے ہوتے، بڑے تیز طرار، ان کی زبانوں پر روس وامریکہ کے مصنفین اور لیڈروں کے تذکرے، شہر کے ہر ہوٹل سے واقف، ہر مشاعرہ میں شریک، ہر لیڈر کے استقبال میں مستعد، شہر کے ہر واقعہ اور حادثہ کے مقام پر ان کا پہنچنا ضروری، مگر تدریسی محنت سے ان کو کوئی سروکار نہیں، یا اس سب کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں بھی تیز مگر دینی اعمال سے دور، اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ یہ بہت بڑے مصنف ادیب ہوں گے، دنیا ان کی رہنمائی میں چلے گی، لیکن آج جب ان کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں تو وہ کسی بھی دینی خدمت پر نہیں

پائے گئے، زیادہ سے زیادہ کسی دیہات کے معمولی مدرسہ کے معلم اردو یا سکنڈ مولوی نظر آئے، لیکن جو لوگ اس وقت اپنے دل کو مارتے تھے، کہ رلا رلا دیتے تھے، لیکن ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ آئی، وہ محنت میں لگے رہے، وہی چمکے، آج ان میں سے کوئی حدیث کی خدمت کر رہا ہے، تو کوئی فقہ کی، کوئی تفسیر کی خدمت انجام دے رہا ہے، تو کوئی افتاء کی، کوئی کسی بڑے ادارہ کا مہتمم ہے، تو کوئی منتظم اور بیسیوں ایسی کتابوں کے مصنف جن کی عالم میں قدر ہے۔

بس تھوڑی سے محنت کرلو، جس طرح مسجد میں جاتے ہو تو تا انتظار نماز باادب بیٹھے رہتے ہو، پھر مسجد سے نکلنے کے بعد اسی طرح باادب رہنے کے لیے کوئی نہیں کہتا، ایسے ہی زمانہ طالب علمی کو باادب گزار دو، پھر آزاد ہو کر مزے اڑاؤ گے، جس طرح روزہ میں دن بھر کچھ نہیں کھاتے، مگر افطار کے بعد کھانے سے کوئی نہیں روکتا، اسی طرح یہ زمانہ طالب علمی ایک بڑا روزہ ہے، اُس روزہ میں سحری ایک، افطار ایک، اور اس میں سحریاں ہزاروں، افطار ہزاروں، میں یہ نہیں کہتا کہ تم کھیلو نہیں، دوڑو نہیں، ہنسو نہیں، یہ تو تمھاری فطرت ہے، اور صحت کے لیے ضروری، مجھے مردہ سا مرجھایا ہوا لڑکا بالکل پسند نہیں، مگر وہی کھیل کے وقت خوب کھیلو، پڑھنے کے وقت خوب پڑھو، اگر تم نے اس طرح محنت کر لی تو انشاء اللہ پھر وہ ہو گے جو تمھارے والدین کے تصور میں نہیں، اور ہمارے وہم و گمان میں نہیں، پھر ملک ملک سے تمھارے لیے دعوت نامے آئیں گے، تمھارے سامنے سپاسنامے پیش ہوں گے، حاکمان وقت تمھارا استقبال کریں گے، اور سب سے بڑی بات اللہ کی رضا حاصل ہوگی، جس کے بارے میں وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ آیا ہے، تمھارے نام سے تمھارے خاندان اور تمھاری بستی کا نام روشن ہو جائے گا، تمھاری بستی کا ذکر تاریخوں میں محفوظ ہو جائے گا، یاد رکھو، شہروں اور بستیوں سے اشخاص نہیں چمکے بلکہ شخصیتوں سے شہر اور بستیاں اجاگر ہوئیں، آج ملا نظام الدین سہالوی سے سہالی کا نام زندہ ہے، مولانا غلام آزاد بلگرامی اور مولانا عبدالجلیل بلگرامی سے بلگرام کا نام چمک رہا ہے، اسی طرح علامہ شاشی سے شاش، امام رازی سے رے اور امام بخاری سے بخارا کا نام باقی ہے۔

میں تمھارے ماسٹر صاحب سے سفارش کروں گا کہ وہ تمھارے لیے کتاب ''علمائے سلف'' مہیا کریں، جس میں تم دیکھوگے کہ جس نے جس قدر مجاہدہ کیا، اتنا ہی خیر اس کے حصہ میں آیا۔

بس تمھارے کام کے لیے اتنی باتیں بہت کافی ہیں، خلاصہ یہ کہ تھوڑے دنوں اپنے دل کی چاہتوں کو مار کر محنت کرلو، پھر انشاء اللہ ہمیشہ باعزت رہو گے، اور آرام اٹھاؤ گے، لیکن اگر یہ زمانہ تم نے غفلت میں گزارا تو ندامت وحسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا، نہ صحیح اردو بول سکوگے، نہ صحیح عربی پڑھ سکوگے، نہ صحیح خطبہ دے سکوگے، نہ کام کی تقریر کرسکوگے، نہ مسئلہ بتا سکوگے، نہ تاریخ پر گفتگو کرسکوگے، نہ ادب میں کوئی مقام حاصل کرسکوگے۔

اب تمھیں فیصلہ کرلو، تھوڑے دن جھوٹی تفریح اور ہمیشہ کی رسوائی پسند کرتے ہو یا تھوڑے دن کی تکلیف اور ہمیشہ کا آرام؟

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔ (۱)

---

(۱) ۸/ جمادی الاخری ۱۳۹۰ھ کو سلیمانیہ ہال، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طلبۂ ندوہ کے سامنے کی گئی تقریر، اس کو (ڈاکٹر) ہارون رشید صدیقی نے قلمبند کیا، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۲۵/ اگست ۱۹۷۰ء)۔

عزم اور اخلاص

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم
﴿كُلًّا نُّمِدُّ هَٰٓؤُلَآءِ وَ هَٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا، اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَلَلْاٰخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّأَكْبَرُ تَفْضِيْلًا﴾ (۱)

مطالعۂ تاریخ کے دو ردِّ عمل

عزیز و اور بھائیو! ہم آپ تاریخ کی کتابیں پڑھتے ہیں، علم وفن کی تاریخ ہو، مذہب و اخلاق کی تاریخ ہو، یا سلطنتوں کی تاریخ ہو، سیاست وحکمرانی کی یا انسانی ذہانت اور اس کی صلاحیتوں کی، تاریخ پڑھنے کے دو اثر ہوتے ہیں، ایک اثر تو یہ ہوتا ہے کہ ہم میں ان گذشتہ باکمالوں کی تقلید کا جذبہ پیدا ہو، ہمارے اندر بھی حوصلہ پیدا ہو کہ ہم بھی ان کا راستہ اختیار کریں اور ان کے جیسے بنیں، اور اس کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی جب ان کے کارنامے پڑھتا ہے جو بعض اوقات اس کے دماغ اور اس کے ذہن کی سطح سے بلند ہوتے ہیں، تو اس کے اندر مایوسی پیدا ہوتی ہے کہ اب ایسے کمالات کہاں پیدا کیے جا سکتے ہیں!

زہد و ورع، روحانیت اور روحانی پیشواؤں کی تاریخ پڑھیے، بزرگان دین کی سوانح عمریاں پڑھیے، اور تصوف وسلوک کی تاریخ پڑھیے تو اس سے دل پر یہ اثر ہوتا ہے کہ یہ تو پرانے زمانے کی باتیں ہیں، وہ معلوم نہیں کس دل گردے کے انسان تھے اور خدا نے ان کو کیسا بنایا تھا، کس مٹی کے وہ انسان تھے جو فرشتوں سے بازی لے گئے اور انھوں نے کس طرح

---

(۱) سورۃ الإسراء: ۲۰-۲۱

نفس کشی کی، کس طرح اپنی اصلاح کی اور کس طرح اس مادیت کی بلکہ حیوانیت کی سطح سے بلند ہو کر وہ ملکوتی صفات ان کے اندر پیدا ہو گئیں اور وہ فرشتوں سے بازی لے گئے۔

اسی طریقہ سے علماء کے تراجم پڑھیے تراجم کی کتابوں، تذکرہ کی کتابوں میں، تو بہت سے لوگوں پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بس اب یہ دور ختم ہو گیا اور یہ ورق الٹ گیا، اب نہ ایسے باکمال پیدا ہوں گے نہ ایسے کمالات کوئی پیدا کر سکتا ہے، اخلاقیات کے میدان میں آیئے تو اُن حضرات کی بے نفسی، خلوص، للّٰہیت، بے غرضی، استغناء، زہد، بڑے بڑے سلاطین کو خاطر میں نہ لانا اور دنیا کی بڑی سے بڑی دولت اور وجاہت کو ٹھکرا دینا اور آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھنا، اس کے واقعات کثرت سے تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں، کوئی کتاب آپ اٹھا لیجیے تذکرہ اور تاریخ کی، تو آپ کو زیادہ ورق گردانی اور تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، آپ کا کتب خانہ ایسی سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابوں سے بھرا ہوا ہوگا، بلکہ آپ کا کتب خانہ ''اصلاح'' بھی اس سے خالی نہیں ہے، یہ ایک نتیجہ ہے جو انسان ہر دور میں نکالتا ہے کہ اب کیا ہوگا؟ یہ مادیت کا دور ہے، قویٰ کمزور ہو گئے ہیں، ہمتیں پست ہیں، زندگی کے تقاضے بہت ہیں، اس کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے، زندگی کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے تب جا کر کہیں پیٹ بھرنے کا سامان مہیا ہوتا ہے۔

اور آپ دیکھیں گے اور میں نے ایک مرتبہ ''الاصلاح'' کی تقریر میں بھی یہ کہا تھا کہ ہر زمانہ کے شعراء نے اپنے دور کا ماتم کیا ہے، اور اپنے دور کی زبوں حالی اور اہل کمال کی گمنامی اور ان کی ناقدری کا شکوہ کیا ہے، خواجہ حافظ ہوں یا شیخ سعدی ہوں یا عمر خیام ہوں، کہ ان کے زمانہ سے بدتر کوئی زمانہ نہیں تھا اور ان کے زمانے میں گویا خاک اڑ گئی تھی، کچھ رہا ہی نہیں تھا، نہ کوئی اہل کمال کا قدردان تھا، نہ کوئی علم کی قدر و قیمت باقی رہی تھی، سب ایک کسمپرسی کی حالت میں پڑے تھے، لیکن اسی دور کے اہل کمال کے تذکرے آپ پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں کوئی انقلاب نہیں آیا تھا، اور کوئی چیز بھی ان کے راستہ میں مزاحم نہیں ہوئی تھی، اور نہ ان کو اپنے زمانہ کا شکوہ ہے اور نہ اہل زمانہ کو ان سے کوئی شکایت۔

کوئی دور اہل کمال سے خالی نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ کوئی دور بھی ایسے شعراء سے اور ایسے شکوہ سنج لوگوں سے خالی نہ رہا کہ انھوں نے اپنے زمانہ کا ماتم نہ کیا ہو، مگر کوئی دور بھی اہل کمال سے خالی نہیں رہا، ایک طرف یہ ہوتا رہا اور دوسری طرف اہل کمال بھی پیدا ہوتے رہے، اب ہمارا یہ زمانہ آیا، اس زمانہ میں سب سے زیادہ دباؤ ہے زندگی کے تقاضوں کا، اور ایک ہی حقیقت رہ گئی ہے لوگوں کے نزدیک، وہ سمجھتے ہیں کہ اس زمانہ میں کچھ کیا ہی نہیں جاسکتا، اور کسی چیز میں کمال نہیں پیدا کیا جاسکتا، ایک ہی میدان رہ گیا ہے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا، اور وہ میدان ہے معاشی میدان یا سیاسی میدان۔

اب آپ یہاں دار العلوم میں آئے ہیں، بہت سے لوگ تو بغیر کسی شعور کے آئے ہیں، جنھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں جارہے ہیں، اور اس دار العلوم کی کیا تاریخ ہے؟ اور کیا مقاصد ہیں؟ یہاں کس طرح کے آدمی پیدا کرنا مقصود ہے؟ اور بہت سے بھائی ایسے ہیں جو کچھ سمجھ کر آئے ہیں اور ان کے اندر کچھ امنگیں ہیں، لیکن سب کے دماغ پر یہ اثر ہے کہ اس زمانہ میں کیا ہوسکتا ہے؟

کوشش کا نتیجہ ضرور نکلتا ہے

میں نے جو آیت پڑھی ہے، وہ آیت اسی مقصد کے لیے پڑھی ہے کہ اس میں ہمیں زندگی کا بہت بڑا ایک پیغام ملتا ہے، بہت بڑی طاقت، ایک نئی قوت انسان کے اندر یہ آیت پیدا کرتی ہے، اور بہت بڑے مغالطہ کو دور کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو سنتیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں طے فرمالی ہیں کہ ایسا ہونا ہے، اس کا جو معاملہ ہے اس دنیا کے ساتھ، اپنے بندوں کے ساتھ، وہ معاملہ بالکل اٹل ہے، ازلی ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں، ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً﴾ [1] اتنی تاکید کے ساتھ، اتنے زور کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان کیا

---

(۱) سورة الأحزاب: ٦٢

ہے، بار بار قرآن مجید میں یہ مضمون آیا ہے: ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلاً﴾ (۱) اللہ تعالیٰ اگر فرما دیتا کہ سنت الٰہی میں کوئی تغیر نہیں ہے تو بھی کافی تھا، لیکن اتنا زور دے کر فرمایا ہے، یہ ایک انسانی کمزوری ہے کہ وہ جب تبدیلی دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ اب سنۃ اللہ بدل گئی ہے، اپنے اندر تبدیلی دیکھتا ہے، اپنے محلّہ میں تبدیلی دیکھتا ہے، اپنے محدود خاندان میں تبدیلی دیکھتا ہے، اپنے ارادوں میں تبدیلی دیکھتا ہے، ہمت میں تبدیلی دیکھتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ سنۃ اللہ بھی بدل گئی ہے، یہ انسان کی پرانی کمزوری ہے، اس کا ظہور مختلف شکلوں میں، ادب میں، شاعری میں، جد وجہد کے میدان میں، دینیات میں، سب میں ہوا ہے، تو یہ انسان کی پرانی بیماری ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس پر زور دیا ہے، اس کو زور کی ضرورت نہیں ہم کو زور کی ضرورت ہے، وہ اس خیال کو بالکل دور کرنا چاہتا ہے کہ سنن الٰہیہ میں، قوانین ازلی میں، اور فطرۃ اللہ جسے کہا گیا ہے، اس میں کوئی تغیر و تبدل ہوسکتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی کوشش میں، انسان کے ارادے میں بڑی طاقت رکھی ہے، اللہ تعالیٰ غنی ہے، سب جانتے ہیں ہمارا آپ کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غنی ہے، اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں، لیکن اس نے کچھ چیزیں طے فرما دی ہیں کہ ایسا ہونا ہے، اس میں کوئی فرق نہیں، اس میں سے ایک طے شدہ قانون یہ ہے کہ انسان کی کوشش کو بے نتیجہ نہیں رکھتا، یعنی انسان کوشش کرے اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے، ایسا کبھی نہیں ہوتا: ﴿وَ أَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى وَ أَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرٰى، ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَآءَ الْأَوْفٰى﴾ (۲) اور یہ ﴿ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَآءَ الْأَوْفٰى﴾ کو میں سمجھتا ہوں، میری ناقص فہم میں یوں آتا ہے کہ اَلْجَزَآءَ الْأَوْفٰى میں دنیا اور آخرت دونوں ہی شامل ہے، دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی، اور آخرت کے لیے بھی، آخرت کا تو کہنا ہی کیا، سارا قرآن شریف اس سے بھرا ہوا ہے کہ انسان کی کوشش رائیگاں نہیں جاتی اور اس کو اس کی کوشش کا پھل ضرور ملتا ہے۔

---

(۱) سورۃ فاطر: ۴۳ (۲) سورۃ النجم: ۳۹-۴۱

یہ وہ حوصلہ بڑھانے والی طاقت ہے جس نے زندگی کے بڑھانے والے پہیے کو ہمیشہ گردش میں رکھا، اوراس نے انسانی صلاحیتوں کو ہمیشہ تازیانہ کا، مہمیز کا کام دیا، اور ہمیشہ اس کے لیے جیسے انرجی (Energy) ہوتی ہے، اس طرح اس نے ہمیشہ انسانی نسلوں میں، انسانی صلاحتیوں میں، اور ہر زمانہ کے انسانوں میں، ایک نئی امنگ، ایک نئی طاقت، ایک نیا حوصلہ، ایک نیا جذبہ پیدا کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا انعام دیا ہے انسانوں کو، اتنا بڑا اعزاز بخشا ہے، اتنا بڑا تاج ان کے سر پر رکھا، خلافت الٰہی کے تاج کے بعد اس سے بڑھ کر میں کوئی تاج نہیں سمجھتا، خلافت اور نبوت کے تاج کے بعد اس سے بڑا کوئی تاج نہیں ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ انسانیت کو اس سے زیادہ کسی چیز نے اتنا فائدہ نہیں پہنچایا کہ انسانی کوشش کا ضرور نتیجہ نکلے گا۔

آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی پوری تاریخ، تہذیب وتمدن کی تاریخ، صنعت وحرفت کی تاریخ، علم وفن کی تاریخ، اخلاق کی تاریخ، اصلاح اور تجدید کی تاریخ، حق وباطل کی کشمکش کی تاریخ، دنیا کو تباہی سے بچانے کی جو وقتاً فوقتاً کوششیں ہوتی رہیں، نسل انسانی کو تباہی سے بچانے کی جو مبارک کوششیں ہوتی رہیں، آپ دیکھیں گے ان کے اندر جو سب سے بڑھ کر قوت کارفرما تھی، ایمان کی قوت کے بعد یہی اعتماد اور یہی بھروسہ تھا اور خدا کی اس بات پر یقین کہ کوشش کا نتیجہ ضرور نکلتا ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو ہم کو اور آپ کو ایک مٹھی بھر جو، ایک دانہ غلہ نہ ملتا، ایک بیج ہم کو آپ کو نہ ملتا، اور یہ روٹی کا ٹکڑا جو ہم کو نصیب ہو جاتا ہے، ہم اس سے بھی محروم رہتے اگر کسان کے اندر یہ یقین نہ ہوتا، خواہ تجربہ کی بنا پر ہو، خواہ عقیدہ کی بنا پر ہو، خواہ مشاہدہ کی بنا پر ہو، خواہ لوگوں کی بات پر یقین کرنے کی بنا پر ہو، بہرحال کسان کے دل میں یہ یقین ہے کہ وہ مٹھی بھر جو بیج ڈالتا ہے زمین میں، وہ زمین جس کو بیج سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا، بظاہر وہ تو بیج کو کھا جانے والی ہے، وہ تو محض خشکی سراپا خشکی اور بیج زندگی سے بھرپور، اس زندہ چیز کو اس مردہ چیز کے سپرد کیا جاتا ہے، زندگی کی امانت موت کے سپرد کی جاتی ہے، سرسبزی اور شادابی اور نمو کی صلاحیت کو خشکی اور خشک کردینے والی چیز کے سپرد کیا جاتا ہے، کوئی جوڑ ان

دونوں میں سمجھ میں نہیں آتا، لیکن قدرت خداوندی بتاتی ہے، اس کا اعلان ہے، حکمت خداوندی کا اعلان ہے کہ ہم نے یہ راستہ متعین کیا ہے کہ جو زندگی کی طاقت سے بھرپور ہے، جو نمو اور شادابی سے بھرپور ہے، اس کو خدا کے بھروسہ پر اور اس اصول پر بھروسہ کرتے ہوئے، اس اصول پر یقین کرتے ہوئے کہ انسان کی کوشش کا پھل ضرور ظاہر ہوتا ہے، تم اس زمین کے حوالے کردو اور تھوڑی سی اس پر کوشش کرلو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں برس سے یہ سلسلہ جاری ہے کہ زمین اپنے خزانے اگلتی ہے، کہ زمین نے ہر دور میں اپنے خزانے اگلے ہیں، اور تاریخ میں کسی ایک سنہ کا بھی نشان نہیں ملتا کہ جس میں ساری دنیا میں زمین نے انکار کردیا ہو کہ وہ انسان کی کوشش کا یہ پھل نہیں دے گی۔

مختلف میدانوں میں انسانی کوششوں کے نتائج

اسی طریقہ سے جس میدان میں آپ دیکھیں گے، انسانی کوشش کے کامیابی کے نقش آپ کو صاف نظر آئیں گے، یہ وہ طاقت ہے جو دنیا کے اس پہیہ کو چلا رہی ہے، یہ آپ کو جو زندگی نظر آرہی ہے، جو رواں دواں کہلاتی ہے، یہ رواں دواں زندگی، اس کی یہ حرکت اور اس کا نمو، اس کی تیزی اور اس کی یہ حرارت اور یہ جوش، سب اسی بات، اصول اور اسی یقین کا رہین منت ہے کہ انسان کی کوشش رائیگاں نہیں جاتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا عطیہ ہے، اس کی اتنی بڑی نعمت ہے جو انسان کو ملی ہے، انسان کو اس نے یقین دلایا کہ تیری کوشش ضائع نہ ہوگی، خواہ کسی میدان میں ہو، لیکن کوشش شرط ہے، اور پھر کوشش کی ایک خاص مقدار اور کوشش کا خاص معیار اور اس کے لیے ایک جذبۂ مسابقت، اب جس میدان کو تم انتخاب کرو گے اس میں تم اپنی کوشش کا نتیجہ دیکھو گے، چنانچہ پوری تاریخ ہمیں بتاتی ہے جس میدان کو جس انسانی گروہ نے انتخاب کرلیا، جس انسانی نسل نے انتخاب کرلیا، جس انسانی طبقہ نے انتخاب کرلیا، اس میں کوشش اور مسابقت کا جذبہ اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ وہ رنگ لایا، وہ اس نے کرشمہ دکھائے، وہ شگوفے کھلائے کہ عقل انسانی حیران ہے، آج تک

اس کی تاویل نہیں ہوسکی کہ انسان وہاں تک پہنچ سکتا ہے، انسان آسمان کے تارے توڑ کر لا سکتا ہے، انسان آسمانی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے، اور انسان قدرت کے رازوں کا انکشاف کرسکتا ہے، انسان اُن طبعی طاقتوں کی تسخیر کرسکتا ہے، ہوا کے دوش پر اڑ سکتا ہے۔

یہ تو میں نے طبعیات کے میدان کو لیا ہے، اخلاقیات میں آپ دیکھیے، تو آپ کو ان حضرات کے جنھوں نے اخلاقیات کو اپنا میدان بنایا، اپنے نفس کی اصلاح کو اپنا میدان بنایا، تہذیب نفس کو اور تزکیۂ نفس کو انھوں نے اپنا میدان بنایا، اپنے نفس کے ناجائز تقاضوں کو اور بہیمی تقاضوں کو مغلوب کر کے اور اللہ کے بندوں پر یقین کرتے ہوئے اپنے اندر ایمان، اخلاق حسنہ فاضلہ اجاگر کرنے اور نکھارنے کے میدان میں جن لوگوں نے کوشش کی، ان کے اخلاق کی لطافت کو، ان کے اخلاق کی بلندی کو، ان کے اخلاق کی نزاکتوں کو، ان کے اخلاق کے اس نوک پلک کو، ان کے اخلاق کی اس نزاکت کو سمجھنا بڑے بڑے شعراء کی نظموں سے ان کو سمجھنے، ان سے بڑے نکتہ آفریں مضامین سمجھنے سے زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے، اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہی انسان جس کے ساتھ معدہ لگا ہوا ہے، اور جس کے ساتھ نفسانی خواہشات لگی ہوئی ہیں، اور جو اکثر شیطان کا بالکل مَرکب بن جاتا ہے، اس سے شیطان وہ وہ کام کراتا ہے کہ جس کے سامنے جانور بھی اپنے کان پکڑیں اور وہ بھی شرمندہ ہو جائیں، یہ انسان ان بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے، عبادت کے میدان میں دیکھیے تو آپ کو صرف اسلام کی تاریخ میں — اور مذاہب کی تاریخ نہ تو اتنی محفوظ ہے اور نہ اتنی دور جانے کی ضرورت ہے — اگر آپ صرف اسلام کے عابدوں کی، شب زندہ داروں کی اور زاہدوں کی تاریخ پڑھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ انسان عبادت کے میدان میں اتنی ترقی کرسکتا ہے، اتنا اپنے نفس پر قابو پا سکتا ہے، اتنی اس کو لذت وحلاوت حاصل ہوسکتی ہے، اس کے اندر اتنا خشوع وخضوع پیدا ہوسکتا ہے، اس کے اندر اتنی یکسوئی پیدا ہوسکتی ہے، وہ اس عالم میں ہونے کے ساتھ اس عالم سے اتنا غیر متأثر ہوسکتا ہے، اس کے اندر گویا اقبال کے الفاظ 'اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز' یہاں تک پہنچ سکتا ہے، رقت قلب کے واقعات پڑھیے، خشوع وخضوع کے واقعات پڑھیے، ان کے

استغراق کے واقعات کو پڑھیے تو اانسان کی عقل اس کو آسانی سے قبول نہیں کرتی۔

اب علم کے میدان میں آیئے، آپ دیکھیں گے کہ انسان نے علم کو اپنا میدان بنایا، اس میں مسابقت شروع ہوئی، اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش پیدا ہوئی، اور اس میں اپنی صلاحیت کو صرف کرنے کا انسان کے اندر شوق پیدا ہوا تو پھر انسان نے علم کے میدان میں وہ ترقی کی کہ انسان کی عقل میں وہ باتیں آسانی سے نہیں آتیں کہ انسان کا حافظہ اتنا قوی ہوسکتا ہے، انسان کا سینہ اتنا فراخ ہوسکتا ہے، انسان کا یہ دماغ، یہ کاسۂ دماغ ایک بالشت بھر بھی اس کا رقبہ نہیں ہے، اور ایک مٹھی میں وہ آسکتا ہے اس کے اندر اتنی قوت برداشت پیدا ہوسکتی ہے، اس کے اندر اتنا تنوع پیدا ہوسکتا ہے کہ کتب خانوں کو اپنے اندر وہ اتار لے، ایک علم نہیں، دو علم نہیں، پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ، ستر ستر علوم میں اتنا کمال پیدا کر سکتا ہے انسان۔

شاعری کے میدان میں آیئے، فی البدیہہ شاعری کو آپ دیکھیے، حاضر جوابی، حاضر دماغی کو آپ دیکھیے، دماغی شادابی کے واقعات کو آپ دیکھیے تو ایک ایک فن میں انسان نے وہ ترقی کی ہے مثلاً برجستہ شعر کہنے کو یا مثلاً تاریخ نکالنے ہی کو لیجیے، بالکل صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ الہام ہے، اسی طریقہ سے ساری تاریخ ہم کو یہ بتاتی ہیکہ انسان نے جس میدان کی طرف رخ کیا، اور جس میدان کو سر کرنے کا عزم پیدا ہوا، اور طلب صادق پیدا ہوگئی، عزم راسخ پیدا ہوگیا، اور اس نے سمجھا میری کامیابی کا راز اسی میں ہے، اور اس نے سمجھا میری سعادت ہے کہ میں اس میدان میں ترقی کروں، تو خدا کی مدد اس طرح سے آئی کہ آدمی حیران رہ گیا۔

﴿نُمِدُّ﴾ کے معنی

اور یہ ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ﴾ [1] آپ لوگ تو عربی کے طالب علم ہیں، آپ سے کہتا ہوں: ﴿نُمِدُّ هٰؤُلَاءِ﴾ کے معنی یہ نہیں کہ ہم سب کی امداد کرتے ہیں، عربی

(۱) سورۃ الإسراء: ۲۰

میں امداد کرنے کے لیے اور الفاظ ہیں، اعانت کا لفظ ہے، بہت سے لفظ ہیں، قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں، نُـمِـدُّ کے معنی یہ نہیں ہے، اردو میں مدد کا لفظ آتا ہے تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ باب افعال سے أَمَـدَّ یُـمِـدُّ کے معنی مدد کرنا ہیں، اس کے لیے دوسرے لفظ ہیں، عربی میں امداد کے معنی مدد کرنے کے نہیں ہیں، امداد کے معنی ہیں: بھر بھر کر دینا، ریل پیل کر دینا، جس طریقہ سے رسد لگادی جاتی ہے، برابر ایک سلسلہ ایک کے پیچھے ایک، ایک کے پیچھے ایک، اس طرح ﴿کُلاًّ نُـمِـدُّ هٰٓؤُلَآءِ﴾ ہم بھر بھر کر دیتے ہیں، ہم جھولی بھر بھر دیتے ہیں، ہم پاٹ دیتے ہیں، ہم لاد دیتے ہیں، ہم اس آدمی کو اس کے بوجھ کے نیچے دبا دیتے ہیں، ﴿کُلاًّ نُمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ﴾ کے معنی، قرآن مجید کے اس لفظ کی طاقت کو سمجھئے اور آپ چونکہ عربی کے طالب علم ہیں، آپ کو بلاغت پڑھنی ہے، اور چونکہ آپ کو ادب کا، الفاظ کی اداشناسی اور الفاظ کی مزاج دانی، ایک تو الفاظ کے معنی سمجھنا ہے، اور آپ کو تو الفاظ کا مزاج داں بننا ہے، اور خاص طور سے ہمارے دارالعلوم کی یہ روایت ہے، اس لیے آپ سے کہتا ہوں: ﴿وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ﴾ [1] اس کے معنی یہ نہیں ہیں، اگرچہ ہمارے بہت سے مترجمین جنھوں نے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، وہ اردو عربی کا مشترک لفظ ہے، وہ غالب آ گیا، انھوں نے مدد سے ترجمہ کر دیا، ﴿وَأَمْـدَدْنَـاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ﴾ کے معنی ہیں: ہم نے بھر بھر کر دیا، ہم نے ریل پیل کر دیا، تو ﴿کُلاًّ نُـمِـدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ﴾ ہم ریل پیل کر دیتے ہیں، ہم بھر دیتے ہیں، ہم اتنا دیتے ہیں کہ جیسے آدمی کچل جائے کسی بوجھ کے نیچے۔

تمہارے رب کے یہاں راشننگ نہیں

پوری انسانی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے خزانۂ غیب میں کوئی کمی نہیں، اسی لیے فرما دیا آخر میں ﴿وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْراً﴾ [2]، تمہارے رب کے یہاں راشننگ نہیں ہے، یعنی اس آیت کا ترجمہ میں یہ کروں کہ تمہارے رب کے یہاں راشننگ نہیں ہے، اس کے یہاں اس کا کوئی کوٹہ مقرر نہیں ہے کہ بس اتنا دے دیا، کہ اتنی شکر

---

(۱) سورۃ الإسراء:٦ ، (۲) سورۃ الإسراء:۲۰

ملا کرے گی فی کس اور اتنا غلہ ملا کرے گا، جیسے آج کل راشن کا دور ہے، اور جیسے راشن سے چیز بٹنے لگتی ہے تو یہ نہیں ہے کہ مثلاً اگر ہم کسی ایک کو ایک کتاب کا علم دے دیں، تھوڑا اعربی کا علم دے دیں، یا تھوڑا سا کسی فن کا علم دے دیں، تو بس اب گویا راشن اس کو مل گیا، گویا راتب اس کو مل گیا، اب اس سے زیادہ کا وہ حوصلہ نہ کرے، نہیں! ﴿كُلًّا نُمِدُّ هٰؤُلَآءِ وَهٰؤُلَآءِ﴾ اندر طلب صادق ہے، اور تم حوصلے رکھتے ہو، هَلْ مِنْ مَزِيْدٍ، هَلْ مِنْ مَزِيْدٍ کہتے ہو، تم اور جلدی سیر نہیں ہوتے، جلدی بس نہیں کرتے، تو ہماری طرف سے ہمارے خزانے میں کوئی کمی نہیں، ہم نے حجۃ الاسلام امام غزالی کو جو علم دیا، امام رازی کو جو علم دیا، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو جو علم دیا، اور امام بخاری کو جو حافظہ دیا، اور امام شافعی کو جو ذہانت دی، اور ابو علی قاری کو جو نحو کا علم دیا، اور فلاں کو جو تفسیر کا علم دیا، اور امام ابو حنیفہ اور ائمۂ اربعہ کو جو اجتہاد کا ملکہ عطا فرمایا، استنباط اور مسائل کا ملکہ عطا فرمایا، تو اب تمہاری ہمتوں کا معاملہ ہے، تمہاری محنتوں کا معاملہ ہے، جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ان لوگوں کو حافظہ دے کر، علم دے کر، ذہانت دے کر، مقام اجتہاد دے کر ہمارا خزانہ خالی نہیں ہوتا، ہمارا خزانہ اسی طرح سے بھرا ہوا ہے، اور جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) فرماتے ہیں کہ ساری مخلوق اگر جمع ہو جائے میدان قیامت کی طرح اور وہاں ہر شخص اپنی منہ مانگی مانگے جو بڑے سے بڑا اس کا شوق، ارمان جسے کہتے ہیں، ارمان نکالے دل کا، اور ایک کہے: مجھے بادشاہی چاہیے، اور ایک کہے کہ مجھے تو شہنشاہی چاہیے، اور ایک کہے: مجھے ولایت چاہیے، اور ایک کہے: مجھے فلاں چیز چاہیے، تو ساری دنیا کی ساری مخلوق، آدم کی ساری اولاد ایک میدان میں کھڑی ہو کر ایک میدان میں ایک وقت میں مانگے اور خدا سب کو دے دے تو اللہ کے خزانے میں اتنی بھی کمی نہیں ہوتی کہ سمندر میں کوئی چڑیا چونچ ڈالے اور اس کی چونچ میں جو ذرا سا پانی، پانی نہیں بلکہ جو تری آ جاتی ہے اس کی چونچ میں، اس سے اس سمندر کی روانی، اس کے پانی کی فراوانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ بھی شاید کچھ پڑتا ہو، لیکن اللہ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

یہ آیت اسی طرح ہمارا حوصلہ بڑھاتی ہے، اور نوع انسانی کے لیے اتنی بڑی قوت محرکہ ہے کہ ہماری صلاحیتوں کے لیے، ہمارے رجحانات کے لیے، ہمارے انتخاب کے لیے،

ہمارے شوق و جذبہ کے لیے، اس سے بڑھ کر حرکت میں لانے والی کوئی دوسری چیز نہیں:
﴿كُلًّا نُمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَهٰۤؤُلَآءِ﴾ ہم بھر بھر کر دیتے ہیں ان کو بھی اور اُن کو بھی ﴿مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴾ تمہارے رب کی دین میں، اس کی صفت جود و سخا میں، اس کے دینے کی قدرت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کسی کے جام میں یا کسی کے کاسہ میں کوئی چیز ہے اور آپ اسے الٹ دیں تو وہ کاسہ خالی ہو جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات اس کے صفات کی طرح ازلی ہیں، یہ علم کلام کا مشہور مسئلہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ ازلی ابدی ہے، قدیم ہے، اس کی صفات بھی ازلی ابدی ہیں، لیکن ہمارے دل میں یہ چور ہے کہ رہ رہ کر ہمیں یہ خیال ستاتا ہے کہ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوسکتا ہے؟ جہاں تک اسلاف کرام کے ادب کا تعلق ہے، میں شاید آپ سے بھی آگے ہوں، میرے دل میں ان کا جو مقام ہے، چاہے ائمۂ اربعہ ہوں، چاہے محدثین عظام ہوں، چاہے صوفیائے کرام ہوں، اس تک شاید آپ میں سے کسی کی رسائی نہ ہو، جہاں تک ان کی عظمت کا تعلق ہے، تم سے میں بہت آگے ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ کیا معاملہ ہے، لیکن جہاں تک اللہ تعالیٰ کی جود و سخا کا تعلق ہے، جہاں تک انسانی کوششوں کے نتائج کا تعلق ہے، اس میں کوئی حرج، گناہ اور بے ادبی نہیں سمجھتا کہ میں تم سے یہ کہوں کہ اللہ تعالیٰ کا خزانہ اسی طرح بھرا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے (هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَأُعْطِيَهُ) ہے کوئی سائل کہ اسے عطا کیا جائے!' ایک حقیقت ہے، حدیث میں آتا ہے کہ آخر شب اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منادی ہوتی ہے کہ ہے کوئی مانگنے والا کہ اسے عطا کیا جائے، اس نداء میں رزق کا محدود مفہوم نہیں، بلکہ ہر طرح کا سوال جس میں کسی قسم کی تحدید نہیں، ہمارے ذہن میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا ہوسکتا ہے؟ وہ علم والے اور اہل کمال سب لوٹ لے گئے، کیا کسی انسان کا باغ تھا جو لوٹ لے گئے؟ کوئی غلہ کا ذخیرہ تھا جو لٹ گیا؟ اللہ تعالیٰ خود ہی لٹاتا ہے، کوئی اسے لوٹ نہیں سکتا۔

حوصلہ تازہ ہونا چاہیے

اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر جس طرح ہمیں یقین ہے، اسی طرح اس کی ذات پر بھی یقین

ہونا چاہیے، ان کتابوں کو پڑھ کر ہمارا یقین، ہمارا ایمان، ہمارا حوصلہ تازہ ہونا چاہیے کہ جو مالک ماضی میں ہمارے اسلاف کو دیتا تھا، وہ اس زمانہ میں ایسے بڑے عالم پیدا کر سکتا تھا، وہ اب بھی پیدا کر سکتا ہے۔

آج بھی اللہ تعالیٰ اپنی ان ہی صفات کے ساتھ ہے، ہم اور آپ بدل گئے، میں تو زمانہ کے بھی بدلنے کا قائل نہیں، ہم اور آپ بدل گئے، ہم اور آپ لینا نہیں چاہتے، ہمتیں پست ہوگئی ہیں، ہم نے اپنی ترقی اور محنت کا میدان بہت محدود اختیار کیا ہے، جس میدان کو منتخب کرو گے اللہ تعالیٰ اس میں مدد فرمائے گا، اگر ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ دھکے کھا کر اور اس زمانہ کے دستور کے غلام بن کر کچھ حاصل کرنا ہے تو ہم کو وہی لمبا راستہ اختیار کرنا پڑے گا جو دوسروں کی محتاجی کی طرف لے جاتا ہے، جس طرح قوم سبا کا حال تھا، قوم سبا کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام کیا تھا کہ وہ یمن سے چلتے تھے اور شام پہنچ جاتے تھے، اور راستہ بھر باغ ہی باغ، چمن ہی چمن، ان کو جنگل وصحرا کی گرم ہوا اور کانٹوں سے واسطہ ہی نہیں پڑتا تھا، شیطان نے ان پر حملہ کیا اور انھوں نے کہا: ﴿رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا﴾ [1] 'اے پروردگار! ہمارے سفروں کو ویسا ہی بنا دیجیے' تو خدا نے سارے چمن کو ختم کر دیا، اور پھر انہیں خارزار اور صحراؤں سے واسطہ پڑا۔

آپ سیاست کے میدان میں، الیکشن کے میدان میں دیکھیے، اس کا موسم عنقریب یہاں آنے والا ہے، لوگ اس میں کس طرح کھانا پینا بھول جاتے ہیں، اپنی نیند حرام کر لیتے ہیں، کس طرح ان میں طاقت برداشت پیدا ہو جاتی ہے، جو ہمیں بڑے بڑے زاہدوں کے یہاں نظر نہیں آتی، ایک ایک آدمی الیکشن سے دلچسپی رکھنے والا اپنے مقصد میں فنا ہو جاتا ہے، دیوانہ ہو جاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، کھانے پینے اور آرام کی فکر سے بے نیاز مارا مارا پھرنا، گالیاں سننا، کئی پشتوں تک تبرا ہوتا ہے اور چار چار آٹھ آٹھ پشتوں کو معاف نہیں کیا جاتا، مگر الیکشن کے امیدوار صاحب ہنسی خوشی اس کو سنتے ہیں کہ قوت برداشت، بے نفسی کی ایک مثال قائم ہو جاتی ہے، مگر جب مقصد کا غلبہ ہو جاتا ہے تو یہ سب چیزیں آسان بن جاتی ہیں، عہدہ

---

(۱) سورة سبا: ۱۹

اور کرسی نے وہ وہ کمالات دکھائے جو اولیائے بے نفس کا شعار رہتے ہیں، مقاصد کا فرق ہے، مگر بات وہی ہے کہ کسی مقصد کو سامنے رکھ کر اس میں ڈوب جانا اور ہر قسم کی مشقتوں کو برداشت کرنا۔

علم کے کمالات بھی لوگوں کو حیران کر دیتے ہیں، جو لوگ کسی سائنسی ایجادات میں، کسی لیبورٹری میں، تجربہ گاہ میں کام کرتے ہیں، تو ان کے واقعات کا آپ کو یقین نہ آئے کہ آدمی کھانا پینا بھول سکتا ہے، ان کو یہ پتہ نہیں رہتا کہ سورج کہاں سے نکلا اور کہاں ڈوبا؟ صبح کب ہوئی اور شام کب آئی؟ گھر میں بچے کی لاش پڑی ہوتی ہے اور سائنس کا تحقیق کرنے والا اپنے کام میں منہمک ہے۔

یہی انہماک شطرنج کھیلنے والوں تک میں آپ پائیں گے، گھر سے بار بار اطلاع آتی ہے کہ بچہ بیمار ہے، کسی حکیم یا ڈاکٹر کو بلوائیے، مگر جواب ملتا ہے کہ ذرا ایک بازی اور ہو جائے، پھر خبر آئی کہ بچے کا انتقال ہو گیا اور یہ شطرنج کی چالوں میں بدستور غرق رہے۔

انسان کا استغراق اور انہماک

جہاں تک انسان کے استغراق کا اور انہماک کا تعلق ہے، جہاں تک انسان کے اپنے مقصد کے پیچھے مجنوں بننے کا تعلق ہے، آپ کو ہر طبقہ میں اس کے واقعات ملیں گے۔

یورپ اور امریکہ کے لوگ جنہوں نے بجلی، ریڈیو، ریل گاڑی، ٹیلیفون اور دنیا بھر کی نئی چیزیں ایجاد کیں، نظریۂ اضافیت اور ایٹمک انرجی کو دریافت کیا، آئن اسٹائن وغیرہ ان کے اگر آپ دماغی استغراق اور جسمانی انہماک اور مجاہدے کے واقعات اپنے میدان میں پڑھیں یا سنیں، آپ کو یقین کرنا مشکل ہو جائے، آپ ان واقعات کو انسانوں کے نہیں بلکہ جناتوں کے قصے کہیں، اسی طریقہ سے جس میدان کو انسان انتخاب کرے، اور اس کو اپنی محنت کا مرکز بنائے، اور اپنی توجہ مرکوز کرے، اور پھر کوشش شروع کرے، تو محیر العقول نتائج ظاہر ہوں گے، یہ سنت اللہ ہے۔

اولیائے کرام کے آپ حالات پڑھیں تو ان کے اپنے نفس پر قابو پانے کے واقعات ہمارے ناقص فہم میں آنا مشکل ہو جاتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے متعلق آتا ہے کہ چالیس برس تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے رہے، آدمی کی آنکھ نہ جھپکے اور اتنی بھی نیند نہ آئے کہ اس کا وضو جاتا رہے، یہی ایک واقعہ ایسا ہے کہ جو زبردست مجاہدہ کا طالب ہے، متعدد اہل اللہ کے ایسے واقعات ہیں، اور ان میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، ہمیں اس پر پورا یقین ہونا چاہیے، مادی میدانوں میں کوشش کرنے والوں کا استغراق و انہماک ناقابل فہم اور ناقابل یقین حد تک ہوتا ہے، تو یہ تو اولیاء اللہ تھے۔

اب میں آپ سے کہتا ہوں، ببانگ دہل کہتا ہوں، اور ہر جگہ اعلان کرنے کے لیے تیار ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ اب بھی مدد کرنے کے لیے تیار ہے، مدد نہیں امداد عربی معنوں میں، اللہ تعالیٰ اب بھی جھولی بھر دینے کے لیے، مالا مال کر دینے کے لیے تیار ہے، اس کا اعلان ہے اور اب بھی اس کی یہ سنت جاری ہے، صرف ہمارے اور آپ کی طرف سے یہ کمی ہے۔

مغرب کی ترقی کا راز

آج مادیت کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اعلیٰ صلاحیت اور ذہانت کے مالک انسان پورے انہماک اور لگن کے ساتھ اس میدان میں لگے ہوئے ہیں، آج مغربی علوم، سائنس، ٹیکنالوجی کی ترقی اور یورپ کی سیادت کا راز کیا ہے؟ آج مغربی زبانوں کی ترقی کا راز کیا ہے؟ کیا اس کا راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ التفات اپنے پیغمبروں اور ان اولیاء اللہ کی اولاد سے پھر گئی جنہوں نے فاقہ کر کر کے علم کی خدمت کی، لوگوں کو جہنم کے راستے سے ہٹا کر جنت کے راستے پر ڈالا، دوسروں کے لیے اپنی رات کی نیند حرام کی، پیٹ پر پتھر باندھے، دنیا کی کسی نعمت کا مزہ نہیں چکھا؟ کیا اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں اور پشتوں پر اتنا ناراض ہوا؟ کیا ان اولیاء اللہ کو ان کی محنتوں کا یہ صلہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی پشتوں کو محروم کر دیا اور یورپ پر اللہ تعالیٰ کی ایسی نظر عنایت ہوئی، حالانکہ کون سا کام یورپ نے اچھا کیا؟ کیا یورپ کے اعمال ان ہی نعمتوں

کے مستحق ہیں؟ یورپ کے لوگ جو آج تمام دنیا پر چھائے ہوئے ہیں، کیا ان کے بزرگ بڑے عابد و زاہد تھے؟ ولی اللہ تھے؟ ذرا ''تاریخ اخلاق یورپ'' پڑھیے، ڈریپر کی کتاب ''معرکۂ مذہب و سائنس'' پڑھیے، دوسروں کا تو کیا ذکر ہے جو خدا کا نام تک نہیں جانتے تھے، جو مذہب کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے تھے ان کے اعمال کو دیکھیے، کلیسا کے نمائندوں کے مظالم کو آپ پڑھیے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کیا یہ اعمال اللہ تعالیٰ کو اتنے پسند تھے کہ علم و سیادت، حکومت و شوکت سب ان ہی کو دے دیا؟ اور ہمارے اعمال اتنے خراب تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو غلام بنا دیا، ہم میں انحطاط ہے، ہمارے سماجی، تعلیمی، سیاسی نظام میں زوال ہے، اور کوئی جرجانی، غزالی، رازی نہیں پیدا ہوتا، وہاں نہ معلوم کتنے اڈیسن (Addison) اور آئن اسٹائن (Einstein) اور نیوٹن (Newton)، بیکن (Bacon) اور ہر فن کے مجتہد اور صاحب کمال پیدا ہو رہے ہیں۔

بتاؤ؟ یہ پہیلی بوجھو، وہ قوم جو عیسائی ہے بلکہ حقیقی عیسائی بھی نہیں، جو دو دو عالمی لڑائیاں لڑ چکے ہیں اور ساری دنیا کو ختم کرنے کے درپے ہیں، دنیا کے ہر گناہ اور غلط فعل میں یہ مبتلا ہیں، قوموں کو لوٹنے والے، ملکوں کو غلام بنانے والے، عرب اسرائیل کا واقعہ دیکھو، اس سے بڑھ کر کوئی آنکھوں میں خاک جھونکنے اور زبردستی کرنے کی کوئی اور مثال مل سکتی ہے؟ اور یہ قومیں سینکڑوں برس سے یہی کرتی آئی ہیں، پھر کیا بات ہے کہ وہ ترقی کر رہے ہیں؟ کیا بات ہے کہ ان کی زبان سے جو نکلتا ہے، ساری دنیا اس کے سامنے سر جھکا دیتی ہے؟ کیا بات ہے کہ ان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے؟ کیا بات ہے کہ سائنسداں اور اہل کمال کے پیدا ہونے کا سلسلہ وہاں ختم نہیں ہوتا؟ نہ امریکہ میں ایجادوں کا سلسلہ بند، نہ روس میں ایجادوں کا سلسلہ ختم، روز افزوں ترقی ہے، اس سے ہمارے بعض نادان دوستوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے مقبول بندے ہیں، اس پر ایک صاحب نے کتاب بھی لکھی، ہمیں تو نہ ان کے بزرگوں کے اعمال اچھے معلوم ہوتے ہیں، نہ ان کے اعمال پسندیدہ ہیں، ہم نے یورپ جا کر انہیں دیکھا کہ کتنا شراب پیتے ہیں، بدمست رہتے ہیں، ظلم کرتے ہیں، اور کتنے خدا سے غافل ہیں، پھر

بھی ان کی ہر چیز ترقی کر رہی ہے اور ہماری ہر چیز مرجھا رہی ہے، سوکھ رہی ہے، ہماری اخلاقیات، سیاسیات، تعلیمات، سب روبہ زوال ہیں، ہمارے تمدن وتہذیب انحطاط پذیر، ہمارے کس شعبہ میں ترقی ہے؟ مصروشام اور سعودی عرب کہیں بھی ترقی کا نام ونشان نہیں، کس چیز نے کس میدان میں ترقی کی؟

پہیلی بوجھو، اگر وقت ہوتا، ہم کہتے چار دن کی مہلت، مگر ہمیں تو خود ہی فرصت نہیں، ہم پہیلی بھی آپ کے سامنے رکھتے ہیں اور بوجھ کر بھی دیتے ہیں۔

محنت کا پھل ضرور ملے گا

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ازلی ہے جو محنت کرے گا، جو کوشش کرے گا، جو بھی کسی چیز پر توجہ مرکوز کردے گا، ہم اسے اس کا پھل ضرور دیں گے، اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ وہ اچھی یا بری، کوشش ہوگی، ہم اس کا پھل دیں گے، ببول کا درخت پھلے پھولے گا، کانٹے پیدا ہوں گے، سیب کا درخت سیب کے پھل دے گا، اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم سیب لگاتے ہو کہ ببول لگاتے ہو، ہمارا قانون یہ ہے کہ جس چیز کا درخت لگاؤ گے، زمین مدد کرے گی، بادلوں کو حکم ہے، پانی کو حکم ہے کہ وہ اس کی نشو ونما میں مدد کرے۔

یورپ آج کوشش کر رہا ہے، سائنس میں، علوم وفنون میں، سیاسی اور اقتصادی فلسفوں کو بنانے میں، پھیلانے میں، اور ان کا پرچار کرنے میں یورپ کوشش کر رہا ہے، لسانیات میں، ادبیات میں، اقتصادیات میں، آج نہیں سینکڑوں برس پہلے ہماری جب کوشش تھی تو اس نے تاریخ عالم پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، مجدد الف ثانیؒ اور مشائخ چشت کے حالات پڑھو تو معارف وحقائق کے جو موتی ہیں، ان سے آدمی سکتے میں رہ جائے، کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے کتاب کھولی اور کہا کہ اب ہضم نہیں ہوتا، دماغ جواب دے دیتا ہے، انسان ایسے باریک نکتوں تک پہنچ سکتا ہے، ایسے نفس انسانی کی معرفت، ایسے معارف وحقائق، ایسے کمزوریوں کی پہچان، اللہ تعالیٰ کی یاد کی ایسی لذت، ایسا استغراق!!

یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ ان حضرات نے اس پر اپنی پوری توجہ مرکوز کی، اور اس کے لیے جو صلاحیتیں انھیں دی تھیں، وہ استعمال کیں، ہمارے جیسے انسان تھے مگر ان بلندیوں تک پہنچے، بزرگان دین کے اخلاقی واقعات کو پڑھیے، ذہن کام نہیں کرتا۔

اخلاقی بلندی کا ایک واقعہ سن لیجیے، ایک مسافر ایک مسجد میں آیا، وہ اپنے ساتھ ایک تھیلی بھی لایا جیسے مسافروں کے پاس اس زمانہ میں ہوا کرتی تھی، نماز پڑھنے لگا، کسی نے اس کی تھیلی اڑادی، اس مسجد میں یہ مسافر تھا اور ایک بزرگ تھے، تیسرا کوئی شخص نہیں تھا، اس کو یہ شبہ ہوا کہ یہاں بجز ان صاحب کے اور کوئی نہیں، میری تھیلی انھوں نے ہی چرائی ہے، بس آؤ دیکھا نہ تاؤ، اور انھیں بے تحاشا مارنے لگا، بہت ہی زدوکوب کیا، اتنے میں لوگوں کو معلوم ہوا کہ بزرگ کے ساتھ یہ معاملہ کیا جارہا ہے، وہ بڑے پائے کے بزرگ تھے، لوگ دوڑے، بیچ بچاؤ کیا اور اس مسافر پر ناراض ہوئے، اب اس مسافر کو محسوس ہوا کہ اس سے غلطی ہوئی اور وہ ان بزرگ کے قدموں پر گر گیا اور کہا کہ حضرت! مجھ سے بڑا قصور ہوا، میں شبہ میں آپ سے گستاخی کر گیا، تو ان بزرگ نے جواب میں کہا کہ بھئی! معافی مانگنے کا کیا سوال، جتنی مرتبہ تم مجھے مارتے تھے میرے دل سے یہ دعا نکلتی تھی کہ خدایا! میں جنت میں اس وقت تک نہ جاؤں گا جب تک یہ بندہ جنت میں نہ جائے، تم مار رہے تھے اور میں تمہارے لیے دعا میں مشغول تھا، ایسے صدہا واقعات تم کو ملیں گے۔

کانٹوں کے ساتھ کانٹوں کا اضافہ دنیا بھر میں کانٹے بھر دے گا، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا مشہور مقولہ ہے کہ ''سیدھوں کے ساتھ سیدھے اور ٹیڑھوں کے ساتھ بھی سیدھے''۔

جس صنف میں تلاش کیجیے ہمارے بزرگوں کی بلندی کے نشانات ملیں گے، ان کی اخلاقی بلندی، عالی ظرفی، مکارم اخلاق، ان کے اخلاق کی باریکیاں اپنی مثال آپ ہیں۔

اب علم کے میدان میں دیکھیے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا علم، ان کے واقعات پڑھ کر آدمی انہیں افسانہ سمجھتا ہے، امام بخاریؒ کے حافظہ کی روایات دیکھو جن کے حافظہ کی مثال نہیں ملتی، ان کے حافظہ کا مشہور واقعہ وہ ہے جو بغداد میں پیش آیا، اور جن کو تم نے کتابوں میں پڑھا

ہوگا، کتنے ہی آدمیوں نے حدیث کے متن وسند میں گڈ مڈ کر کے حدیثیں پڑھیں اور امام بخاریؒ نے ان سب کی تصحیح صرف اپنے حافظہ کی مدد سے کی۔ ''علمائے سلف'' یہ کتاب آپ پڑھیں تو ہمارے اسلاف کے علمی ذوق، ذہانت وقوت حافظہ کے سینکڑوں واقعات آپ کو ملیں گے، ابن جوزیؒ کی مجلس وعظ میں مختلف قسم کے سینکڑوں سوالات آتے، اور وہ ایک ایک پرچہ کے جواب شافی دیتے، یہ سب اس آیت کی تفسیر ہے کہ ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ﴾ (۱) جو جو کچھ بھی اللہ سے مانگے گا، اللہ تعالیٰ اسے دے گا، بس مانگنے کی ہمت اور حوصلہ کا معاملہ ہے۔

اس امت نے جس میدان کو اختیار کیا، اس میں کمال حاصل کیا، میدان جہاد ہو یا گوشۂ علم وتحقیق، ہر جگہ انھوں نے امتیاز پیدا کیا، جہاد کی ہوا چلی تو ایسے واقعات ان سے رونما ہوئے کہ زندگی کا اتنا شوق نہیں رہا جتنا موت کا شوق غلبہ پا گیا۔

زہد وعبادت کا معاملہ لیجئے، بادشاہوں سے استغناء کا معاملہ لیجیے، ایک سے ایک بڑھ کر واقعہ آپ کو تاریخ میں ملے گا، علاء الدین خلجی نے حضرت نظام الدین اولیاء سے ملاقات کرنی چاہی، حضرت نے جواباً فرمایا کہ میرے دو دروازے ہیں، بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوگا تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں گا۔ ابھی قریب کے زمانہ میں بھی ایسے مستغنی لوگ گزرے ہیں۔

علم وفن کے میدان میں اگر انھوں نے حدیث، تفسیر، فقہ کو اپنی محنت وجد جہد کا مرکز و موضوع بنایا، تو ان علوم کو آسمان تک پہنچا دیا، دیکھ لو اپنے ندوہ کا کتب خانہ، دیکھو تفسیر میں کتنی کتابیں ہیں ہمارے علماء کی، حدیث میں تو اتنے تنوع وتفنن سے کام لیا ہے کہ جس کا اعتراف مستشرقین کو بھی ہے۔

پھر سیرت کو لیجیے، اس امت نے ان میدانوں کی طرف رخ کیا تو وہاں تک پہنچ گئے جہاں تک انسان کا ذہن نہیں پہنچتا، اور یورپ جب مادیات کے میدان میں کوشاں ہوا تو

---

(۱) سورة الإسراء: ۲۰

وہاں تک پہنچا کہ ہمارے آپ کے سمجھ میں آنے والی بات نہیں رہی۔

یہ مقبولیت اور نامقبولیت کا معاملہ نہیں، بلکہ محنت و جد و جہد اور توجہ و یکسوئی کا مسئلہ ہے، آج ہمارے مدارس سے امام غزالی اور امام رازی کیوں نہیں پیدا ہو رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ اب بھی قادر ہے کہ اس سطح کے اہل کمال پیدا کرے۔

سات کروڑ کی ملت، بلکہ ایک صاحب کی تحقیق تو یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان ۱۷ کروڑ ہیں، اتنی بڑی ملت اور یہاں کی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا ہے! ہمارے بزرگ مقناطیس کی طرح مسلم اور غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچتے تھے، ابھی ترانے میں مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا نام لیا گیا، جن کے خلفاء اور منتسبین ہی کا قائم کردہ یہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ہے، ان کی خدمت میں لفٹننٹ گورنر اور سرآسمان جاہ چلے آرہے ہیں جو حیدرآباد کے امیر الامراء تھے، ان کی آمد کے موقع پر کانپور سے اناؤ تک ایک تہلکہ مچا تھا، مگر حضرت کی خانقاہ میں اس کا کوئی ذکر اور آمد کی اہمیت نہیں تھی، یہ نمونے ابھی ہم نے دیکھے، ان لوگوں نے آخرت کو، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور کبریائی کو اپنے سامنے رکھا، اور اس میدان میں محنت و مجاہدہ کیا، تو اس مقام تک پہنچے۔

اب کیوں ایسے ممتاز افراد علم، روحانیت اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں نہیں پیدا ہو رہے ہیں، جب کہ یہ دین ابدی اور یہ آخری امت ہے؟

صرف یہ وجہ ہے کہ ہم کو آپ کو شوق نہیں رہا، ہماری ہمتیں اور کوششیں چھوٹی چھوٹی حقیر چیزوں میں صرف ہو رہی ہیں، ہمارے تعلیمی نظام میں بڑا انحطاط ہو گیا، آج ہندوستان میں لاکھوں علم دین کے طالب علم ہیں، مگر کوئی ماہر فن اور عبقری پیدا نہیں ہو رہا ہے، اس میں قصور صرف ہمارا ہے کہ ہماری ہمتیں بلند نہیں، ہم اللہ سے مانگتے نہیں، ہم کوشش نہیں کرتے، اگر تم کوشش و جد و جہد کرو گے تو تمہارے اندر بھی مقابلے اور مسابقت کا وہی جذبہ پیدا ہو گا جیسا کہ یورپ میں آج ہے۔

یورپ میں ہزاروں افراد، علمی ادارے، یونیورسٹیاں جد و جہد میں لگی ہیں، جرمن قوم کا

یہ حال کہ اس نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنے کو کتنا سنبھالا اور بنالیا۔

اخلاص واختصاص

اخلاص اور اختصاص یہ دو کنجیاں ہیں، اللہ کے ساتھ اخلاص کا معاملہ اور علم کے ساتھ اختصاص کا معاملہ، اللہ کی رضا کے لیے ہم پڑھیں اور علم میں ہم امتیاز پیدا کریں۔

اب بھی علم کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، فضل وکمالات کے دروازے کھلے ہیں، انسانی کوششوں کے نتائج اب بھی تیار کھڑے ہیں، جیسے گھنگھور گھٹا برسنے کے لیے تیار کھڑی ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتیں برسنے کے لیے تیار کھڑی ہیں، لیکن جب آپ ہی کے اندر پیاس نہ ہو تو بارش برسے اور ختم ہو، بادل آئیں اور چلے جائیں، ایک قطرہ بھی آپ کو نصیب نہ ہو، جو کچھ تغیر ہوا ہے وہ عالم میں نہیں ہمارے اندر ہوا ہے، دنیا نہیں بدلی، سنت اللہ نہیں بدلی، ہم بدل گئے، آج شوق پیدا ہو جائے تو ہر فن کا عالم اور ہر فن کا امام پیدا ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہماری ہمتوں کو بلند کرے، تمہارے اندر لعل و گہر ہیں، تمہارے اندر بڑے بڑے ذکی اور متبحر عالم تمہارے ان سادہ کپڑوں کے اندر مستور ہیں، مگر تم کو خبر نہیں، ہمت بلند کرو تو تمہارے اندر سے ایک نئی شخصیت برآمد ہوگی جو زمانہ کے لیے حیران کن ہوگی ؎

برخود نظر کشاز تہی دامنی مرنج
درسینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند[1]

---

(۱) رواق سلیمانی، دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں طلبہ کے سامنے ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۳ء میں نئے تعلیمی سال کے آغاز پر کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا محمد معاذ اندوری ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از "تعمیر حیات"، لکھنؤ، (شمارہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۷۳ء)۔

عالمِ اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ

میرے عزیز بھائیو!

میں اس مرتبہ ایک طویل وقفہ کے بعد آپ کے سامنے کچھ کہنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں، یہ طویل وقفہ اپنے حساب، ماہ وسال کے حساب اور ساعت و گھڑیوں کے حساب سے اتنا طویل نہیں ہے، لیکن واقعات وحوادث کے لحاظ سے اور تغیرات وانقلابات کے پیمانے سے بہت طویل ہے، اس وقفہ میں ہمارے ملک میں اور ہمارے ملک سے باہر، ہمارے وسیع تر وطن میں یعنی دنیائے اسلام میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، جو اہم واقعات پیش آئے، ان تبدیلیوں کا اور حوادث و واقعات کا تقاضا یہ ہے کہ میں آپ کے سامنے دنیائے اسلام کے متعلق کچھ کہوں۔

اور اتفاق سے اس وقفے کے اندر مجھے دوسفر پیش آئے، گذشتہ گرمیوں میں جون کے مہینے میں میں نے ایک وفد کے رکن کی حیثیت سے جو رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے تیار کیا گیا تھا، افغانستان، ایران اور چار عرب ملکوں کی سیاحت کی، پھر اس کے بعد ابھی ماضی قریب میں، میں ایک دوسرے طویل سفر سے واپس آیا ہوں، مجھے رابطہ عالم اسلامی کے جلسے میں شرکت کے لیے اس کے مستقر مکہ معظّمہ جانے کا موقع ملا، اور یہ زمانہ اس لحاظ سے بہت اہم تھا کہ اسی زمانے میں یا میری حاضری سے کچھ پہلے مشرق وسطیٰ میں بہت بڑی جنگ پیش آئی تھی، جو عربوں کے حالات اور عربوں کے موجودہ نقشے کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی تھی، اور اس جنگ نے کہا جاسکتا ہے کہ ایک نئے دور کا آغاز کیا اور بہت سی ایسی چیزیں ابھر کر سامنے آئیں جو اس سے پہلے بہت دبی ہوئی تھیں، عربوں میں ایک نیا اعتماد پیدا ہوا اور

انھوں نے اپنے یہاں تجربہ کیا اپنی صلاحیتوں کو دیانت داری اور سنجیدگی کے ساتھ استعمال کرنے اور ان کے نتائج کو دیکھنے کا، ایک مسلمان کی حیثیت سے اور تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اور ایک ایسے انسان کی حیثیت سے جو اپنی قسمت کو عالم اسلام اور پھر عالم عربی سے وابستہ سمجھتا ہے، اور جس کے انجام پر اور جس کی عزت پر اور ذلت پر، اس کے اعتماد اور بے اعتمادی پر واقعات کا گہرا اثر پڑتا ہے، میرے لیے اس سفر میں بہت بڑے مطالعہ وغور وفکر کا سامان تھا، اوواس سے بہت اہم نتائج نکالے جاسکتے تھے، پھر حج کا متبرک زمانہ بھی اسی قیام کے زمانے میں آ گیا اور اس کی برکت سے عالم اسلام کی بڑی اہم شخصیتوں اور خاص طور پر مشرق وسطی اور پڑوسی ممالک مصر وشام کے بہت سے اہم اشخاص سے ملنے کا اتفاق ہوا، معلومات میں اضافہ ہوا، نئے نقطۂ نظر سامنے آئے، بعض نئے حقائق بھی سامنے آئے، اور سب کا تقاضا ہے کہ میں ان میں سے کسی پہلو کے متعلق اظہار خیال کروں، اور آپ کو جو آپ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے ہیں اور آپ کے لیے دیکھنا بھی آپ کی اس مصروف زندگی میں مشکل ہے، میں ان حقیقتوں کو آپ کے سامنے لاؤں، آپ کا مجھ پر حق بھی ہے اور آپ سے بڑھ کر اس سے زیادہ کوئی موزوں اور مناسب مجمع نہیں ہوسکتا۔

اندرونی درد باہر کی دنیا میں

لیکن میں ان ساری چیزوں سے جس کو کہتے ہیں کہ آدمی چوٹ کھایا ہوا ہوتا ہے، یا کسی حقیقت کا غلبہ ہوتا ہے، تو اس کو ہر واقعے میں ہر منظر میں اپنی کام کی چیز نظر آتی ہے، اور وہ اپنے اندرونی درد کو باہر کی دنیا میں دیکھتا ہے، ایک عرب شاعر کو جو اپنے بھائی کے فراق کا داغ اٹھا چکا تھا، اور اس پر اس کا قلق اور اس کا طبعی صدمہ پورے طور پر غالب تھا، لوگوں نے اس پر ملامت کی کہ وہ ہر قبر کے پاس ٹھہرتا ہے اور وہاں اپنے آنسو بہاتا ہے، لوگوں نے کہا کہ یہ سلسلہ تو بڑا دراز ہے، اور ہر قبر کا یہ حق کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ غمزدہ آدمی اس کے پاس ٹھہرے اور اپنے پرانے زخموں کو یاد کرے، اور اپنا غم تازہ کرے، تو اس نے کہا:

لَقَدْ لَامَنِيْ عِنْدَ الْقُبُوْرِ عَلَى الْبُكَا　رَفِيْقِيْ لِتَذْرَافِ الدُّمُوْعِ السَّوَافِكِ
فَقَالَ أَتَبْكِيْ كُلَّ قَبْرٍ رَأَيْتَهُ　لِقَبْرٍ ثَوَى بَيْنَ اللِّوَى فَالدَّكَادِكِ
فَقُلْتُ لَهُ إِنَّ الشَّجَا يَبْعَثُ الشَّجَا　فَدَعْنِيْ فَهٰذَا كُلُّهُ قَبْرُ مَالِكِ

(میرے دوست نے مجھے ہر قبر کے پاس مسلسل آنسو بہانے اور رونے پر ملامت کی، تو اس نے کہا کہ کیا تو اس قبر کی وجہ سے جو مقام لوی اور دکادک کے درمیان ہے، ہر اس قبر پر روئے گا جس کو کہ دیکھے؟ میں نے اس سے کہا کہ غم غم کو ابھارتا ہے، بس تو مجھے چھوڑ دے، یہ سب مالک کی قبریں ہیں۔)

یہ متمم بن نویرہ کے اشعار ہیں، جو اس نے مالک بن نویرہ کے مرثیہ میں کہے، اور اس میں ایک بڑی حقیقت کی ترجمانی کی ہے، ایک عالمی حقیقت، ایک ابدی حقیقت، ایک عالمگیر حقیقت، بعض مرتبہ شعراء اپنے محدود دائرے کے اندر اور محدود تر واقعات کے اثر سے بعض عالمگیر حقیقتوں کا اظہار کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ جب چوٹ ابھر آتی ہے، ہر وہ چیز کہ جو اس داغ کو تازہ کرے اور زخم کو ذرا سا بھی چھیڑ دے، اس سے اس زخم کی کسک پیدا ہو جاتی ہے۔

عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ

ایک ادارے کے خادم ہونے کی حیثیت سے اور عالم اسلام میں اس وقت جو زوال رونما ہے، انسانی زوال، انسانی صفات کا زوال، انسانی طاقتوں کا زوال، فکر صحیح، ایمان قوی، اور انسانی بلندی کا زوال، یہ زوال ایک ایسی عالمگیر حقیقت ہے جو تمام حقیقتوں پر غالب ہے، اور وہ شخص جس نے زوال کا تجربہ کیا ہے اور وہ جو اس زوال سے پورے طور پر آشنا ہے، ہر چیز کی توجیہ اسی سے کرے گا، ہم اور آپ دن رات تجربہ کرتے ہیں، اگر کوئی شخص جس پر کوئی حقیقت مستولی ہو جائے اور اس کا جزو ایمان بن جائے، اور وہ سمجھے کہ حقیقی مرض یہ ہے، اس کو ہر جگہ وہی مرض نظر آئے گا، آپ نے سنا ہوگا کہ کسی بھوکے سے پوچھا گیا کہ دو دو کتنے ہوتے ہیں؟ تو اس نے کہا: چار روٹی، اس کے نزدیک معدہ کی حقیقت ہی یہی تھی، اس کے نزدیک سب

سے بڑی حقیقت روٹی تھی، تو عدد کا مصداق اس کے نزدیک اس حقیقت سے زیادہ کوئی نہیں تھا کہ جو اس کے ذہن و دماغ پر مستولی اور اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست تھی، تو مجھے ان سارے واقعات میں خواہ سیاسی ہوں، تمدنی ہوں، خواہ علمی و فکری ہوں، سب میں اس زوال کی پرچھائیاں نہیں بلکہ اس زوال کا چہرہ نظر آیا، تابناک چہرہ، بالکل درخشاں چہرہ نظر آیا، اور ہر واقعہ سے مجھے یہ پیام ملا کہ اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ ان انسانوں کا فقدان ہے جو طاقتور ایمان رکھتے ہوں، علم صحیح کی دولت سے مالا مال ہوں، اور جن کے اندر دینی استقامت ہو، اور جن کی نگاہ بلند ہو، سخن دلنواز ہو اور جاں پرسوز ہو۔

جاں باز ملاح مفقود

یہ عالم اسلام کی اس وقت سب سے بڑی حقیقت ہے، اور یہ حقیقت جو شخص اگر اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ لے پھر وہ اپنے دماغ اور آنکھوں کو دھوکہ نہیں دے سکتا، اس سے آپ کچھ بھی کہلوائیے، کوئی بھی موضوع ہو، کہیں سے واپس آیا ہو، بیت اللہ کے طواف سے واپس آیا ہو، یا مسجد نبویؐ کی زیارت سے واپس آیا ہو، علماء کی کسی مجلس سے واپس آیا ہو، یا کسی سیاسی مؤتمر سے واپس آیا ہو، اس نے اخبار پڑھا ہو، یا تاریخ کی کوئی کتاب پڑھی ہو، یا کوئی داستان پڑھی ہو، یا کوئی ادبی شاہکار پڑھا ہو، اس پر یہ حقیقت پورے طور پر غالب رہے گی، جب بولے گا تو اسی کی زبان سے، اور جب دیکھے گا تو اسی کی آنکھ سے، اس وقت پورے عالم اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ قیادت تو بڑی چیز ہے، موجودہ حالات سے آنکھیں ملانے والے، موجودہ حالات کے چیلنج کو قبول کرنے والے، اور اس دھارے کے خلاف چلنے والے، یا کشتی چلانے والے تو بڑی چیز ہے، ہاتھ پیر مارنے والے بھی ناپید ہیں، ایسے جانباز ملاح آج عالم اسلام میں مفقود ہیں، جیسے کسی زمانے میں لوگ عنقا کی مثال دیا کرتے تھے، پتہ نہیں اس کی کیا حقیقت ہے؟ اس کا کہیں وجود ہے یا نہیں؟ لغت میں لکھا ہے: معروف الاسم مجہول الجسم، اس سے بہتر اس کی تعریف نہیں ہوسکتی، لیکن آج کا سب سے بڑا عنقا جو ہے وہ وہ مسلمان ہیں جو ان حالات سے شکست نہ کھائیں، شکست ماننے کے لیے تیار نہ ہوں، اور وہ "آہنگ

میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن'' جس کو اقبالؒ نے کہا ہے، جیسے سورہ رحمٰن میں ہر چیز میں تنوع ہے، اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں گنا تا ہے، لیکن اس کے بعد کہتا ہے: ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ (۱)، شواہد میں کتنا تنوع ہو، دلائل میں کتنا تنوع ہو، لیکن نتیجہ ایک ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ (تم اللہ تعالیٰ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟) تو وہ جو اپنے آہنگ میں یکتا ہو، اپنے رنگ میں بھی یکتا ہو، اس مسلمان کی نایابی، اس مسلمان کا فقدان، اس مسلمان کا عنقا صفت ہو جانا یہ اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

اسلام کا قلعہ عیسائیت اور یہودیت نے فتح کر لیا

میرے عزیزو! میں آپ کے سامنے بہت سے وہ حالات سنا سکتا تھا، آپ کے دلچسپی کے بھی اور اپنی تسلی کے بھی، میں آپ کو مصر وشام کی داستان سنا سکتا تھا، میں آپ کو عالم تصور میں حجاز کی گلیوں، مکہ ومدینے کی گلیوں میں لے جا سکتا تھا، میں آپ کو عالم تصور میں بیت اللہ کا طواف بھی کرا سکتا تھا، میں آپ کو حرم نبویؐ سے بلند ہونے والی اذان جس پر ہزاروں بلبلوں کی صدائیں اور ہزاروں نقاروں کی بلند آہنگیاں قربان، وہ تک میں آپ کے کانوں تک پہنچا سکتا تھا، بار بار دیکھا، بار بار سنا، جسم و جان میں سب چیزیں پیوست ہو گئیں، اور ایمان کا بھی، عقیدے کا بھی، جذبات کا بھی جزو بن گئی، یہ سب میرے لیے آسان تھا، میں آپ کو سفر نامہ سنا سکتا تھا، اور اقبالؒ نے تو کہا ہے ۔

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیلؑ
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

واقعہ یہ ہے، سب کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ اسلام کا قلعہ عیسائیت نے اور یہودیت

---

(۱) سورۃ الرحمٰن

نے فتح کرلیا، اور اس لیے فتح کیا کہ اس قلعے میں قطعاً کوئی کمزوری نہیں، اس قلعے کی دیواریں آہنی، اس قلعے میں وہی میگزین موجود جو پہلے تھے بلکہ اس سے زیادہ، لیکن صرف یہ کہ وہ غیور مسلمان نہیں رہا، وہ اس کا پاسباں نہیں رہا، وہ صفات و اخلاق اور وہ علم صحیح اور سیرت میں پختگی و کردار کی مضبوطی اور استقامت نہیں رہی، تو مجھے سب جگہ، میں زیادہ واضح الفاظ میں کہوں، مجھے سب جگہ ندوہ نظر آیا، مجھے سب جگہ ہندوستان نظر آیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ آدمی نہیں

کوئی مسئلہ نہیں عالم اسلام میں، نہ پاکستان کا کوئی مسئلہ ہے، نہ مصر کا کوئی مسئلہ ہے، نہ شام کا کوئی مسئلہ ہے، نہ سعودی عرب کا کوئی مسئلہ ہے، نہ سوڈان کا کوئی مسئلہ ہے، نہ ہندوستان کا کوئی مسئلہ ہے، نہ کوئی مشکل (Problem) ہے، نہ کوئی ایسا معمہ ہے، نہ کوئی ایسی گتھی ہے، نہ کوئی چیستاں ہے، نہ کوئی ایسا ذہانت کا امتحان ہے، کچھ نہیں، سارا مسئلہ یہ ہے کہ آدمی نہیں، آدمی کیوں نہیں کہ آدمیت کی جو کارگاہیں ہیں، جو انسانیت کے کارخانے ہیں، جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں ہونا چاہیے، وہ کارگاہیں اس وقت معطل پڑی ہیں، یا وہ کارگاہیں چل رہی ہیں، مگر آدمی تیار نہیں ہو رہا ہے، مجھے تو اپنے پہلے اور دوسرے سفر میں بھی ندوہ اور دیوبند ہی نظر آئے، اس میں کوئی مبالغہ نہیں اور کوئی خوشامد اور خودفریبی بھی نہیں ہے، میں نہ اپنے نفس کو خوش کرنا چاہتا ہوں بلکہ بالکل جیسے متمم بن نویرہ نے کہا تھا:

فَـدَعْـنِـيْ فَهٰـذَا كُـلُّـهٗ قَبْـرُ مَـالِكِ

زندہ انسانوں کے مقبرے

مجھے زندہ انسانوں کے مقبرے نظر آئے، وہ تو مردہ بھائی پر روتا تھا، میں زندہ انسانوں پر روتا ہوں، کون زیادہ بدقسمت اور قابل رحم ہے، میں نہیں کہہ سکتا، شاعر ایک ایسی ہستی کو روتا تھا جس کے لیے موت مقدر تھی، اور اس کو اس دنیا سے جانا تھا اور اس کا وقت موعود آچکا تھا،

لیکن میں تو ان زندہ انسانوں پر روتا ہوں جن کو زندہ رکھنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، جو دوسروں کو زندہ کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، جس کے حصہ میں مسیحائی آئی تھی، جن کے حصہ میں دنیا کو حیات وموت کا پیغام دینا تھا، جن کو ساری دنیا کی ظلمت سے مقابلہ کرنا تھا، میں تو ان کے لیے روتا ہوں۔

میں اس فانی انسان کا مرثیہ خواں نہیں، میں تو ملت کا مرثیہ خواں ہوں، میں ان کارگاہوں کا مرثیہ خواں ہوں جن کا کام ہی یہ تھا، اگر ان کا کوئی جواز تھا، اگر ان کی کوئی افادیت تھی، اگر کوئی ان کی قدر و قیمت تھی، تو یہ کہ وہ ایسے آدمیوں کو پیدا کرے اور عالم اسلام کو زوال سے بچائے، مصر کا کیا مسئلہ ہے؟ مصر کا مسئلہ یہ ہے کہ قائد نہیں، مصر کا مسئلہ یہ ہے کہ ایک حسن البنا کے بعد دوسرا حسن البنا نہیں پیدا کر سکا، مصر کا مسئلہ یہ ہے کہ اس نے ایک ایسا آدمی (جمال عبدالناصر) پیدا کیا جس نے سارے عربوں بلکہ سارے مسلمانوں کے دلوں پر سیاہی پھیر دی اور سب کو ذلیل کر کے رکھ دیا، سارا کھیل آدمی کا ہے۔

آدمی ہے تو سب کچھ ہے

جہاں آپ جائیے گا، آپ تاریخ کے جس دور کا مطالعہ کیجیے گا، آپ کو معلوم ہوگا تاریخ کتنی پھیلی ہوئی ہے، وہ اتنی حد تک سمٹی ہوئی ہے، تاریخ کا رقبہ کتنا ہی وسیع ہو، وہ ایک ضخیم جلد ایک دور کی تاریخ کو لیجیے، پوری تاریخ تو بڑی چیز ہے، کہنے کو تو ذرا سی باتیں ہیں، لیکن پھیلا ئیے تو داستاں، لیکن سمیٹیے تو ایک نکتہ، پھیلا ئیے تو ملت کی تاریخ، پھیلا ئیے تو حوادث و تغیرات کی تاریخ اور اس کی تفسیر، اور سمیٹیے تو ایک انسان کے کام کی کہانی، صرف یہ ہے کہ وہ انسان ہے یا نہیں، اگر وہ انسان ہے تو ملت ہے، قسمت ہے، عزت ہے، اگر انسان ہے تو بالکل تاریخ کی شکل ہی دوسری، اگر انسان نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ وہی عالم اسلام تھا جو صلیبیوں سے شکست کھاتا چلا جا رہا تھا، اور ہٹتے ہٹتے اندیشہ تھا کہ حرمین کے حدود تک نہ پہنچ جائے، لیکن ایک شخص نور الدین زنگی نام کا پیدا ہوتا ہے، اور فوراً اس کے پیدا ہوتے ہی حالات میں

تغیر ہونا شروع ہو جاتا ہے، پھر اس کے بعد ایک دوسرا شخص پیدا ہوتا ہے صلاح الدین ایوبی، جو واقعات کے دھارے کو بدل دیتا ہے، تاریخ کے رخ کو بدل دیتا ہے، زمانے کی کلائی موڑ نہیں بلکہ توڑ دیتا ہے، زمانہ کی کلائی، تاریخ کی کلائی، ان صلیبی فاتحوں کی کلائی اس نے موڑی نہیں بلکہ توڑ دی، سب آدمی کا کرشمہ ہے، آدمی ہے تو سب کچھ ہے۔

عالم اسلام کی سب سے بڑی کمزوری

آج اس وقت عالم اسلام کی سب سے بڑی کمزوری ہے کہ وہ نوجوان نہیں پیدا ہو رہے ہیں کہ جن کے اندر ایمان ہو، جن کے اندر کیرکٹر ہو، جن کے اندر یقین ہو، جن کے اندر درد ہو، جن کے دل کی کلی کھلی ہوئی ہو، جیسے کہ یہاں میں نے بعض تقریروں میں کہا، دل کی کلی کھلی ہوئی ہو، دل پر چوٹ لگی نہیں، کوئی درد کی چوٹ لگی نہیں، پورے قلب وجگر کو دیکھ لیجیے، کوئی ایکسرے کے ذریعے جو خاص قسم کا معنوی ایکسرے ہو، آپ اس سے پورے جسم کے اندر اتر کر دیکھ لیجیے، کوئی درد و زخم کا نام ونشان نہیں، زبان قینچی کی طرح چلنے والی، ایسے ایسے خطیب، ایسے ایسے آرٹسٹ، ایسے ایسے صاحب فن، ایسے ایسے سیاست داں، ایسے ایسے ذہین لوگ موجود ہیں جن کے سامنے پرانی نسل کے لوگ آتے ہوئے شرمائیں، لیکن ایک مسئلہ حل نہیں ہو رہا ہے، برابر مسئلہ الجھتا ہی چلا جا رہا ہے، پاکستان کا کیا مسئلہ ہے؟ پاکستان کا مسئلہ یہ ہے کہ ملک ہے اور قائد نہیں، قوم ہے اور لیڈر نہیں، ریوڑ ہے اور ان کا کوئی چرواہا نہیں، اسی طریقے سے آپ سارے ملکوں کا حال دیکھ لیجیے، خود ہمارے ملک ہندوستان کا مسئلہ کیا ہے؟ کہ وہ لوگ نہیں، کیوں نہیں؟ جہاں لوگ پیدا ہونے چاہئیں، جو کارگاہیں ہیں، وہاں آدمی نہیں بن رہے ہیں، کیوں آدمی نہیں بن رہے ہیں؟ کس چیز کی کمی ہے؟ ایک ایک چیز کو آپ سامنے لیجیے، میں کوئی پہیلی بجھانا نہیں چاہتا، کون سی چیز ہے جو دنیا سے اٹھ گئی ہے؟ کیا قرآن شریف میں - نعوذ باللہ - کوئی تحریف ہوگئی؟ کیا حدیث شریف کے درس کا سلسلہ رک گیا؟ کیا فقہ کی کتابیں - نعوذ باللہ - ناپید ہوگئیں؟ اصول فقہ کے کتابی ذخیرے کو آگ لگ گئی؟ کوئی نیا تاتاری حملہ ہوا یا کوئی سیلاب آیا؟ کوئی چیز نہیں، وہی کتب خانے ہیں، وہی کتابیں ہیں، وہی

پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ہے، وہی خاندان ہیں، ان کے چشم و چراغ ہیں، اور وہی قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں ہیں، لیکن بات یہ ہے کہ پتہّ مارنے والے، جان کی بازی لگانے والے، یہ فیصلہ کرنے والے کہ ہم دنیا ہیں، ہم ہیں اسلام، ہم ملت اسلامیہ ہیں، ہم اسلام کی قسمت ہیں، ہم اچھے ہیں تو عالم اسلام اچھا ہے، ہم اگر مضبوط ہیں تو عالم اسلام مضبوط، عزم ایسا عزم راسخ، پھر آدمی کو اس کے بعد اس کی جگہ سے کوئی چیز ہٹا نہ سکے، ہزاروں طوفان اٹھیں، ہزاروں آندھیاں چلیں، ہزاروں سیلاب آئیں، نوجوانی کی آزمائشیں بھی، ماحول کی خرابیاں بھی، بدترین دعوتیں اور تحریکیں بھی، مختلف ترغیبات، اندرونی و بیرونی ہر طرح کی ترغیبات، انتخابات بھی، حکومتوں کی تشکیل بھی اور تخت و تاج بھی، تخت و تاج کا زمانہ تو نہیں رہا، لیکن جاہ و منصب بھی، لیکن کچھ نوجوان یہ طے کرلیں کہ ہم اپنے کو بنائیں گے، ہم ہیں سب کچھ! میں بار بار کہتا ہوں، لیکن مجھے اس سے بڑھ کر بہتر شعر نہیں ملا کہ ؎

اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

کوئی من میں ڈوبنے والا، کوئی اپنے کو پکڑ کر بیٹھ جانے والا، کوئی یہ سمجھنے والا کہ مجھ سے بڑھ کر کوئی چیز قیمتی نہیں ہے، میں اگر تیار ہوگیا، اپنے کو بنالیا تو یہ کشتی جو جھکولے کھا رہی ہے، اور معلوم ہو رہا ہے کہ اب ڈوبی اب ڈوبی، یہ کشتی کنارے لگ جائے، یہ فرق ہے آج کے زمانے اور پہلے کے زمانے میں کہ کسی نہ کسی تعداد میں، تعداد کا فرق تو برابر رہتا رہا، لیکن پہلے تھوڑی تعداد میں، اس کے بعد بڑی تعداد میں، بہر حال ہر دور میں کچھ ایسے لوگ ملتے ہیں جنھوں نے سر سے کفن باندھ لیا، کسی نہ کسی تعداد میں ایسے لوگ ملتے رہے جنھوں نے طے کر لیا کہ ہم اپنے کو بنائیں گے، اور ہم کسی چیز کا اثر نہیں قبول کریں گے، ہم ایک چٹان ہیں، ایک پتھر کی چٹان جو جنبش نہیں کرسکتی، سیلاب آئے ٹکرا کر چلا جائے اور ہار کر کے چلا جائے، لیکن ہمارے اندر جنبش نہیں ہوگی، ساری تاریخ اسلام بلکہ تاریخ انسانیت آدمی کی نمود ہے، آدمی اگر پیدا ہو رہے ہیں، اگر ایسے صاحب عزم لوگ جو اپنے متعلق طے کرلیں کہ ہمیں کسی چیز سے متاثر نہیں ہونا ہے، ہم تو اپنے دھن کے پکے ہیں، بس جان چلی جائے اس راستہ میں یا

ہم کچھ کر کے اٹھیں گے، کچھ بن کر کے نکلیں گے، اور ہم کچھ ہو جائیں گے، صاحب دعوت ہو جائیں گے، صاحب ایمان ہو جائیں گے، یہ عزم تھا جو ہمیشہ مسلمانوں کی دستگیری کرتا رہا، حوادث سے کوئی زمانہ خالی نہیں، کبھی نہ سوچیے کہ یہ زمانہ بہت پر آشوب ہے، جس زمانے کا حال دیکھیے، تاریخ میں دیکھیے، دیوان دیکھیے شعراء کے، شعراء نے اپنے زمانہ کا کیسا شکوہ کیا ہے، گویا اس سے بڑھ کر کوئی برا زمانہ تھا ہی نہیں، یہ صحیح ہے کہ کوئی زمانہ فتنوں سے خالی نہیں رہا، کوئی زمانہ آزمائشوں سے خالی نہیں رہا، لیکن ہر زمانے اور ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے جنھوں نے سر سے کفن باندھ لیا اور انھوں نے کہا، ہمیں تو کسی چیز سے مطلب نہیں، ہم تو اپنے آپ کو بنائیں گے، اپنی سیرت کی تعمیر کریں گے، ہم تو خدا کے رسول ﷺ کا بنایا ہوا راستہ اختیار کریں گے، نہ دائیں طرف دیکھیں گے اور نہ بائیں طرف دیکھیں گے، انہیں میں کوئی غزالیؒ پیدا ہوا، کوئی ابن تیمیہؒ پیدا ہوا، کوئی مجدد الف ثانیؒ پیدا ہوا، کوئی صلاح الدین ایوبیؒ پیدا ہوا، کوئی شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوا، کوئی ابو الحسن اشعریؒ پیدا ہوا، کوئی طارقؒ پیدا ہوا، یہ سب وہی لوگ تھے جنھوں نے طے کر لیا کہ ہمیں راستہ اختیار کرنا ہے، ہمارے لیے تقدیر الٰہی نے یہ راستہ اختیار کر دیا ہے، ہم نے یہ راستہ اختیار کیا ہے، یا اللہ نے ہمیں اس کی توفیق دی، ہمیں اس راستے پر چلنا ہے مضبوطی کے ساتھ، اور ہر طرح کی قربانی، ہر طرح کا مجاہدہ، ہر طرح کی آزمائش ہمیں منظور ہے، اس کو قبول کریں گے، لیکن ہم اس راستہ کو نہیں چھوڑیں گے، جو کچھ آپ دیکھتے ہیں، وقتاً فوقتاً کچھ کرنیں نظر آتی ہیں، کچھ چراغ جلتے ہیں، اور ان چراغ سے دوسرے چراغ جلتے ہیں، اور عالم اسلام میں ایک نئی توانائی اور ایک نئی درخشانی پیدا ہو جاتی ہے، وہ سب اسی عزم و حوصلہ کا نتیجہ ہے۔

عزم و حوصلہ اور استقامت

ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم اپنے کو بنائیں، اپنی سیرت کی تعمیر کریں، پھر اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ہمیں صلاحیت عطا فرمائی، ان صلاحیتوں کے ساتھ اس دین کی خدمت کریں اور سب کی خدمت کریں، آخرت کی نجات کا سامان پیدا کریں، مسلمانوں کی خدمت کی کوشش کریں،

اس وقت کا جو سانحہ، جو المیہ ہے، وہ یہ ہے کہ اس عزم کی کمی پیدا ہوتی چلی جارہی ہے، اور ہمارے نوجوانوں کے اندر کسی قسم کا عزم، کسی قسم کا فیصلہ، کسی قسم کی کوئی مضبوطی، کسی قسم کی بلند نگاہی، کسی قسم کی کوئی استقامت، کسی طرح کی کوئی صلابت نظر نہیں آتی، جدید تعلیم کے مراکز سے لے کر ہمارے قدیم تعلیم کے اداروں سب کا حال یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں ایک تذبذب ہے، اپنے مستقبل کے بارے میں شک ہے، اپنے راستے کا انھوں نے ابھی انتخاب نہیں کیا ہے، ہوا کا کوئی معمولی جھونکا انہیں متزلزل کر دیتا ہے۔

تقویٰ اور صبر

میرے عزیزو! میں پھر کہتا ہوں کہ مجھے ہر جگہ ندوہ اور دیو بند نظر آیا، ہر جگہ مجھے نئے علماء کا مسئلہ نظر آیا، کان میں یہ آواز آتی رہی اور آنکھیں یہی دیکھتی رہیں کہ دنیا آپ کے لیے بالکل تیار ہے، حالات کو بدلنے کے لیے ذرا بھی دشواری نہیں، لوگ ماننے کے لیے تیار ہیں، حالات بدلنے کے لیے تیار ہیں، بلکہ زبان حال سے کہتے ہیں کہ کوئی آئے اور ہمیں بدلے، ہم تو فرمانبردار ہیں، میرا سب سے بڑا پسندیدہ موضوع طبقات اور تراجم کی کتابیں ہیں، جو لوگ مجھ سے واقف ہیں، میرے مشاغل سے واقف ہیں، میری تصنیفات کا جنھوں نے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ مجھ پر سب سے زیادہ جو ذوق غالب ہے، اور میرے لیے سب سے زیادہ جس موضوع میں کشش ہے، اور جو مطالعہ میرے لیے آسان ہے، وہ تذکرے کی کتابیں ہیں، میں نے ان تذکروں میں جو چیز پائی کہ انسانی سیرت کی تعمیر میں جس کا سب سے زیادہ بنیادی حصہ ہے، اور سب سے زیادہ مؤثر عامل یا جو عنصر ہے، وہ تقویٰ اور صبر ہے، اس لیے سورہ یوسف کی آیت جب میں پڑھتا ہوں تو ساری دنیا کی تاریخ میرے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے، تمام علماء، رجال، تمام قائدین اور وہ تمام لوگ جو قوموں کے نجات دہندہ ثابت ہوئے، یا جو سلطنتوں کے بانی ہوئے، اور یہ مقام تو کچھ زیادہ بلند نہیں، جنھوں نے امتوں کو، ملتوں کو راہ راست پر لگایا، اور جنھوں نے معرفت کے اور ولایت کے بڑے بڑے مراحل طے کیے، ان سب میں جو چیز نمایاں نظر آتی ہے، وہ صبر و تقویٰ ہے، اس

لیے جب میں سورۂ یوسف کی یہ آیت پڑھتا ہوں: ﴿قَدْ مَنَّ اللّٰـهُ عَلَيْنَا﴾، جب حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں نے بہت ہی سراپا تصویر حیرت بن کر ان سے پوچھا یہ کیا ہوا؟ ہم تو آپ کو کنویں میں ڈال کر آئے تھے، ہم آپ کی قسمت ہر گویا مہر لگا کر آئے تھے، ہم نے آپ سے چھٹی کر لی تھی، ہم کو گمان بھی نہیں تھا کہ آپ زندہ بھی رہیں گے، زندہ تابندہ و درخشاں ہونا تو الگ رہا، آپ کی زندگی کا امکان بھی نہیں تھا، انہوں نے جو جواب دیا، بہت ہی مختصر لفظوں میں جو الہامی ہیں، قرآن مجید ان کو ادا کرتا ہے: ''بیشک اللہ نے ہم پر احسان کیا''، پھر وہ اس کی اصل طاقت کا تذکرہ کرتے ہیں جو رحمتِ الٰہی کو کھینچنے والی ہے، اور اس کی عمومیت بیان کرتے ہیں کہ ﴿إِنَّهُ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ یہ میں ہی نہیں، میرا ہی معاملہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے، سنت اللہ ہے کہ ﴿إِنَّهُ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ﴾ 'جو تقویٰ اور صبر سے کام لے گا، اللہ تعالیٰ اس کا اجر ضائع نہیں کرتا' یہ انھوں نے پورا ادبی اور عالمی اصول بیان کیا کہ تقویٰ اور صبر سے زندگیاں بدلتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحقاق پیدا ہوتا ہے، اور انسان قعر مذلت سے اٹھ کر بام ثریا تک پہنچ جاتا ہے، بام عروج تک پہنچ جاتا ہے، لوگ تخت سے اٹھ کر تخت سلطنت تک پہنچ گئے۔

تقویٰ اور صبر یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ اگر میرا بس چلے تو اس کو تختی پر خوشخط لکھ کر ہر مدرسے وہر اقامت گاہ اور ہر حجرے کی دیوار پر لگا دوں، جس وقت کسی نوجوان طالب علم کی آنکھ کھلے، صبح کی اذان سے پہلے یا اذان کے بعد، تو پہلی نگاہ اس آیت پر پڑے: ﴿إِنَّهُ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾۔

میرے عزیزو! سب سے زیادہ ہم کو اور تم کو تقویٰ اور صبر کی ضرورت ہے، یہ زمانہ آزمائشوں اور دلفریبیوں اور ترغیبات سے بھرا ہوا ہے، آپ جس راستے سے گزریں گے، آپ کے دامن کو الجھانے کے لیے، آپ کے دامن کو تار تار کرنے کے لیے اتنے کانٹے، کانٹے نہیں، آج پھول بھی یہ کام کر رہے ہیں جو کسی زمانے میں کانٹے کیا کرتے تھے، اور ان پھولوں کا معاملہ ان کانٹوں سے بھی زیادہ خطرناک اور نازک ہے، یہ پھول آپ کے دامن میں آنے کے لیے، اور آپ کو فریب دینے کے لیے، آپ کو لبھانے کے لیے تیار ہیں، کوئی

راستہ، کسی گلی سے بھی آپ گزریں، چاروں طرف امتحانات کا بازار لگا ہوا ہے، فلمی گانے ہوتے ہیں، ریڈیو کی آوازیں آپ سنتے ہیں، آپ یہاں سے امین آباد جائیں تو اشتہارات دیکھیں گے، بڑے بڑے پوسٹر دیکھیں گے، غرض جیسے کہ ایک بازار ہے امتحانات کا، اس میں اگر کوئی چیز حفاظت کرنے والی ہے، اس میں اگر آپ کو اس درجہ تک پہنچانے والی ہے کہ جس درجہ پر پہنچ کر آپ اپنی بھی حفاظت کر سکتے ہیں اور ملت کی بھی حفاظت کر سکتے ہیں، اور ملک کی بھی حفاظت کر سکتے ہیں، اور پوری دنیا کی خدمت کر سکتے ہیں، وہ تقوی اور صبر سے کام لینا ہے، ہم کو اور آپ کو جس چیز کی ضرورت ہے، وہ تقوی اور صبر ہے۔ (۱)

(۱) ۱۹۷۴ء میں سفر حجاز سے واپسی کے بعد طلبۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی انجمن جمعیۃ الاصلاح میں کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا محمد دانیال بھٹکلی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ، (شمارہ ۱۰/اپریل ۱۹۷۴ء)۔

کثرتِ مطالعہ کی ضرورت

ایک بار اکبر الہ آبادی مرحوم کے پاس علی گڑھ کالج کے طلبہ کا ایک وفد آیا، اور ان سے پیغام کی فرمائش کی، انھوں نے برجستہ ایک شعر کہا، وہ شعر اس وقت ہمارے حسب حال ہے، انھوں نے کہا:

خود ان کا کورس کیا کم ہے کہ میں بھی کچھ کہوں ان سے
مری جانب سے کالج کے لڑکوں کو دعا کہنا

آپ کے تمام مقالات قابل قدر تھے، محنت سے لکھے گئے تھے، اور ان سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مقالہ نگاروں نے مطالعہ کیا ہے، مقالہ لکھنا اگرچہ کوئی اہم بات نہیں لیکن خوشی تو اس بات کی ہے کہ ہمارے عزیز طلبہ میں پڑھنے کا شوق ہے، اور مختلف لٹریچر ان کی نظر سے گزرتے ہیں، ہم سب کے استاد علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے تھے کہ ایک صفحہ لکھنے کے لیے جب تک سو صفحے نہ پڑھے جائیں وہ مقالہ پڑھنے کے قابل نہیں ہوتا، اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک صفحہ لکھنے کے لیے سو صفحہ پڑھنا چاہیے، جب جا کر اس مضمون میں کوئی حقیقت پیدا ہوتی ہے، اور کوئی اس سے استفادہ کر سکتا ہے، مجھے اس دار العلوم سے قریبی تعلق کی بنا پر اس کے ایک خدمت گزار و کارکن ہونے کی حیثیت سے یہاں کے علم و ذہن کی ارتقائی منزلوں سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہا ہے، ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ ہمارے طلبہ پڑھیں زیادہ اور لکھیں کم، جب کہ ایک صاحب نے کہا کہ ''آج لکھے زیادہ اور پڑھے کم ہیں''، اردو کی ایک تعبیر ہے ''پڑھا لکھا''، یعنی لوگ تو بڑے بڑے مضامین لکھتے ہیں مگر ان کا مطالعہ کچھ نہیں ہوتا، حالانکہ وہی مقالہ کی اصل بنیاد ہے، اور اگر اس کے بعد کوئی تحقیق ہوتی ہے تو نُورٌ عَلٰی

نُوْر، مگر اصل چیز مطالعہ ہے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ہمارے عزیز طلبہ نے جو کچھ یہاں پڑھا، ان میں ان کے مطالعہ کی خوب جھلک نظر آتی ہے، کہنے کی ایک بات یہ ہے کہ آپ جس قدر پڑھیں گے اسی قدر آپ کا ذہن ترقی کرے گا۔

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جنھیں علم لدنی حاصل ہوتا ہے، ایسے لوگ بہت نایاب ہوتے ہیں، دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اپنے علم و مطالعہ کے راستے سے کوئی انقلاب لاتے ہیں اور کوئی انقلابی کام کرتے ہیں۔ [۱]

---

(۱) دار العلوم ندوۃ العلماء میں جمعیۃ الاصلاح کے ایک پروگرام میں کی گئی مختصر تقریر، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/ستمبر-۱۰-۲۵/اکتوبر ۱۹۷۴ء)۔

سارا انحصار تمہارے فیصلہ پر ہے

میرے عزیزو! تم سے کہتا ہوں کہ سارا دارومدار اپنی محنت اور لیاقت پر ہے، کوئی اضافی چیز، کوئی خارجی چیز آدمی کو نہ عالم بنا سکتی ہے نہ ادیب بنا سکتی ہے، اور نہ زندگی میں کامیاب بنا سکتی ہے، یہ سب اس عہد کے دھوکے ہیں، ہمیشہ سے حقیقت ایک رہی ہے، اور اس کو سیدنا علی مرتضیٰؓ نے اپنے بے مثال خطبہ میں بلیغ انداز میں پیش کیا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا اور کوئی کلام ہو نہ ہو، اس کی نسبت صحیح ہو نہ ہو، لیکن اس کے کچھ ایسے جملے ضرور ہیں جو یقیناً حضرت علیؓ کی زبان سے نکلے، ان میں سے ایک جملہ 'قِيمَةُ كُلِّ امْرِیءٍ مَا يُحْسِنُهُ' اگر میرا بس چلے تو یہاں پر لکھ کر میں لگا دوں، مگر اس کی شرح چاہیے۔

انسان کا اصل جوہر

ہر شخص کی قیمت وہ ہے جو کام وہ دوسروں کے مقابلہ میں اور اپنے دوسرے کمالات کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طریقہ پر انجام دے سکتا ہے، انسان کا جوہر وہ ہے جس میں وہ دوسروں کے مقابلہ میں ممتاز ہے، اور اپنی دوسری چیزوں میں اس کو مشارکت حاصل ہے، ایک آدمی دس دس چیزیں جانتا ہے، خوش نویس بھی ہے، قاری بھی ہے، خوش آواز بھی ہے، ادیب بھی ہے، کچھ حدیث وتفسیر سے بھی مناسبت ہے، لیکن اصل جوہر مرکزی وہ ہے جس میں اس کو امتیاز حاصل ہے، اپنی ذات میں بھی اور دوسروں کے مقابلہ میں بھی، تو اس کو کسی سفارشی کی، کسی خارجی مدد اور سہارے کی ضرورت نہیں۔

ہم دونوں آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، اب میں ذرا صفائی کے ساتھ بالکل جیسے کوئی بات ہجے کر کے کہی جاتی ہے کہتا ہوں، ہم دونوں نے ممالک عربیہ کی سرزمین پر اس

وقت قدم رکھا ہے جو کچھ ہم کو بننا تھا، بن چکے تھے، ہمارا سانچہ پختہ ہو چکا تھا، مولانا کا معاملہ بھی یہی ہے، مولانا ۵۶ء میں گئے ہیں اور میں ۴۷ء میں گیا ہوں، لیکن ۴۷ء میں اس حال میں گیا کہ عربوں کے سامنے تقریر کرتا تھا اور تھوڑے دنوں کے بعد میری کتابیں چھپ کر مصر سے آ گئیں، ماذا خسر العالم ۵۰ء میں چھپی ہے، ہم کو جو کچھ بننا تھا اور جو کچھ حاصل کرنا تھا سب یہیں حاصل کیا، اور سوائے اس کے کہ بیشک ہلالی صاحب یہاں آئے اور وہ بہت بڑے زبان کے مزاج داں، نباض تھے، اور میری خوش قسمتی اس میں زیادہ ہے کہ مجھے شروع ہی میں عرب استاد ملے، لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا، ان کے تو صدہا شاگرد ہیں، ہمارے استاد خلیل عرب صاحب کے صدہا شاگرد ہوں گے، وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں برسوں سے پڑھا رہے تھے، اور ہر سال ان کو بی. اے.، ایم. اے. کی کلاسیں ملتی تھیں، اور خود ان کے گھر کا جو مدرسہ تھا، اس میں بھی درجنوں آدمی آئے اور پڑھ کر گئے، لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا۔

باقی اصل یہ ہے کہ جو آدمی شروع میں محنت کرے، اور کسی چیز میں پختگی پیدا کرے، اور اس پر وہ تھوڑی سی قربانی دے دے، یعنی کچھ تکلیف اٹھا کر اور اپنی صحت کو خطرے میں ڈال کر اور دنیا سے آنکھیں بند کر کے، ہر انعام، ہر تعریف، ہر اعتراف سے بالکل مستغنی ہو کر اپنے ذوق سے اندرونی جذبہ سے اگر کام میں لگ جائے تو اس کو پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں، تو مولانا محمد ناظم صاحب یہاں سے پاکستان گئے تو بہت بڑے دینی وعلمی مرکز جامعہ عباسیہ میں وائس چانسلر بن گئے اور کسی نے نہیں پوچھا کہ آپ مصر میں کتنے دن رہے؟ آپ نے ازہر میں پڑھا ہے یا نہیں؟ آپ نے کسی عرب جامعہ سے سند حاصل کی؟ آپ نے وہاں کتنے دن ٹریننگ حاصل کی؟ کسی نے نہیں پوچھا، اصل چیز یہ ہے کہ آدمی سبق کیسا پڑھاتا ہے؟ کتاب کیسی سمجھتا ہے؟ اپنے مطلب کو تحریری، تقریری طریقہ پر کتنی قدرت کے ساتھ، کتنی کامیابی کے ساتھ ادا کرتا ہے؟ اور طلبہ کو اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اسی کو سرمایہ، پونجی سمجھ لو، ہم تین [1] تمہارے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، میں بے شک گیا اور اپنے ان ساتھیوں کے مقابلہ میں زیادہ گیا، لیکن الحمد للہ گیا تو وہاں داعی کی حیثیت سے گیا، وہاں ایک مصنف کی حیثیت سے گیا، ہر موضوع پر گفتگو کرنے کی

(۱) یعنی خود حضرت مولاناؒ، مولانا محمد ناظم صاحب ندویؒ اور مولانا عمران خان صاحب ندویؒ

پوزیشن میں، اور ڈاکٹر احمد امین سے میری جو باتیں ہوئیں وہ آپ مذكرات سائح في الشرق العربي میں پڑھیں، تو ایک اتنا جونیر آدمی جن کی ساری عمر گویا عجمی نژاد ہے، ہندوستان میں اس نے پڑھا ہے، وہ نابغۂ شرق عربی سے ملا ہے، آپ دیکھیں کہ ان کا جو مقام تھا وہ تھا، لیکن اگر میں ان سے دو سوال کرتا تھا تو ایک سوال وہ مجھ سے بھی کرتے تھے، کچھ چیزیں ایسی تھیں جو وہ مجھ سے پوچھتے تھے، اور بہت زیادہ چیزیں ایسی تھیں جن میں مَیں ان سے استفادہ کرتا تھا، لیکن ایسا نہیں تھا جیسے کوئی شاگرد رشید یا کوئی کوہ قزم کسی عملاق کے پاس چلا جائے، یہ صورت نہیں تھی۔

اپنی درسگاہ پر فخر

یہ کس بات کا نتیجہ تھا؟ یہ یہاں کی تعلیم کا نتیجہ تھا جو خود اعتمادی پیدا کرتی تھی، ہمارے دار العلوم میں اور کچھ ہو نہ ہو لیکن اس زمانہ میں الحمد للہ دار العلوم میں ایک بہت بڑی چیز تھی، جو ذرا کم ہو رہی ہے اور اس کی حفاظت کی ضرورت ہے، وہ ہے اپنی درس گاہ پر فخر، اپنے اساتذہ پر، اپنے اسلاف پر فخر، وہ فخر نہیں جس میں دوسروں کی حق تلفی ہو، عصبیت ہو، بلکہ یہ کہ ان کا ایک مقام تھا، انھوں نے جو فکر دیا ہے، وہ فکر بہت آگے کا ہے، اب بھی بہت سے ممالک وہاں تک نہیں پہنچتے، یا جس کو انگریزی میں سنس آف پرائڈ (Sense of Pride) کہتے ہیں، یعنی اپنی درسگاہ پر ناز، یہ بات تھی اور میں الحمد للہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے علاوہ بھی گھر کی صحبت نصیب فرمائی، اور خاص طور پر میرے بڑے بھائی صاحب مرحوم ان کی صحبت میں بیٹھ کر ایسا ذہن بن گیا تھا کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے آنکھ جھکتی نہیں تھی، اس لیے کہ وہ جدید تعلیم کے بھی اعلیٰ نمونہ تھے، اور قدیم تعلیم میں بھی بہت راسخ، یعنی یہ سمجھئے کہ میں نے ان سے عربی بھی پڑھی ہے، میں نے ان سے مجموعة النظم و النثر کا بھی کچھ حصہ پڑھا ہے، میں نے دیکھا کہ ان کی صرف ونحو کی استعداد اتنی پختہ تھی اور عربیت ان کی اتنی اچھی تھی کہ میں نے کم آدمیوں کی دیکھی ہے، اور اطمینان سے وہ مجھے ادب کی چیزیں پڑھاتے تھے، اور اخبار دیکھنا تو میں نے انھیں سے سیکھا، میں اس وقت خلیل عرب صاحب سے نهج البلاغة اور مقامات حریری وغیرہ پڑھ چکا تھا، اور میں نے جو عربی

اخبارات دیکھنا شروع کیے تو معلوم ہوئے کسی دوسری زبان میں ہیں، اس لیے کہ اس میں جو تعبیرات تھیں، وہ بالکل میرے لیے نامانوس تھیں، تو بھائی صاحب سے میں سمجھتا تھا کہ اس کا کیا مطلب، تو میں نے اخبار بھی پڑھنا انھیں سے سیکھا، پھر میں نے انگریزی بھی ان سے پڑھی، تو ہر چیز میں ان کی استعداد تھی، ان کا مزاج ہی یہی تھا کہ جو چیز تھی پختہ تھی، اور اس پر اتنا اطمینان تھا خاص طور پر اسلام پر، اسلام تو ایک بہت وسیع چیز ہے، شریعت اسلامی اور اسلامی تہذیب اور اسلاف پر اتنا اعتماد تھا کہ میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے اسلاف کو، امت کے اسلاف کو جو چیز عطا فرمائی، جو گہرائی اور جو پختگی اور جو بصیرت ہے، وہ دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے، اور پھر جس طرح وہ مغربی افکار پر تبصرہ کرتے تھے اور مغربی تہذیب پر متوازن اور گہری رائے دیتے تھے، اس کی وجہ سے میرے اندر وہ مرعوبیت ختم ہوگئی اور بڑے سے بڑے آدمی کے پاس جا کر میں مرعوب نہیں ہوا، یعنی مصر کے چوٹی کے لوگوں سے ملا ہوں کہ جن کی تحریریں یہاں پڑھتا تھا اور جھومتا تھا، ان سے ملا ہوں۔

نہ کوئی جامعہ کسی کو ادیب بناتا ہے اور نہ کوئی ماحول

جہاں تک عربی زبان وادب کا تعلق ہے، اسی تعلق سے کہتا ہوں کہ سب دھوکہ ہے، نہ کوئی جامعہ کسی کو ادیب بناتا ہے اور نہ کوئی ماحول بناتا ہے، اور نہ کہیں کسی عرب ملک میں جانے سے عربی، یا کسی یورپین ملک میں جانے سے انگریزی آتی ہے، میں نے قاہرہ میں ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو بارہ بارہ، چودہ چودہ، سولہ سولہ برس سے تھے اور ان کی اس وقت تک عربی صحیح نہیں تھی، پتہ لکھتے تھے تو اس میں نحوی غلطی کرتے تھے، بعض فضلاء گئے اور وہاں پڑھنا شروع کیا اور وہ وہاں سے جب پتہ لکھتے تو اس میں مَیں دو تین غلطیاں پکڑ لیتا تھا، مضاف مضاف الیہ اور صفت موصوف کی غلطیاں ہوتی تھیں اور باقی جو لوگ وہاں تھے وہ عامی جیسی بولتے ہوں لیکن ان کو عربی نہیں آتی، تو وہ جو پرانا شعر ہے ذرا سا بے ادبی کہ

خر عیسی اگر بمکہ رود
چوں بہ آید ہنوز خر باشد

سب اپنی محنت اپنی کمائی سے ہوتا ہے

تو یہ کہیں بھی جانے سے کچھ نہیں ہوتا، سب اپنی کمائی، سب اپنی محنت سے ہوتا ہے، ہم دو تمہارے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ جتنی دیر تک میں بولا ہوں اس کو کسی نتیجہ پر ختم کروں، اور یہی قیمت ہے اصل میں اس تقریب کی، اگر تم نے یہ بات سیکھ لی، اس وقت مولانا ناظم صاحب کی آمد اس کے لیے اور یہ تقریب اس کے لیے ایک اچھا محرک بن گئی ہے، اگر یہ بات تم نے سمجھ لی کہ سب اپنی کمائی ہے، اپنی محنت ہے، نہ عرب جانے سے کچھ ہوتا ہے نہ عجم جانے سے کچھ ہوتا ہے، اگر تمہارے اندر ذوق پیدا ہو گیا تو پھر تم وہاں جاؤ تو فائدہ ہوگا، میں اس فائدہ کا انکار نہیں کرتا، لیکن یہ ذوق پیدا ہو جانے کے بعد، یہ تنقیدی نگاہ پیدا ہو جانے کے بعد اگر جاؤ گے تو پچاس گنا زیادہ فائدہ ہوگا، مگر عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لوگ اس دور میں جاتے ہیں جب وہ لوگوں کو تول نہیں سکتے، جانتے نہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے، کس میں کیا کمزوریاں ہیں، میں جب مصر گیا تو میں طہٰ حسین کو خوب جانتا تھا، طہٰ حسین کی کمزوریوں کو بھی جانتا تھا، احمد امین کو پڑھ چکا تھا، ہم لوگ سب بیٹھتے تھے مولانا مسعود عالم صاحب، مولانا ناظم صاحب ہم لوگ بے تکلف گفتگو کرتے تھے، تبصرے کرتے تھے، کتابیں آتی تھیں ان پر تبصرہ لکھتے تھے، اور وہ ہماری مجلسوں کا موضوع بنتی تھیں، جب میں یہاں سے گیا تو مجھے کوئی نئی چیز معلوم ہی نہیں ہوئی، میں اگر یہ کہوں کہ مصر میں جا کر مجھے نئی چیز نہیں ملی، صورتیں نئی تھیں، لیکن سب جانی پہچانی اور سب کے متعلق ہمارے ذہن میں

لِكُلِّ امْرِىءٍ شِعْبٌ مِّنَ الْقَلْبِ فَارِغٌ

وَ مَوْضِعُ نَجْوَى لَا يُرَامُ اطِّلَاعُهَا

وہ صورت تھی کہ ایک مقام تھا ہر ایک کا، یہ نہیں کہ کسی کو یہ سمجھ لیا کہ امام وقت ہے۔

'بود حکایت دراز تر گفتم'، یہ بات یاد رکھو میرے عزیزو کہ سب یہیں تم بن سکتے ہو، اور یہاں رہنا بالکل کافی ہے، حافظہ پر زور ڈال کر کہو، بتاؤ کہ باہر جانے والوں میں سے کتنے آدمی ایسے ہیں جن کی کتابیں عالم عربی میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، جن کو عالم

عربی نے مانا ہو؟ اور میں بتادوں دس نام کہ جنھوں نے جو کچھ سیکھا پڑھا یہیں اور خدا کے فضل سے علمائے عرب، ادبائے عرب بھی ان کی کتابیں پڑھتے ہیں، اور اعتراف کرتے ہیں، بس یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سب اپنی محنت اپنا کرنا اپنا بھرنا ہے، و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین۔ (۱)

(۱) ۱۹۸۱ء میں مولانا محمد ناظم ندوی صاحب سابق وائس چانسلر جامعہ عباسیہ (بہاولپور) کی ندوہ آمد پر ان کے استقبال میں منعقد ایک جلسہ میں ان کے تعارف و خیر مقدم کے طور پر کی گئی تقریر سے ماخوذ، ماخوذ از { تعمیر حیات } لکھنؤ، (شمارہ ۱۰ / اگست ۱۹۸۱ء)۔

فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے......

فیصلہ کن دن

میرے عزیزو! آپ لوگ یہاں پر اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ آپ کے اندر اس بات کا احساس وشعور پیدا ہو کہ آپ یہاں کیوں آئے؟ اور تعلیمی سال کے شروع ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اور آپ کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اور یہاں کے قیام میں کیا فوائد ہیں؟ بعض وقت اگر خیال نہ کیا جائے اور آنے کے مقصد پر توجہ نہ دی جائے تو کیا خطرات ہیں اور کیا نقصانات ہیں؟ اس لحاظ سے یہ دن آپ کی زندگی کا بہت اہم دن ہے، ہم آپ سامنے کی چیز تو دیکھ سکتے ہیں لیکن دور کی نہیں، لیکن اگر اللہ تعالیٰ بصارت کی نہیں بصیرت کی آنکھ کھول دیں تو آپ دور کی چیزیں بھی دیکھ سکتے ہیں، کاتب تقدیر اعمال نامہ لیے کھڑے ہیں اور انتظار میں ہیں، آپ کے چہرے پر ان کی نظر نہیں ہے بلکہ آپ کے دلوں پر اور دلوں کے ارادہ پر ان کی نظر ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بھی ایسی نظر دیتا ہے جس سے وہ اندر کی چیزیں دیکھ سکتے ہیں، کاتب تقدیر آپ کے دلوں کو پڑھ رہے ہیں، آپ کے دماغ کی سلوٹوں کو دیکھ رہے ہیں، اور انتظار میں ہیں کہ وہ دیکھیں کہ آپ کے اندر کیا ارادہ اور کیا عزم پیدا ہوا اور اس کو نوشتۂ تقدیر میں لکھیں، گویا یہ آپ کی زندگی کا بہت اہم اور نازک دن ہے، فیصلہ کن دن ہے، اور ایک طرح سے گویا آپ کی معنوی پیدائش کا دن ہے، انسان کی پیدائش طبعی طور پر ایک دفعہ ہوتی ہے، لیکن اس کے بعد پیدائش کا سلسلہ جاری رہتا ہے، پیدا ہونے کے بعد بھی لوگ مرجاتے ہیں، اور پھر زندہ ہوتے ہیں، پھر مرتے ہیں پھر زندہ ہوتے ہیں، اور یہ سلسلہ

بعض اوقات انسان کی اس دنیا سے جدائی کے وقت تک جاری رہتا ہے جسے ہم موت کہتے ہیں ﴿أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَهُ، وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَّمْشِيْ بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا﴾ (۱)۔

سارا انحصار تمہارے فیصلہ پر ہے

میرے عزیزو! معلوم نہیں اس وقت کتنے لوگوں کی نئی عمریں شروع ہو رہی ہیں، آپ میں سے بہت بڑی تعداد تو نئی ہوگی، پرانے طالب علم کم آئے ہیں، لیکن ایک تعداد ان طلبہ کی ہوگی جو دو سال، تین سال، چار سال اور بعض چھ چھ، سات سات سال سے پڑھ رہے ہیں، لیکن بڑی تعداد غالباً ان کی ہے جو اسی سال آئے ہیں اور ابھی کسی کو آئے دو دن ہوئے ہیں، کسی کو چار دن ہوئے ہیں، زیادہ تر وہی میرے مخاطب ہیں کہ تمہاری عمر اب شروع ہو رہی ہے اور کاتب تقدیر تمہارے متعلق لکھنے والا ہے، اور تمہارے فیصلہ کا منتظر ہے، تمہاری قسمت کو دیکھ رہا ہے کہ تم نے اپنے بارے میں اگر صحیح فیصلہ کر لیا، اور اللہ نے تمہیں توفیق دی، اور تم کو چاہنے والی ماؤں کی جنھوں نے تم کو رخصت کیا، اور تمہارے والدین کی دعائیں اگر اللہ کے یہاں قبول ہو گئیں، اگر تمہارے بزرگوں کے نیک اعمال جو کبھی انھوں نے کیے تھے، ان میں کسی نے بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کو کھینچ لیا تو پھر تمہاری صحیح عمر آج سے شروع ہو رہی ہے اور تم اس وقت گویا دنیا میں قدم رکھ رہے ہو، نئی زندگی میں قدم رکھ رہے ہو اور یہ بہت کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔

میں کہتا ہوں ساری دنیا کی سلطنتیں، ساری دنیا کے ادارے، ساری دنیا کے دانشور، تمہارے سارے خیر خواہ، تم پر جان چھڑکنے والے اگر یہ چاہیں کہ تم کام کے آدمی بن جاؤ، تم پڑھ لکھ کر آدمی بن جاؤ، عالم بن جاؤ، اور تم نہ چاہو تو وہ سب ناکام رہیں گے، اور اگر تم چاہو کہ تم کام کے آدمی بنو اور تم یہاں سے کچھ سیکھ کر نکلو، تم اپنے بھی کام آؤ اور دوسروں کے بھی کام آؤ، اور اللہ کے دین کے بھی کام آؤ، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت تمہیں اس سے روک نہیں سکتی اور تمہارے لیے کوئی کمی نہیں، یہ پورا کارخانۂ قدرت جو اللہ نے بنایا ہے، پورا عالم، ساری کائنات تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہے، ہوا، پانی اور ہوا میں اڑنے والے پرندے

(۱) سورۃ الأنعام: ۱۲۲

اور پانی میں تیرنے والی مچھلیاں سب تمہارے لیے دعائیں کریں گی اور حدیث میں آتا ہے، یہ کوئی قیاسی بات نہیں ہے کہ طالب علم کے لیے، مُعَلِّمُ النَّاسِ الْخَیْرَ کے لیے جو لوگوں کو علم کی تعلیم دیتا ہے، نیک بات کی، حق بات کی تعلیم دیتا ہے، مچھلیاں پانی میں اور چڑیاں اپنے گھونسلوں میں دعا کرتی ہیں، اور فرشتے پر بچھاتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم حاصل کرنے کے لیے راستہ طے کرتے ہیں اور گھر سے نکلتے ہیں، تو سارا انحصار تمہارے فیصلہ پر ہے۔

اور دیکھو میں تمہیں بتا دیتا ہوں اور اس سے پہلے بھی کہا ہے کہ مدرسہ میں سارے انتظامات ہیں اور نگرانی بھی ہے، اور عہدہ دار بھی ہیں، اور درجے بھی اپنے اپنے وقت پر شروع ہوتے ہیں، اپنے وقت پر ختم ہوتے ہیں، لائق اساتذہ بھی ہیں، شفیق اساتذہ بھی ہیں، لیکن تم اگر ان کو ناکام بنانا چاہو، مدرسہ کو ناکام بنانا چاہو تو بہت آسانی کے ساتھ بنا سکتے ہو اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی، کوئی کچھ نہیں کر سکے گا، تم سب کو ناکام بنا سکتے ہو اور سب کو ہرا سکتے ہو، ہم سب ہارے تم جیتے، اگر تم فیصلہ کر لو کہ ہم مدرسہ میں نہ پڑھیں، نہ لکھیں، نہ کام کریں، اور ہم پورا سال گزار دیں تو تم کامیاب رہو گے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم پاس بھی ہو جاؤ، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امتیازی نمبروں سے پاس ہو، مگر تمہارے پلے کچھ نہیں پڑے گا، ایسے ایسے ہم نے اللہ کے شیر دیکھے ہیں اپنے زمانہ میں بھی اور ہر زمانہ میں کہ انھوں نے پڑھ کر نہیں دیا، استادوں اور ان کے والدین نے ان کے سامنے سر کاٹ کر رکھ دیا، اور سب سمجھتے رہے کہ یہ پڑھ رہے ہیں لیکن دامن جھٹک کر وہ یہاں سے ایسے گئے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے چڑیا سمندر میں چونچ ڈالتی ہے اور اس کی چکنی چونچ میں پانی کا قطرہ بھی نہیں ٹھہرتا، ایسے ان پر گویا چھینٹ بھی نہیں پڑی، علم کی چھینٹ بھی نہیں پڑی اور دامن بھی ان کا تر نہیں ہوا، کہنے والے نے کہا ہی تھا کہ ''بازی گوئی کہ دامن تر مکن'' ایسے یہ بعض لوگ ہیں کہ دریا عبور کر جائیں اور دامن تر نہ ہو۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے، اور ایک طریقہ یہ ہے کہ ساری رکاوٹیں ہیں لیکن اندر کا فیصلہ یہ ہے کہ ہم کو علم حاصل کرنا ہے، کام کا آدمی بننا ہے، ہم اپنے لیے بھی، اپنے خاندان کے لیے بھی، اور اپنی ملت کے لیے بھی، اور خلق خدا کے لیے ہم کو ایک کارآمد آدمی بننا ہے، کچھ سیکھ کر

کے جانا ہے، اپنی نجات کا بھی انتظام کرنا ہے، اور اگر اللہ توفیق دے تو دوسروں کی کشتی بھی پار کرنی ہے، کنارے لے جانی ہے، کتنے ایسے آدمی تھے کہ پڑھتے تھے، کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تھا، جب بالکل ان کی جان پر بن آتی تھی اور غشی کھانے کے قریب ہو جاتے تھے تو کسی نان بائی کی دکان پر جا کر کھڑے ہو جاتے تھے، ذرا فاصلہ پر تاکہ یہ نہ معلوم ہو کہ بھیک مانگتے ہیں، اور خوشبو جو اُن کی ناک میں آتی تھی، گرم گرم روٹیوں کی جو تنور سے نکلتی تھیں، یا توے پر چڑھی ہوتی تھیں، اس سے تقویت ان کی روح کو حاصل ہوتی تھی، اور کتنے ایسے واقعات ہیں کہ جو عقل میں آنے والے نہیں ہیں لیکن واقعات ہیں، اور ہر زمانہ میں ایسی نظیریں رہی ہیں۔

میرے عزیزو! اس وقت آپ کو دو فیصلوں میں سے ایک کرنا ہے اور اسی فیصلہ پر سارا انحصار ہے، یہ کہ آپ کو پڑھنا ہے، وقت کو کارآمد بنانا ہے، اور یہاں آنے کو وصول کرنا ہے، اور یہاں سے کام کا آدمی بن کر کے جانا ہے، تب تو پھر ذرہ ذرہ اور چپہ چپہ، تنکا تنکا آپ کی مدد کے لیے دعا کرنے کے لیے تیار ہے، اور سارے انتظامات اسی لیے ہیں، اور پھر کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کھانا خراب ملے، خدانخواستہ صحت خراب ہو، آپ کو کچھ تکلیف ہو، کوئی بیماری ہو، کوئی چیز بھی آپ کا راستہ روک نہیں سکتی، اور پھر آپ اللہ تعالیٰ کی مدد دیکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و رحمت کا دروازہ کھل جائے گا، مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَر، بالکل جنت کی صفت بیان کی گئی ہے، دنیا میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جنت کے مزے چکھا دیتا ہے اور جنت کے مزے ان کو اسی دنیا میں آنے لگتے ہیں کہ عالم کو مسخر کر دیتا ہے ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ (۱) اپنے تمام بندوں کے دل میں ان کی محبت پیدا کر دیتا ہے، گویا کائنات مسخر ہو جاتی ہے، لیکن آپ نے اگر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں یہاں محنت کرنی ہے، اور ہمیں یہاں آنے کو وصول کرنا ہے، اپنے والدین کو مایوس نہیں کرنا ہے، اپنے بزرگوں اور سرپرستوں کا دل نہیں دکھانا ہے، اپنے استادوں اور یہاں کے منتظمین کو دھوکہ نہیں دینا ہے، اپنے نفس کو دھوکہ نہیں دینا ہے، ہمیں کچھ کرنا ہے، تو پھر میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ تم سے بڑھ کر خوش نصیب، اقبال مند

(۱) سورۃ مریم: ۹٦

کوئی نہیں، تم دنیا کے فاتح ہو، تمہارے لیے یہ عالم مسخر ہے، اور کوئی بڑی سے بڑی دنیا کی مادی طاقت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کا فیصلہ فرمالیا اور تمہیں قبول کرلیا، اور تم قبول ہو گئے، پھر تمہیں کوئی دربار سے نکال نہیں سکتا۔

اور اگر تم نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ہمیں محنت کرنا ہے، وقت کو ٹھکانے لگانا ہے، اس سے فائدہ اٹھانا ہے، اور تھوڑا جبر کر کے اور دل مار کر کے کچھ محنت کرنی ہے، تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا، اور علوم کے جتنے بانی ہیں، امام رازی، امام غزالی اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ دہلوی ایسے حضرات بھی دنیا میں دوبارہ زندہ ہوکر یہاں آجائیں اور تمہیں پڑھانے کے لیے بیٹھ جائیں تو وہ بھی تمہارے پڑھانے میں کامیاب نہیں ہوسکتے، اور تم ان سے بھی ایسے ہی بے فیضِ اٹھو گے جیسے کسی معمولی سے معمولی شخص کے پاس سے۔

تھوڑے دن کی محنت عمر بھر کا آرام یا تھوڑے دن کا آرام عمر بھر کی شرمندگی؟

عزیزو! یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ وقت گزاریں اور کچھ نہ حاصل کریں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے آپ وقت گزاریں اور سب کچھ حاصل کرلیں، اور یہ بھی ہے کہ آپ تھوڑی تکلیف اٹھالیں، دل ماریں، اور دل اور آنکھوں پر پتھر رکھ لیں، پھر اس کے بعد آرام ہی آرام ہے، عمر بھر آرام ہے، پھر اس کے بعد ہر بات میں آپ کی جیت، ہر بات میں آپ کی فتح، کوئی مشکل مشکل ہی نہیں۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ آپ دل نہ مار سکیں، محنت نہ کریں، اس کے بعد قدم قدم پر مشکل، یہاں تو آرام کرلیں لیکن عمر بھر ہر جگہ آپ کو شرمندہ ہونا پڑے گا، ہر جگہ آپ کو منہ چھپانا پڑے گا، ہر جگہ آپ چاہیں گے کہ کوئی آپ کا نام نہ لے، کوئی آپ کو آواز نہ دے، آپ کی طرف کوئی دیکھے نہیں، کسی کو پتہ نہ چلنے پائے کہ آپ بھی مجلس میں ہیں، آپ کو یہ نہ کہے کہ مسئلہ بتا دیجیے، آپ کو کوئی یہ نہ کہے کہ کتاب پڑھ کر سنا دیجیے، اس عربی عبارت کا مطلب

بتا دیجیے، ہر جگہ چور کی طرح آپ اپنا منہ چھپانے کی کوشش کریں گے، اور ہر جگہ معلوم ہوگا کہ آپ نے کوئی قصور کیا ہے، ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ تھوڑے دن آرام کرلیا اور پھر عمر بھر آنکھیں ملانے کے قابل نہیں رہے، کسی بڑے آدمی سے آنکھیں نہیں ملا سکتے، کسی بڑی مجلس میں بیٹھنے کی ان کو تاب نہیں، ہر جگہ چھپتے پھرتے ہیں کہیں ان کی قلعی نہ کھل جائے۔

اور جن لوگوں نے محنت کرلی ان کا حال یہ ہے کہ شیر ہوگئے، کہیں بھی بڑی سے بڑی مجلس بادشاہوں کی مجلس ہو، بڑے سے بڑے چوٹی کے عالموں کی مجلس ہو، علمی مذاکرہ ہو، بحث و مناظرہ ہو، کوئی تہذیبی مجلس ہو، کوئی علمی مجلس ہو، کہیں بھی ان کی آنکھیں نہیں جھپکتیں اور ان کو شرمانے کی یا منہ چھپانے کی ضرورت نہیں، خود انتخاب کرو کہ یہ اچھا ہے کہ وہ اچھا؟ تھوڑے دن کی محنت عمر بھر کا آرام یا تھوڑے دن کا آرام عمر بھر کی شرمندگی؟

بدترین نفاق

میرے عزیزو! ابھی تعلیمی سال شروع ہوا ہے، اس میں ایک تو دھوکہ دینے کا، اپنے نفس کے ساتھ نفاق کرنے کا معاملہ ہے، اور بدترین منافق وہ ہے جو اپنے نفس کے لیے نفاق کرتا ہے، اپنے نفس کا بھی وہ مخلص نہیں ہوتا، اپنے نفس کے لیے سچ نہیں بولتا، یہ بدترین نفاق ہے، اگر نفاق سے آپ کو نفرت ہو اور عہد کریں کہ نفاق اپنے نفس کے ساتھ نہیں کریں گے، ہم واقعی محنت کریں گے، واقعی ہم وقت سے فائدہ اٹھائیں گے، تو پھر آپ کی زندگی کی کامیابی کے لیے، آپ کی محنت کی مقبولیت کے لیے، دین کے لیے، ملت کے لیے، دنیا کے لیے آپ کے مفید اور نافع بننے کی ضمانت ہے، قرآن میں ضمانت ہے، حدیث میں ضمانت ہے، آپ اپنے ساتھ انصاف کیجیے، اپنے خیر خواہ بن جایئے، آپ کو اپنے نفس کے ساتھ محبت ہونی چاہیے کہ ہم کچھ کام کے آدمی بن جائیں، ہمارا وقت کارآمد ہو، محنت کرلیں اور تھوڑے سے جو یہاں قوانین وضوابط ہیں، ان کی پابندی کرلیں، جن سے ہمارے نظامِ صحت میں کوئی بہت بڑا اختلاف، کوئی بہت بڑی تبدیلی نہیں پیدا ہوگی کہ ہمارا نظامِ صحت درہم برہم ہوجائے اور بیمار پڑ جائیں۔

بس سیدھی سی بات یہ ہے کہ ہم اپنے وقت کو ضائع نہیں کریں گے، ہم یہاں کے ضوابط کی پابندی کریں گے، ہم یہاں کے ماحول سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے، اور میں کہا کرتا ہوں کہ اس دور میں بھی جس کو انقلابی عہد کہا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ بہت پرفتن دور ہے اور اس میں علم اور دین کی قیمت نہیں، ہر دور میں یہ شکوہ رہا ہے کہ یہ بڑا خراب زمانہ ہے، گلٹیگ ہے اور اس میں اصل علم کی قدر نہیں، لیکن بزرگوں نے دکھادیا، ثبوت دے دیا کہ زمانہ کس طرح سر جھکاتا ہے، کس طرح سجدہ ریز ہوتا ہے، بڑی بڑی سلطنتیں کس طرح سر خم کردیتی ہیں، اور اپنے خزانے اور اپنے سر قدموں میں ڈال دیتی ہیں، اور ڈال دینے کے لیے تیار ہوتی ہیں، انھوں نے ثابت کردیا کہ آج بھی دنیا ہماری محتاج ہے، اور آج بھی ہماری خوشامد کرنے کے لیے سرکاریں و سلطنتیں تیار ہیں۔

اپنی نیت درست کر لیجیے!

اللہ تعالیٰ کے ساتھ جہاں تک معاملہ کا تعلق ہے آپ کا معاملہ خدا کے ساتھ صحیح ہوجائے، میں جب پڑھایا کرتا تھا تو اس زمانے میں اس کا عملی تجربہ ہوا، میں طالب علموں سے باتیں کرنے کا عادی تھا، سوالات کرتا تھا، خیالات معلوم کرتا تھا، مانوس کرتا تھا، حالات دریافت کرتا تھا، ایک مرتبہ میں نے درجہ میں پوچھا کہ بتاؤ تم کس لیے پڑھ رہے ہو؟ تمہاری کیا نیت ہے؟ ان میں سے کئی طالب علموں نے جو بیچارے سیدھے تھے، کہا: سچ کہتے ہیں، مولانا! ہم نے اس کے متعلق اب تک سوچا ہی نہیں، آج پہلی مرتبہ ہمارے سامنے یہ سوال آیا، ہمارے ذہن میں یہ تھا بھی نہیں کہ یہ سوچنے کی بات ہے، ماں باپ نے بھیجا چلے آئے، پڑھ رہے ہیں، کوئی برا کام تو نہیں ہے، صحیح کام کررہے ہیں، ہم سوچتے ہی نہیں کہ ہم کیوں پڑھ رہے ہیں اور پڑھنے سے کیا فائدہ ہے؟ اور پڑھ کر ہم کیا کرنا چاہتے ہیں؟ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے غور ہی نہیں کیا۔ تو ہمیں جو ڈر ہے اپنے عزیزوں سے، اپنے بھائیوں سے کہ کہیں اتنی بڑی تعداد میں ایسے لوگ نہ ہوں، ایسے بھائی نہ ہوں جنھوں نے سرے سے سوچا ہی نہ ہو کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنی نیت درست کرلیجیے، یہیں بیٹھے بیٹھے نیت کرلیجیے، نیت کرنے کے لیے کوئی زبان سے کہنے کی ضرورت نہیں، اپنے دل کو چند سیکنڈ کے لیے متوجہ کیجیے اپنی طبیعت کو، اور دل سے یہ کہیے کہ اے اللہ! ہم یہاں تیری رضا حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں، تیرا علم دین سیکھنے کے لیے آئے ہیں تاکہ تیرے احکام ہم کو معلوم ہوجائیں، تیری شریعت کا علم حاصل ہوجائے، قرآن مجید سمجھنے کے قابل ہوجائیں، حدیث شریف سمجھنے کے قابل ہوجائیں، مسئلے مسائل بتانے کے قابل ہوجائیں، کتابیں سمجھنے کے قابل ہوجائیں، اور ہم اس ذریعہ سے اپنی نجات کا سامان فراہم کریں، ہمیں معلوم ہو کہ خدا کے عذاب سے کس طرح بچ سکتے ہیں اور کس طرح جنت کا استحقاق اور تیری خوشنودی حاصل کرتے ہیں؟

دوسرے اس کے ساتھ یہ فیصلہ کرلیں کہ ہمیں یہاں شریف آدمیوں کی طرح، شریف بچوں کی طرح، شریف گھرانوں کے نونہالوں کی طرح، شریف لوگوں کی طرح رہنا ہے، یہاں کام کا آدمی بننے کے لیے آئے ہیں، پڑھنے کے لیے آئے ہیں، کچھ سیکھنے کے لیے آئے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کو پہچاننے کے لیے، ان کی صحیح معرفت حاصل کرنے کے لیے، ان سے فیض حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں، پھر دیکھو اللہ تعالیٰ تمہاری کتنی مدد فرماتا ہے، اور قدم قدم پر تمہاری کس طرح سے مدد ہوتی ہے، اور پھر تم یہاں سے بن کر نکلو گے۔

زمانہ کے انقلاب کا شکوہ پست ہمتی اور حیلہ بازی ہے

میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ہوں، اور بھی لوگ ہیں، الحمد للہ مجھے زمانہ کے انقلاب کا قطعاً کوئی شکوہ نہیں، زمانہ کا انقلاب کوئی چیز نہیں، یہ پست ہمتوں کی اور حیلہ بازوں کی باتیں ہیں، اللہ خالق ہے اور ابدی ہے، اس کی صفات بھی ابدی ہیں، قدیم ہیں، اور ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی، تو اللہ تعالیٰ جب رازق ہے تو ہمیشہ سے رازق ہے، ہمیشہ رازق رہے گا، جب وہ اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے اور اس کا بنانے والا ہے ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ [1] وہ اپنے بندوں کو پہچاننے والا ہے، وہ اپنی مخلوقات کو نہ پہچانتا ہوگا؟

---

(۱) سورۃ الملک: ۱۴

اور اس نے رزق کا ذمہ لیا ہے، وہ اپنے کو 'شکور' کہتا ہے، وہ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا اور پہچانتا ہے، اس کی قدر کرتا ہے، اس کی پرورش فرماتا ہے، اس کو انعام عطا فرماتا ہے، خوشی کا اظہار کرتا ہے، تو پھر اب کس بات کا ڈر ہے؟

اور یہ سب نہ کرنے کی باتیں ہیں، ساری کمزوری ہمارے اندر ہے باہر نہیں، انسان کے اندر یہ کمزوری ہے کہ اس کے اندر کوئی چیز ہوتی ہے اور باہر کچھ اور، انسان اپنے کو ذلیل سمجھتا ہے، تمام دنیا سے اس کو شکوہ ہوتا ہے کہ سب اس کو ذلیل سمجھتے ہیں، حالانکہ کوئی اس کو ذلیل نہیں سمجھتا، اگر انسان اپنی عزت کرنا سیکھ لے اور انسان قابل عزت ہو تو اس کو کوئی بھی ذلیل نہیں سمجھ سکتا اور کسی سے اس کو شکایت کا موقع نہیں آئے گا، کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب علم دین کی قدر نہ ہوئی ہو، آج بھی اس زمانے میں علم دین کی وہ قدر ہے جو دنیا میں کسی کی نہیں ہے، اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے واقعی علم دین دیا ہے، ان کا تو عالم یہ ہے کہ بادشاہوں کو خاطر میں نہیں لاتے، بادشاہوں کو آنکھیں ملانے کا موقع نہیں دیتے۔

تم کس دین، کس علم کو حاصل کرنے کے لیے آئے ہو، تمہیں خبر ہے؟ تمہیں اگر خبر ہو جائے، واللہ العظیم، تو تم تاب نہیں لا سکتے، اگر تمہیں معلوم ہو کہ تمہیں کیا مرتبہ ملنے والا ہے، تھوڑی سی محنت کر لو گے تمہیں کیا نصیب ہوگا، تم کیا چیز بن جاؤ گے کہ زمین پر تمہارے پاؤں نہ پڑیں گے، تم میں کیا، اچھے اچھے عالی ظرفوں میں یہ ظرف نہیں ہے کہ اس کو برداشت کر سکے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو غیب میں رکھا ہے، اس کو غیب میں رہنے دو، غیب کے سو سو پردوں میں رہنے دو، لیکن جب وقت آئے گا جبھی دیکھو گے ؎

برخود نظر کشاز تہی دامنی مرنج
در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

ہمت اور محنت کریں!

عزیزو! ہمت کرو، اسی وقت فیصلہ ہونا ہے کہ تم کیا ہو، یا تو سارے اسباب تمہارے لیے میسر نہیں، کسی بات کا شکوہ نہیں، نہ روزی کا شکوہ، نہ عزت کا شکوہ، نہ مسرت کا شکوہ، نہ کامیابی کا شکوہ، تمہارے لیے سب کی ضمانت ہے اگر تم واقعی صاحب کمال بن جاؤ، محنت

کرلو، ذرا سا دل مارلو۔ یہاں کھانا تمہارے گھروں کے برابر نہیں مل سکتا، جو اس دھوکہ میں ہیں وہ اس دھوکہ کو دور کرلیں، تمہیں اپنے گھر کے جیسا آرام نہیں مل سکتا، حالانکہ میں جانتا ہوں، بہت سے لوگوں کو جو بعض مرتبہ نخرے کرتے ہیں، (معاف کرنا)، مدرسوں میں نخرے کرتے ہیں، ان کے گھروں سے کہیں بہتر مدرسوں میں کھانا ملتا ہے، گھروں سے بہتر یہاں ان کے رہنے کی جگہ ہوتی ہے، لیکن انسان کی فطرت یہی ہے، اس کے برعکس کہتا ہوں، صاف صاف کہتا ہوں مدرسے کے ذمہ دار کی حیثیت سے، گھر کا سا کھانا تمہیں نہیں ملے گا، گھر کا سا آرام نہیں ملے گا، گھر کے جیسے حالات یہاں نہیں ملیں گے، سب گوارا کرو، اور اس کے لیے تیار ہو جاؤ کہ تھوڑی محنت کر کے یہاں سے کامیاب ہو کر نکلو گے، بس پھر کامیابی ہی کامیابی، فتح ہی فتح لکھی ہے، پھر تو بس وہی ہے جس کو ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ﴾ (۱) مجھ سے اگر کوئی کہے کہ کیا قرآن مجید میں کہیں عربی مدارس کے علماء اور طلبہ کے متعلق کوئی ضمانت ہے اور کوئی پیشین گوئی کی گئی ہے؟ تو میں کہوں گا سورہ الم سجدہ میں ہے: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ﴾ یہ قرآن مجید میں ہے اور ایک پیغمبر کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے کہلوایا ہے یوسفؑ سے کہا گیا: ﴿أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ، قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَذَا أَخِي قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا﴾ یہاں پر یوسف علیہ السلام نے صاف کہہ دیا اور سورہ یوسفؑ کے قصہ میں آتا ہے اور لوگ اسے یوسفؑ ہی کا قصہ سمجھتے ہیں، خصوصیت انہیں کی سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ بالکل کلیہ ہے جیسے میں نے کہا، ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ بس تقوی اور صبر ہے، تب تو ایمان ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا کہ یہ تم جو دیکھ رہے ہو، تم نے مجھے کہاں ڈالا تھا، میں کہاں پہنچ گیا، تم نے مجھے کنویں میں ڈالا اور آج میں مصر کے تخت پر بیٹھا ہوا ہوں، تم آئے ہو میرے پاس ہاتھ پھیلائے ہوئے، یہ کس بات کا نتیجہ ہے؟ ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ ہم ان کو صرف مقتدی نہیں بلکہ حاکم بنادیں گے، موتم اور مقتدی نہیں بلکہ

(۱) سورة السجدة: ٢٤

امام بنادیں گے ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا﴾ صبر کیجیے، جو کھانے کو ملے کھاؤ، جو سرد گرم پیش آئے اسے برداشت کرو، زبان اور عادت کے اختلاف کو انگیز کرو، اور تقویٰ و صبر سے کام لو اور اللہ سے تعلق پیدا کرو تو یقیناً اہل کمال بن جاؤ گے، و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔[1]

(۱) دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں نئے تعلیمی سال کے موقع پر ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۱ء میں کی گئی تقریر، اسے مولانا شاہ ابو دجانہ تسنیم عثمانی ندوی نے قلم بند کیا، ماخوذ از "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ر ستمبر ۱۹۸۱ء)۔

مدارس کا اصل سرمایہ

ذہن کو تیار کرنے کی ضرورت

آپ کا نیا تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے، اور ہمارے وہ عزیز بھی جو رمضان المبارک کی تعطیلات میں گھر گئے تھے اور ابھی ان کی تعلیم کا حصہ باقی ہے، وہ بھی آ گئے ہیں، اور بہت سے عزیز طالب علم نئے داخل ہوئے ہیں، اس لیے مناسب ہے کہ میں ان کا خیر مقدم بھی کروں اور کچھ ان کو مشورے دوں اور ان کو بتاؤں کہ وہ کس طرح اپنی اس آمد کو اور یہاں کے قیام کو زیادہ سے زیادہ کار آمد اور مفید بنا سکتے ہیں۔ بعض مرتبہ بڑے بڑے سفر اور بڑی بڑی مہمات اس وجہ سے پورے طور پر نتیجہ خیز، انقلاب انگیز تو بڑی چیز ہے، مفید نہیں ہوئے کہ ان کے لیے پہلے سے ذہن تیار نہیں تھا، اور اس منزل کی عظمت اور اس سفر کی اہمیت، مقامات اور ماحول کی نزاکت اور اس سے فائدہ اٹھانے کے طریقے معلوم نہیں تھے، عبادات اور ارکان اسلام میں حج ایک ایسا رکن ہے کہ اس کے لیے سب سے زیادہ اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

شعور کے ساتھ کام کرنے کی اہمیت

اہتمام کے لفظ ہی سے مجھے یاد آیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو انسانوں کا خالق ہے، اس نے تقریباً ہر رکن کے لیے، ہر فریضہ کے لیے ایسے انتظامات فرما دیے ہیں اور ایسے خارجی انتظامات اور اس کے راستے کی منزلیں ایسی متعین کر دی ہیں اور کچھ ایسے آداب مقرر کیے ہیں کہ انسان پوری بیدار مغزی کے ساتھ اور پوری تیاری کے ساتھ ان ارکان میں مشغول ہو، اور یہ نفسیات

انسانی بلکہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے، جو کام لا ابالی پن سے اور ذہن بغیر حاضر کیے ہوئے اور بے شعوری کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے اس کے پورے ثمرات حاصل نہیں ہوتے۔

مجھ سے ایک بڑے طبیب اور بڑے تجربہ کار اور نفسیات شناس بزرگ نے فرمایا کہ جو ورزشی کام اور جو ریاضتیں اور محنتیں بغیر ورزش کے ذہن کے کی جاتی ہیں ان کا وہ ثمرہ نہیں نکلتا جو انسانی جسم کی تعمیر اور انسانی جسم کی نشو ونما میں ان ورزشوں سے نکلتا ہے جن کے ساتھ ورزش کا ذہن ہوتا ہے، مثلاً انھوں نے کہا کہ سقوں کو دیکھو جو پانی بھرتے ہیں، کتنی محنت کا کام کرتے ہیں، لیکن ان کے بازو پہلوانوں کی طرح مضبوط نہیں ہوتے اور ان کا نشو ونما اور ارتقاء ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ پہلوان کا ہوتا ہے، اس لیے کہ پانی بھرتے وقت، مشکیں اٹھاتے وقت، لے جاتے وقت ان کا ذہن ورزش کا نہیں ہوتا بلکہ ان کا ذہن بیگار کا ہوتا ہے، یا روزگار کا ہوتا ہے، یہ ایک اچھی چیز ہے، لیکن اس سے ورزش کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

ایسے ہی بہت سے لوگ ہیں، گھاس چھیلنے والے بہت سے مزدور، اسٹیشن کے قلی، یہ سب جتنی محنت کرتے ہیں اگر مجموعی طور پر حساب لگایا جائے تو پہلوان اتنی ورزشیں نہیں کرتے ہیں، اتنے ڈنڈ نہیں پیلتے، اتنی بیٹھکیں نہیں کرتے جتنی لکھنؤ اور لکھنؤ سے بڑھ کر بمبئی اور کلکتہ، ہوڑہ کے اسٹیشن کا قلی کرتا ہے، لیکن آپ نے کسی قلی کو دیکھا کہ وہ گاما کی طرح مضبوط ہو، اس کے اعضاء کی مناسب نشو ونما ہوئی ہو؟ کیا بات ہے؟

حساب لگائیے گا تو میزان ان کی محنتوں کی زیادہ نکلے گی، لیکن چوں کہ ذہن اس طرف متوجہ نہیں ہوتا کہ ہمارا فلاں عضو مضبوط ہو اور اس میں گوشت آئے اور خون کا دوران صحیح طور پر ہو، اسی لیے ورزش کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا، پیسے بھی مل جاتے ہیں اور کھانا بھی ہضم ہو جاتا ہوگا، لیکن ورزش کا جو فائدہ انسانی جسم کی مضبوطی میں اور اس کے سڈول بننے میں اور اس کے اعضاء کے خاص طور پر ترقی کرنے میں ہے، وہ نہیں ہوتا۔

عبادات میں شعور کا اہتمام

اسی لیے تشریع الٰہی نے، آسمانی تشریع نے اور الٰہی حکمتوں نے نماز کے لیے استحضار اور

وضو، اور پھر مسجد کو جاؤ تو یہ خیال کر کے جاؤ کہ تم نماز ہی میں اس وقت سے شامل ہو گے، اور تمہارے یہ قدم جو پڑ رہے ہیں یہ سب عبادت میں شمار ہوں گے، نماز میں شمار ہوں گے، پھر جب مسجد میں قدم رکھو تو درود شریف پڑھو اور اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ پڑھو، پھر وہاں جا کر تحیۃ المسجد پڑھو، پھر سنن راتبہ ادا کرو، اور پھر اس دھیان کے ساتھ بیٹھو کہ نماز کا انتظار کرنے والا بیٹھتا ہے تو وہ نماز ہی میں محسوب ہوتا ہے، اور وہاں کوئی دنیا کی باتیں نہ ہوں ان سب کا مجموعی اثر یہ پڑتا ہے کہ پھر وہ پورا وقت ثواب کے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے اور اس کو وہ روحانی ترقی ہوتی ہے جس کو ہم آپ محسوس نہیں کرتے۔

ہم روحانی ترقی مجاہدات میں اور مراقبات میں اور تصوف میں زیادہ محسوس کرتے ہیں، لیکن مسجد میں صحیح نیت کے ساتھ بیٹھنے والے کو جو ترقی ہوتی ہے، اور جو حضوری اس کو حاصل ہوتی ہے، اور جو قرب خداوندی اس کو حاصل ہوتا ہے، اس کی لوگوں کو اہمیت معلوم نہیں ہے، قدر نہیں ہے، اس لیے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی تصوف کی چیز نہیں ہے، کوئی سلوک نہیں ہے، کوئی مجاہدہ نہیں ہے۔

میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ سب سے مہتم بالشان رکن جس کے لیے بڑا اہتمام کر دیا گیا ہے، اور جس کی ساخت یہ رکھی گئی ہے کہ بغیر اہتمام کے وہ ادا ہی نہیں ہو سکتا وہ حج ہے، لیکن حج میں بھی جو لوگ حج کی تیاری نہیں کرتے (تیاری سے میری مراد پاسپورٹ یا قرعہ اندازی وغیرہ کی تیاری نہیں ہے) یعنی اپنے ذہن کو تیار نہیں کرتے، حج کے فضائل اور حج پر جو اللہ تعالیٰ کے وعدے ہیں، اور حج کی جو روح ہے، اور حج کے جو مناسک ہیں، اور حکمتیں ہیں اور روحانی فوائد ہیں، جو لوگ حج کا اس نظر سے مطالعہ نہیں کرتے اور حج کی عظمت سے واقف نہیں ہیں، اور محرکات بھی ان کے اتنے عمیق اور اتنے صحیح نہیں ہیں جو ایک حاجی کے ہونے چاہئیں، تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ پورا حج کر لیتے ہیں اور فقہی حیثیت سے ان کا حج بھی صحیح ہوتا ہے، یعنی مفتی فتویٰ کی زبان میں یہی کہے گا کہ ان کا حج صحیح ہے اور کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ ان کا حج ادا نہیں ہوا، لیکن حج کا اصل فائدہ ﴿لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ

وَيَذْكُرُوْا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ﴾[1] اور پھر یہ کہ جس کو حج مبرور نصیب ہوا وہ ایسا پاک وصاف ہو جاتا ہے جیسے کہ حدیث میں آتا ہے کہ مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ[2]، تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے، اور کسی دن شیطان کو اتنا رسوا اور ذلیل وخوار نہیں دیکھا گیا ہے جتنا کہ عرفات کے دن دیکھا گیا، کس کثرت سے اللہ تعالیٰ مغفرت فرماتا ہے، پھر حج میں جو اللہ تعالیٰ نے انقلاب انگیزی کی شان رکھی ہے کہ زندگی سراسر تبدیل ہو جاتی ہے، بالکل مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی ہے، اور انسان کی گویا اخلاقی حیثیت سے بھی، ذہنی حیثیت سے بھی از سر نو پیدائش ہوتی ہے، بہت سے لوگوں کو یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، وہ چلے جاتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ زاد وراحلہ ہی شرط ہے، بیشک شرط ہے، اور اس کے بعد پورا حج کر کے چلے آتے ہیں اور کوئی فرق نہیں ہوتا، بعض اوقات (اللہ معاف کرے گستاخی ہوئی) الٹا اثر ہوتا ہے۔

بیت اللہ شریف پر تجلیات کی بارش

روح ابراہیمی اور عشق ابراہیمی کوٹ کوٹ کر، اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اللہ تعالیٰ سے تعلق کوٹ کوٹ کر اب بھی بھرا ہوا ہے، بیت اللہ وہی، حرم وہی ۔

کعبہ را ہردم تجلی می فزود
ایں ز اخلاص ابراہیم بود

آج بھی بیت اللہ شریف پر تجلیات کی بارش ہوتی ہے، اور جب بات آ گئی ہے تو میں عرض کر دوں، خود میرا بھی تجربہ ہے، شاید اللہ کسی کو وہاں لے جائے، ہمارے ایک بزرگ دوست جو خود صاحب باطن اور صاحب احوال تھے، انھوں نے مجھے خود قصہ سنایا کہ میں مکہ

---

(۱) سورة الحج:۲۸ (۲) رواه البخاري في صحيحه عن أبي هريرة، كتاب الحج، باب فضل الحج المبرور، حديث رقم ۱۵۲۱

معظّمہ گیا تھا تو ایک خاص مقصد لے کر گیا تھا اور ان کی زندگی کا ایک اہم مرحلہ تھا، اس کے لیے مجھے دعا کرانی تھی، میرے والد صاحب نے مجھے بہت تاکید کی تھی کہ اگر کوئی عارف باللہ، کوئی مستجاب الدعوات ملے - اور وہاں نہ ملے گا تو کہاں ملے گا؟ - تو میری طرف سے عرض کرنا کہ دعا کریں، وہاں ایک بزرگ تھے حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ، شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب سید الطائفہؒ کے خلفائے خاص میں تھے، تو وہ جب ان کے پاس گئے تو ان بزرگ نے ان سے کہا کہ میاں! جو کام تم خود کر سکتے ہو، وہ میرے ذمہ کیوں کرتے ہو؟ تم کرلو، ہم نے کہا: وہ کس طرح؟ کہا: دیکھو بیت اللہ شریف پر تجلیات کی بارش ہر وقت ہوتی ہے، تم آنکھ بند کر کے آنکھ کھولو اور دعا کرو، جب کسی تجلی خاص سے اتصال ہو جائے گا تو اس وقت دعا قبول ہوگی۔

بیت اللہ اب بھی وہی ہے، جن کو اللہ نے توفیق دی وہ اب بھی محسوس کرتے ہیں، مگر اللہ کے شیر بہت سے ایسے ہیں کہ وہاں جاتے ہیں اور ویسے ہی چلے آتے ہیں، کیا بات ہے؟ حج کی تیاری انھوں نے نہیں کی تھی، حج کی عظمت ان کے دل میں نہیں بیٹھی، بیت اللہ شریف کو پہچانا نہیں تھا، ان کا مسعیٰ (صفا اور مروہ کے درمیان) مطاف اور بیت الرکن والمقام اور چیز سے اتصال قلبی نہیں ہوا تھا، پورا پورا حج کر آتے ہیں، ہزاروں روپے خرچ ہوتے ہیں، اور اگر کوئی کہے تو بے ادبی کی بات ہوگی۔

نیت کی اہمیت

میں نے کہا کہ بہت سے اللہ کے شیر ایسے ہیں جاتے ہیں اور ویسے کے ویسے چلے آتے ہیں، تو جب یہ بیت اللہ کا حال ہے جہاں ہر وقت دور چلتا رہتا ہے اور رحمتِ الٰہی برستی رہتی ہے، گھنگھور گھٹا برستی رہتی ہے، پھر مدارس اور پھر علمی حلقے اور پھر اساتذہ کی صحبتیں یہ کیا چیز ہیں، کہنا یہ ہے کہ بہت کچھ تعلق انسان کی ذہنی کیفیت سے ہے، اگر انسان کی ذہنی کیفیت درست ہو جائے جس کو نیت کہتے ہیں، شریعت نے نیت کو اسی لیے اہمیت دی ہے، نیت انسان

کے اندر استعداد پیدا کر دیتی ہے، اس کو اہل بنا دیتی ہے، یعنی گویا جیسے کوالی فائی (Qualify) کرنا کسی کو کہتے ہیں، وہ انسان کو اس کے لیے تیار کر دیتی ہے کہ اب وہ اس کے اثرات کو جذب کرے، اس لیے نیت کی بڑی اہمیت ہے، تو ذہنی کیفیت پر بہت اثر پڑتا ہے۔

مثلاً ایک شخص ایک بڑے سے بڑے جامعہ میں، کسی زمانہ میں بغداد کا جامعہ نظامیہ تھا، نیشاپور کا جامعہ نظامیہ تھا، امام غزالی کا حلقۂ درس تھا اور کس کس کے حلقۂ درس تھے، اور کتنے کتنے مدارس تھے، اس پر مستقل کتابیں ہیں، اس مدرسہ میں یا کسی مدرسہ میں بھی اگر جانے والا اس کیفیت کے ساتھ جا رہا ہے کہ میں ایک باغ میں قدم رکھ رہا ہوں اور میں ایک ادنیٰ درجہ کا گل چیں ہوں، اور میں ایک ایک پھول کا اور ایک ایک کلی کا محتاج ہوں، اور یہ باغ کلیوں سے بھرا ہوا ہے اور مجھے اپنا دامن بھر لینا ہے، وہ دامن بھر کر کے آیا۔

اور اگر کوئی اس خیال سے وہاں گیا کہ کچھ بھی نہیں، کانٹے ہی کانٹے ہیں، لوگوں نے خواہ مخواہ گلستاں نام رکھ دیا ہے، یہاں تو بھوک ہے، پیاس ہے، تکلیف ہے، اچھا کھانا نہیں ملے گا اور معلوم نہیں کتنی ہمیں وہاں ناز برداریاں کرنی پڑیں، کتنی ہمیں سختیاں جھیلنی پڑیں گی اور کیا فائدہ ہے اس علم کا، اور کون سے بڑے استاد آسمان سے اترے ہیں، تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اور بعض وقت یہ چیزیں انسان کی ذہنی کیفیت کی بہت حد تک تلافی کر دیتی ہیں بلکہ بعض اوقات بدل بن جاتی ہے، اگر اس جگہ میں کوئی کمی ہے اور مرکز میں کوئی کمی ہے تو اس کی بھی تلافی اس سے ہو جاتی ہے، ایسا دیکھا گیا ہے کہ دینے والے کے پاس زیادہ سامان نہیں، لیکن لینے والے کی ہمت بلند ہے اور طلب ہے تو اللہ تعالیٰ نے دینے والے کی اس محدود پونجی میں برکت عطا فرمائی ہے اور لعل و جواہر سے دامن بھر دیا ہے، یعنی بہت سے لوگوں کو ایسے استادوں سے فائدہ پہنچا ہے جو سچ پوچھیے اگر باقاعدہ یعنی تولا جاتا اور یہ کام کوئی پیمائش اور وزن کا ہوتا تو یہ فیصلہ ہوتا کہ اس استعداد والے کے لیے یہ استاد کافی نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس متوسط استعداد والے استاد سے اس عالی استعداد والے طالب علم کو ایسا فائدہ پہنچایا جیسے کسی بڑے استاد سے فائدہ پہنچا اور پہنچ سکتا ہے، اس کی صدہا مثالیں ہماری علمی تاریخ میں

ہیں، ہمارے مدارس کی تاریخ میں اور تعلیم وتربیت کے نظام کی تاریخ میں ہیں۔ بہت سے استادوں کے طالب علموں نے اپنے استادوں سے ایسا فائدہ اٹھایا کہ خود استادوں کو حیرت ہوئی، اور بعض اوقات تقریر کرتے وقت، درس دیتے وقت ان کو حیرت ہوئی کہ یہ مضامین کہاں سے آرہے ہیں۔

اور مجھے خود اس کا تجربہ ہے کہ بعض اہل طلب طالب علموں کے سامنے مجھے محسوس ہوا کہ میرے اندر کوئی تغیر ہو گیا ہے اور میرے اندر جیسے کوئی سوتا پھوٹ گیا ہے، کوئی منفذ کہیں سے ایسا تھا جو بند تھا، اب کھل گیا ہے، اور اس میں قلب کو دخل ہے، مثلاً پوچھا جائے امام الحرمین بیشک بڑے پایہ کے شخص ہیں، امام جوینی ہیں، لیکن امام غزالیؒ تو ان سے بھی بڑھ گئے، ایسے آپ کو صدہا لوگ ملیں گے جو اپنے استادوں سے بڑھ گئے ہیں، اس وجہ سے کہ ان کے اندر استعداد تھی اور طلب تھی اور قدر تھی، اور بعض اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ بعض ذہین اور حساس طلبہ کو اپنے استادوں میں کچھ کمی محسوس ہوئی کہ وہ تسلی نہیں کر سکتے تو وہ ناکام ہوئے، لیکن جن سعید طالب علموں نے طے کر لیا کہ نہیں ہمیں انھیں سے فائدہ اٹھانا ہے، اور ہمیں انشاءاللہ انہیں سے فیض حاصل ہوگا تو وہ کامیاب ہوئے، تو وہ جو مولانا روم کا شعر ہے ؎

آب کم جو تشنگی آمد بدست
تا کہ آبت جوشد از بالا و پست

پانی کی فکر کم کرو اور پانی کم تلاش کرو، تشنگی زیادہ پیدا کرو تا کہ تمہارے پاؤں کے نیچے سے پانی ابلے، تا کہ آبت جوشد از بالا و پست، اوپر اور نیچے سے پانی اُبلے اور پانی برسے۔

اپنی درسگاہ پر ناز

ہمارے عزیز بھائی جو اس سال پہلی مرتبہ آئے ہیں، وہ اپنے ذہن میں اپنے فائدہ کے لیے، مدرسہ کے فائدہ کے لیے نہیں کہتا، مدرسہ کو الحمدللہ جو کچھ بننا تھا، اس کو جو کچھ مشہور ہونا تھا، جو کچھ امتیاز پیدا کرنا تھا، پیدا کر چکا، اور اصل عزت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، اپنے فائدہ کے لیے میں کہتا ہوں کہ مدرسہ اور مدرسہ سے تعلق رکھنے والوں کی وقعت پیدا کریں، اور اس

پر اللہ کا شکر ادا کریں، جتنا اللہ کا شکر ادا کریں گے، ان کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری صحیح رہنمائی فرمائی، ہم صحیح جگہ پر آئے ہیں، اور ہمیں انشاء اللہ یہاں سے فائدہ پہنچے گا، اور ہمیں یہاں سے فائدہ اٹھانا ہے، بھرپور فائدہ اٹھانا ہے، اتنا ہی ان کے حق میں بھی بہتر ہوگا۔

اور جن لوگوں کے دلوں میں شروع سے شک بیٹھا ہوا ہے، تردد ہے، اور وہ اپنے مدرسے کے بارے میں، درسگاہ کے بارے میں، اساتذہ کے بارے میں، نظام تعلیم کے بارے میں، نصاب کے بارے میں احساس کمتری میں، احساس کہتری میں مبتلا ہیں، اس سے کیا ہوتا ہے؟ اس نصاب سے کیا ہوگا؟ یہاں پڑھ کر ہم کیا کرلیں گے؟ جامعہ ازہر جاتے یا سعودی عرب کی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ یا جامعۃ الامام محمد ابن سعود وغیرہ جن کے نام آپ سنتے ہیں یا سنیں گے، وہاں جاتے تو کچھ فائدہ بھی ہوتا، اور یہاں کتنی ہمیں عربی سکھالیں گے، یہ خود عجمی ہیں اور یہاں کا ماحول بھی عرب کا نہیں ہے، ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟ تو ان کو واقعی فائدہ نہیں ہوگا، اور صاف مجھے نظر آتا ہے، میرا تجربہ ہے، بحیثیت مدرس کے بھی، بحیثیت معتمد تعلیم کے بھی، بحیثیت ایک تاریخ کے موضوع کا مطالعہ کرنے والے کے بھی کہ ایسے لوگوں کو بالعموم فائدہ نہیں پہنچتا اور وہ کورے کے کورے رہتے ہیں اور بالکل ویسے ہی جاتے ہیں۔

لیکن جن کے ذہن میں درسگاہ کا وقیع تصور ہوتا ہے، اس کے نظام کا، اس کے مقاصد کا، اس کے تخیل کا، اس کے طریقۂ تعلیم کا، ان کو بہت سی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود فائدہ پہنچ جاتا ہے، یہ تجربہ ہے۔

اور ہمیں ایک بڑی یونیورسٹی کے ایک بڑے پروفیسر اور بڑے ذہین اور جن کے ہاتھوں سے درجنوں آدمی پی. ایچ. ڈی. کر کے نکلے، انھوں نے کہا کہ مولانا! ایک چیز ہمارے یہاں ہے جس کو (Sense of Pride) کہتے ہیں "یعنی اپنی درسگاہ پر ناز"، اس کو بہت دخل ہے، جن لوگوں کو اپنی درسگاہ پر، مادر علمی پر، اپنے اساتذہ پر ناز ہوتا ہے، وہ بہت فائدہ اٹھاتے ہیں، اور پھر اللہ تعالیٰ ان سے بہت فائدہ پہنچاتا ہے، یہ سنس آف پرائڈ ہے، مسلم

یونیورسٹی کا بہت بڑا سرمایہ اور اس کی بہت بڑی طاقت اپنی درسگاہ پر فخر اور ناز تھا، وہ یہ کہ ہم بہترین درسگاہ میں ہیں، ہماری درسگاہ کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا، علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ میں یہ بات ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ کیمبرج اور آکسفورڈ کے سامنے بھی ان کی آنکھیں نہیں جھپکتی تھیں، ہمارے یہاں کے طلبہ میں آپس میں جو اتحاد ہے، جو رشتہ قائم ہو جاتا ہے، واقعی علی گڑھ برادری کا رشتہ ضرب المثل تھا، کوئی شخص کہیں چلا جاتا بے تکلف کسی علیگ کے مکان میں چلا جاتا، اور گھر والوں سے کہتا کہ میں علی گڑھ کا طالب علم ہوں، میں ٹھہروں گا۔

ایک صاحب نے واقعہ سنایا، ''قومی آواز'' میں چھپا تھا کہ ہم کلکتہ گئے تو ہم نے کہا کہ کہاں ٹھہریں؟ ہوٹل میں ٹھہرنے کی سکت نہیں تھی، تو معلوم ہوا کہ یہاں ایک معروف روزنامہ کے ایڈیٹر علیگ ہیں، دفتر میں پہنچے اور ہم نے کہا کہ ہم علی گڑھ کے طالب علم ہیں، ہم آپ کے یہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں، تو انھوں نے کہا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ آپ پہلے میرے گھر نہیں گئے، پہلے یہاں آئے ہیں، آپ کو تو چاہیے تھا کہ پہلے وہاں جاتے، چائے پیتے، ناشتہ کی فرمائش کرتے، سامان رکھوا دیتے، کہتے ہمارا گھر ہے، ہمیں یہاں رہنا ہے، یہ لائیے وہ لائیے، پھر آپ ہم سے ملتے اور کہتے کہ ہم ٹھہر گئے ہیں، اب آپ ہم سے پہلے کہتے ہیں کہ ہم آپ کے یہاں ٹھہریں گے، یہ تو علی گڑھ کی بات نہیں ہوئی۔

تو یہ بات کسی زمانہ میں ہمارے ندوی طلبہ، ندوی فضلاء میں بھی تھی کہ ایک ندوی دوسرے ندوی کو ایسا ہی بھائی سمجھتا تھا، بالکل بے تکلف، لوگ کہتے تھے کب کی ملاقات ہے، اور صرف رشتہ یہ ہے کہ ایک ہی درسگاہ میں دس برس پہلے انھوں نے پڑھا ہے، یہی بات کم و بیش بڑے مدارس میں تھی۔

پہلی بات

میرے عزیزو! پہلی بات تو یہ ہے کہ جب یہاں آئے ہیں تو اس میں آپ کا سراسر نقصان ہے، فائدہ کچھ نہیں ہے کہ آپ اس کو بے وقعتی کی نظر سے دیکھیں، اپنے والدین پر آپ کو تعجب ہو، غصہ تو میں نہیں کہتا، تعجب ہو اور تھوڑی سی شکایت کہ ہم کو کہاں بھیج دیا، اس میں

آپ بالکل محروم رہیں گے، آپ کو فائدہ نہیں ہوگا، اب تو شکل یہی ہے کہ آپ اس پر خوش ہوں، اور یہاں آئے ہیں تو ندوۃ العلماء کی تاریخ پڑھیں، حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کا تذکرہ پڑھیں، 'حیاتِ شبلیؒ' پڑھیں، اور ضرور پڑھیں، 'حیات عبدالحیؒ' پڑھیں، اور ندوۃ العلماء کی تاریخ پر جو چیزیں ہیں ان کو پڑھیں، اوران سے ذہنی اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کریں، اس کے تخیل کو، اس کے مقاصد کو جذب کرنے کی کوشش کریں، پھر اس کے بعد جو ماحول یہاں ہے اس کو غنیمت نہیں بلکہ نعمت سمجھیں، آپ یہ سمجھیں کہ ہمارا فائدہ تو یہاں رہنے میں ہے۔

اور میں آپ سے صحیح کہتا ہوں کہ میں ۱۹۵۱ء میں مصر گیا، میری عمر ۳۶-۳۷ سال رہی ہوگی، چالیس سال سے شاید کم ہی تھی، تو مجھے وہاں ایسے لوگ ملے جو سالوں سے تھے اور ان کو اس وقت تک عربی بولنی نہیں آتی تھی، اور پتہ لکھتے تو پتہ میں نحوی غلطی کرتے تھے، اور ایک شخص کے درجہ سے واقف نہیں تھے، طٰہٰ حسین بھی زندہ تھے، عباس محمود العقاد بھی زندہ تھے، احمد امین بھی زندہ تھے، منصور علی باشا، احمد باشا اور محبّ الدین الخطیب اور بڑے بڑے اہل قلم جن کے ہم مضامین پڑھتے تھے باحیات تھے، ہم یہاں تمنا کرتے تھے کہ کبھی ان کو دیکھیں، وہ اس زمانے کا آخری عہد تھا، خدا نے مجھے صحیح موقع پر پہنچایا، وہ نسل زندہ تھی، یہی شام کا حال تھا، العلامہ کرد علی، علامہ بہجۃ البیطار اور بڑے بڑے علماء زندہ تھے، پھر اس کے بعد چل چلاؤ شروع ہوا، بعض ۶۰-۷۰ کے پیٹے میں تھے، بعض ۷۵-۸۰ کے پیٹے میں تھے، اور جب جانا شروع ہوا تو وہ قافلہ ایک دم سے چلا گیا، اور مصر خالی ہوگیا، تو میں جب وہاں گیا تو مجھے کوئی چیز نئی نہیں معلوم ہوئی، اس لیے کہ میں تقریباً سب کو پڑھ چکا تھا اور سب کے متعلق اپنے ذہن میں اور اپنے استادوں اور اپنے جس ماحول میں رہتا تھا، ان کے متعلق میرے ذہن میں ایک ترتیب قائم ہوگئی تھی، اور ان کی خوبیاں اور ان کی کمزوریاں بھی مجھے معلوم تھیں، تقریباً ہر ایک سے میں اس طرح ملا جیسے ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں سے بلکہ ان سے بھی اتنا واقف نہیں تھا، اس لیے کہ میرا اشتغال عربی ادب اور زبان سے بہ نسبت اردو زبان و ادب کے زیادہ تھا، ویسے گھر کی تربیت اور ماحول کی وجہ سے شعر و شاعری کا عام چرچا تھا، میں ناواقف نہیں تھا، لیکن عرب ادباء کو تو میں، کسی کی پوری پوری کتاب، ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف

میں نے پڑھا تھا، احمد امین کی فجر الاسلام، ضحیٰ الاسلام کا ایک حرف نہیں چھوڑا تھا، اس کے حاشیہ پر میری رائیں لکھی ہوئی ہیں، اور وہ میرے رائے بریلی کے کتب خانہ میں اب بھی موجود ہیں۔ اس لیے آپ یہاں کے ماحول سے فائدہ اٹھائیں، اور اگر آپ یہاں علمی و روحانی ورزش کی نیت کے بغیر اور اس کا ذہن پیدا کیے بغیر یہاں چار چھ برس رہیں گے تو آپ کو فائدہ نہیں ہوگا۔

اللہ کا شکر ادا کریں

دوسری بات یہ ہے کہ جو میسر ہے، جو اللہ نے آپ کو نصیب کیا ہے، اس پر شکر کریں، میں اس لیے نہیں کہتا کہ میں ندوۃ العلماء کا ناظم ہوں یا بہر حال مجھے اپنے ادارہ کی تعریف کرنی ہے کہ اچھا ہے، بلکہ اس لیے کہتا ہوں کہ میں اس میں آپ کا فائدہ سمجھتا ہوں، اور آپ کا اسی میں فائدہ ہے کہ آپ یہاں آئے ہیں تو اس کو اپنے لیے موضوع ترین جگہ سمجھیں اور اپنے استاذوں کو یہ مقام دیں کہ وہ آپ کی پوری پوری رہنمائی کر سکتے ہیں اور آپ کو پورا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

وقعت پیدا کریں

تیسری بات یہ ہے کہ وقعت پیدا کریں، بغیر وقعت کے بالکل فائدہ نہیں، کوئی کہیں بھی جائے، اگر کوئی معقولات پڑھے اور معقولات کی وقعت نہ ہو تو معقولات کا علم بھی نہیں آئے گا، جب آپ کسی چیز کی افادیت سمجھیں گے تب وہ چیز آپ کو عطا ہوگی، یہ اللہ کی سنت ہے اور یہی انسانی نفسیات ہے۔

اپنے وقت کو کارآمد بنائیں

اور چوتھی چیز یہ ہے کہ آپ اپنے وقت کو کارآمد بنائیں، اور اپنے اساتذہ سے درس کے علاوہ اوقات میں بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں، اور ان سے ارتباط پیدا کریں، اور ان

سے آپ کا ذاتی رابطہ ہو، ان کی مجلسوں میں بیٹھیں، ان کی ہر بات غور سے اور وقعت سے سنیں، اور ذہن میں کچھ سوالات تیار کریں کہ ہم کس ترتیب سے مطالعہ کریں؟ ہم اپنی عربی اچھی کرنے کے لیے کون سی کتابیں پڑھیں؟ کس دور کی کتابیں پڑھیں؟ کن مصنفین کی کتابیں زیادہ سے زیادہ پڑھیں؟ کتاب کے مطالعہ کا کیا طریقہ ہے؟ وہ بتایئے، ایک کتاب ہم پڑھتے تو بہت ہیں لیکن یاد نہیں رہتی، ہم کس طرح اس کا مطالعہ کریں کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے اور آئندہ بھی ہم اس سے کام لے سکیں؟ وہ شاید آپ کو کچھ تجربہ کی روشنی میں بتائیں گے کہ اس کو پہلی دفعہ یوں پڑھیں، دوسری مرتبہ یوں پڑھیں اور نوٹس بھی لیں، اگر وہ اہل قلم ہیں تو ان کی تحریروں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھیں، اور ان کی تقلید کی کوشش کریں، اور وہ جن لوگوں کو بتائیں کہ یہ آپ کے لیے اچھا نمونہ ہیں آپ ان کی تقلید کیجیے، ان کا اسلوب اختیار کیجیے۔

جب مولانا شبلیؒ یہاں تھے ان کی شخصیت بڑی مؤثر اور دل آویز تھی، اللہ تعالیٰ نے ان میں ایسی شخصی کشش عطا کی تھی کہ جو لوگ ان کے پاس بیٹھتے تھے وہ ان کے دل و دماغ میں سما جاتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ان کے برابر نہ کوئی عالم ہے نہ ادیب، نہ کوئی خطیب، نہ کوئی ذہین نہ کوئی مصنف، اور ان لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچا، ان میں سرفہرست مولانا سید سلیمان ندوی ہیں، انھوں نے گویا مولانا شبلیؒ کو اپنے اندر اتار لیا تھا، ان کی محبت، ان کی عقیدت سے کیا چیز بن گئے تھے، اور پھر دوسرے نمبر پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ہیں، اگر چہ وہ یہاں کے طالب علم نہیں تھے، مولانا عبدالباریؒ ہیں اور اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ہیں، حاجی معین الدینؒ احمد صاحب ندوی ہیں، مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم ہیں، اور بعض لوگ ان کو مولانا شبلی کے اسلوب کو اخذ کرنے اور اس کو کامیابی سے نقل کرنے میں سید صاحب پر بھی ترجیح دیتے ہیں، سید سلیمان ندوی کی تو ایک دوسری شخصیت ہی پیدا ہوگئی تھی، ان میں دو شخصیتیں مل گئی تھیں، ان کی اپنی شخصیت جو بعد میں اپنی محنت سے (Develop) انھوں نے پیدا کی، اور خود ان کے خاندانی اثرات، اور وہ شخصیت جو مولانا شبلیؒ کی صحبت میں بنی، لیکن مولانا عبد السلام کی شخصیت اکہری تھی، وہ مولانا شبلیؒ ہی کے اثر سے پیدا ہوئی، تو اس کا اتنا اثر پڑتا ہے۔

اور ہم نے اپنے زمانے کے طالب علموں کو بھی دیکھا ہے کہ وہ اپنے استاد سے ذہنی طور پر جتنے زیادہ مربوط تھے، اخلاقی طور پر اتنا ہی ان پر استادوں کا عکس آیا ہے، یہاں تک کہ چال ڈھال میں بھی فرق پڑ گیا ہے۔ ہاں! مولانا شبلی سے استفادہ کرنے والوں مین ایک نام میں بھول گیا، ان پر مولانا شبلیؒ کا بڑا اثر تھا، مولانا آزاد نے مولانا شبلی سے پورا فائدہ اٹھایا اور وہ بڑے ان کے قدرداں تھے اور مولانا شبلی بھی ان کے بڑے قدرشناس تھے، تو یہ ذاتی فائدہ ہے۔

جن لوگوں کا مولانا سے ایسا رابطہ تھا، ہر وقت ان کی مجلس میں اٹھتے بیٹھتے تھے، ان کے مشورہ کے مطابق تقریر تیار کرتے تھے، مضمون لکھتے تھے، کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، تو وہ جو مولانا شبلی کا خاص فن ہے اور ان کا جو طرز تحریر ہے اور جو طرز استدلال ہے، اس میں ان کے بڑے کامیاب متبع ہوئے۔ مولانا عبدالماجد کہتے تھے کہ اگر مولانا نے مجلس میں کوئی شعر پڑھ دیا تو ہم سمجھتے تھے کہ بس شاعر کو سند مل گئی، اب کچھ پوچھنا نہیں، بس فوراً یاد ہو جاتا تھا، مولانا شبلیؒ نے اس شعر کی تعریف کی ہے، اس شعر پر داد دی ہے۔

اسی طریقہ سے ہر دور میں ہوتا رہا ہے کہ جس استاد، ایک یا دو استاد یا پورے مجموعہ کو اگر وہ مقام دے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اس کو پورا فائدہ پہنچتا ہے، پھر جب وہ منزل طے ہو جاتی ہے اور اللہ کو منظور ہوتا ہے تو ایک منزل خود بخود آ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کو جن لوگوں سے کام لینا ہوتا ہے، ان کو پھر آگے کے رہبر بھی مل جاتے ہیں، لیکن اگر پہلے ہی رہبر کی آدمی ناقدری کرے، اور اس کو ہر وقت تنقید کا نشانہ بنائے اور اس کے نزدیک اصول مسلم یہ ہو جائے کہ وہ ناقص ہے، تو پھر اس کا یہ مزاج بن جاتا ہے اور ہر چیز میں سب سے پہلے وہ عیوب ڈھونڈتا ہے، تنقید اپنے وقت پر اپنی مقدار سے اور تناسب سے ہو تو یہ بہت ضروری ہے، ہر چیز توازن کے ساتھ بہت صحیح ہے، لیکن جب تناسب بگڑ جاتا ہے اور مزاج میں فساد پیدا ہوتا ہے تو یہ مضر ہوتی ہے، تنقید کا ایسا مزاج نہیں بنانا چاہیے کہ پہلے ہر چیز کو اعتراض اور شبہ اور تنقید کی نظر سے دیکھے اور پھر اس کے بعد اس کا ذہن بدل جائے تو الگ بات ہے۔ نہیں! ہر چیز کو پہلے اس نظر سے دیکھیے کہ ہمارے لیے مفید ہے اور ہمیں ضرور اس سے فائدہ ہوگا، ہمیں سنجیدگی سے اس کو دیکھنا چاہیے، اس کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس کے بعد اگر اس میں

کوئی خامی، کچھ جھول، کچھ ناہمواری نظر آئے تو کوئی حرج نہیں، اگر ضرورت ہو تو اس کا اظہار بھی کرے۔

میرے عزیزو! آپ کو اس وقت یہ کرنا ہے کہ آپ اس نیت کے ساتھ یہاں رہیں، میں نے ورزش کی مثال دی، نماز کی مثال دی، حج کی مثال دی، اس کے بغیر فائدہ نہیں ہوگا، ہم جہاں آئے ہیں یہ اتفاقی بات نہیں ہے ﴿ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ﴾ [1]، ﴿وَجِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَا مُوسَىٰ﴾ [2] یہ بھی آپ پڑھ سکتے ہیں، اللہ نے ہماری صحیح رہبری کی اور ہم یہاں غلطی کر کے نہیں آ گئے، کہ چاہا تھا کہیں اور جانا اور پہنچے کہیں اور، آپ اپنے استادوں سے پورا فائدہ اٹھائیں، اپنے ماحول سے فائدہ اٹھائیں، اور یہ بہت کچھ آپ پر منحصر ہے، آپ کے شوق پر منحصر ہے، آپ کی طلب کے مطابق سطح بلند ہوتی چلی جائے گی، آپ کے شوق اور تیاری کی سطح جتنی بلند ہوگی اتنا ہی اللہ تعالیٰ آپ کو بلند کر دے گا، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔ [3]

---

(۱) سورة يس: ۳۸ (۲) سورة طه: ٤٠

(۳) المعهد العالي للدعوة و الفكر الإسلامي، ندوة العلماء (لکھنؤ) کے قاعة المحاضرات میں دراسات عالیہ و علیا کے طلبہ کے سامنے ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء میں کی گئی تقریر، اسے مولانا شاہ ابو دجانہ تسنیم عثمانی ندوی نے قلمبند کیا، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵ رستمبر ۱۹۸۱ء)۔

ایک بڑی ضرورت

اس مرتبہ اپنے آخری سفر اردن کے نتائج اور اس کے بعض روشن پہلو المعهد العالي للدعوة و الفكر الإسلامي کے طلبہ اور دار العلوم کے نوجوان اساتذہ کے سامنے رکھنے کی میں نے خود خواہش کی، مگر میرے ذہن میں یہ تھا کہ ایک محدود تعداد ہوگی، یہ بالکل تصور میں نہیں تھا کہ دار العلوم کے اس وسیع ہال میں اساتذہ وطلبہ کی اتنی بڑی تعداد ہوگی، بہر حال مجھے جو بات کہنی ہے وہ ایسی نہیں کہ محدود حلقہ سے باہر نہیں کہی جائے، سب ہی طلبہ اس کے مخاطب ہیں، اور اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، میں سوچ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں، اور اس کا مرکزی نقطہ کیا ہو، لیکن جیسا کہ بارہا تجربہ ہوا ہے، قرآن اس سلسلہ میں رہنمائی کرتا ہے، قاری کو کوئی ہدایت یا کوئی تاکید پہلے سے نہیں ہوتی لیکن حسن اتفاق سے قاری ایسی تلاوت کرتا ہے کہ ایک راہ مل جاتی ہے، اس سے ذہن کو انشراح ہو جاتا ہے۔

اس وقت بھی قاری نے جو آیت پڑھی، اس سے میرے ذہن کو رہنمائی مل گئی، انشراح ہو گیا، وہ آیت ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً﴾ (۱)

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے مراد ایک تو وہ عمومی امانت ہے جس میں تمام مؤمنین شریک ہیں، ایک وہ امانت ہے جو علماء کے ساتھ مخصوص ہے کہ وہ اپنے علم ومعرفت سے فائدہ پہنچائیں، اور دینی فراست، دینی بصیرت اور صلاحیت سے دین کی اشاعت ودعوت کا کام کریں۔

اس آیت کی روشنی میں میں اپنے احساس اور تاثر میں آپ کو شریک کرنا چاہتا ہوں،

---

(۱) سورة الأحزاب: ۷۲

اس سفر سے میرے اندر جو نئی تحریک اور نئی طاقت پیدا ہوئی، اس کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت عالم اسلام کا اصل اور سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ قوموں کی قیادت کر سکتے ہیں، اور ملکوں کی زندگی کا سانچہ بنا سکتے ہیں، ان کے لیے نئے رخ متعین کر سکتے ہیں، یہ وہ طبقہ ہے جو یا تو اسلام سے باغی ہے اور ذہنی وتہذیبی لحاظ سے ارتداد کا شکار ہے، یا جو طبقہ ملکوں کی قیادت کر سکتا ہے، مغربی زبانوں سے واقفیت، سیاسی نظاموں سے واقفیت اور سیاسی کاموں کو خوبی کے ساتھ ادا کرنے کی جو صلاحیت اس نے پیدا کر لی ہے، اس کے بنا پر جو طبقہ سارے اسلامی ملکوں میں حاوی ہے، اُن کی قسمتوں کا مالک بنا ہوا ہے، (اگر یہ تعبیر صحیح ہے) یہ وہ لوگ ہیں جن کو یا تو اسلام پر اعتماد نہیں، یا وہ اسلام کو اس زمانہ کے لیے مفید اور کارآمد نہیں سمجھتے، وہ اسلام کو ایک ضائع شدہ طاقت سمجھتے ہیں، جیسے ٹارچ جس کے سیلس ختم ہو گئے ہوں، اس سے روشنی نہیں پھیل سکتی، ان کے ذہنوں میں جو بات بیٹھی ہوئی ہے جیسا کہ میں نے اردن کی ایک تقریر میں کہا تھا کہ خدا اسلام کا بھلا کرے کہ اس نے ایک زمانہ میں بڑا اچھا کردار ادا کیا تھا، وأد بنات روک دیا تھا، عورتوں کے کچھ حقوق دلا دیے تھے، کچھ انسانیت کا احترام پیدا کر دیا تھا، اس زمانہ کی حد تک اسلام مفید تھا، اب اس ترقی یافتہ زمانہ میں اسلام کا کوئی حصہ نہیں، اور کم از کم قیادت میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

یہ وہ طبقہ ہے جو اس وقت عالم اسلام میں برسر اقتدار ہے، اور سارے مسلم عوام کو ریوڑ کی طرح ہانکتا ہے، اور اب چونکہ حکومت کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے، پہلے حکومتوں کے صرف تین چار کام ہوتے تھے، زمین کا ٹیکس، محاصل وغیرہ وصول کرنا، کلکٹر اور قاضی وغیرہ اپنے اپنے زمانہ کی اصطلاحات کے مطابق منتظمین متعین کرتے، اور بیرونی حملوں سے ملک کی حفاظت کرنا، بس یہ چار کام ہوتے تھے، لیکن تعلیم کا کیا سانچہ ہو؟ اس کا مقصد ونصاب کیا ہو؟ اس سے ان کو کوئی بحث نہیں تھی، تعلیم گاہیں اور مدارس آزاد تھے، مسلمانوں کے شخصی قانون نکاح وطلاق اور میراث وغیرہ میں ان کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا، اس میں دخل دینے کو وہ نہ صرف شرعاً بلکہ سیاسۃً وحکومۃً بھی ناجائز سمجھتے تھے، لیکن اب یہ حالت نہیں، اب زندگی کے ہر مسئلہ سے ان کا تعلق ہے، وہ دخل دے سکتے ہیں، بلکہ دخل دینا فرض سمجھتے ہیں، اب اس

وقت حکومتوں کا رخ کلیت کی طرف ہے کہ عوامی زندگی کے جتنے شعبے ہیں، سب ایک خاص نہج پر حکومت کی منشا کے مطابق چلیں، اس میں تعلیم کا نظام، معاشرت، تمدن، پرسنل لاء، صحافت، تصنیف وتالیف اوراظہارخیال کے جتنے ذرائع ہیں سب آ جاتے ہیں۔

میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اس وقت عالم اسلام کی خرابی، اس کے تشکک، اس کی دینی کمزوری، اس کی بے راہ روی اس کے ذہنی انحراف میں سب سے بڑا حصہ خواص اور تعلیم یافتہ طبقہ کا ہے، وہی حاوی ہے، وہی غذا پہنچاتا ہے، وہی خیالات کومسموم کرتا ہے، وہی زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالتا ہے، اور خاص طور پر آزاد ممالک کا مسئلہ تو تنہا یہ ہے کہ آپ ایک طرف مراکش سے انڈونیشیا تک چلے جائیں، یا کمیونسٹ خیالات البعث العربي کا منتشر دستور ملے گا، سعودی عرب کے خاندان کی حد تک آپ مستثنیٰ کر سکتے ہیں، ورنہ ہر جگہ طبقۂ مثقفہ ترقی پسندی کے انھی خیالات کا اظہار کرتا ہے، کبھی آزادی نسواں پر، کبھی یہ کہ تعلیم یافتہ لڑکیاں کیوں نہ دفتر میں ملازم رکھی جائیں؟ اس پر مضامین نکلنے شروع ہوتے ہیں، یہاں تک کہ بہن کا حصہ بھائی سے آدھا کیوں ہے؟ شیخ عبداللہ بن باز نے اس پر نوٹس بھی لیے، مجھے لوگوں نے بتایا کہ ایسے خیالات کی تردید میں مضامین لکھے جاتے ہیں، مگر وہاں کے عربی اخبارات میں شائع نہیں ہوتے۔

اس وقت پورے عالم اسلام کی حالت یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ ذہین اور صاحب دماغ طبقہ مغرب کی تعلیم سے اور مغربی افکار سے پورے طور پر متاثر ہو چکا ہے، اور وہ نہ صرف ان کا قائل ہے بلکہ ان کا داعی ہے، اس کے پاس دعوت کے اور خیالات کو اخذ کرنے کے وہ ذرائع ووسائل ہیں جو ہو سکتے ہیں، یہ حال ہے ان ممالک کا جن کا میں نے نام لیا ہے، بقیہ کا اسی پر قیاس کر لیجیے، الجزائر، تونس، لیبیا وغیرہ سارے ممالک عربیہ کا یہی حال ہے۔

میں آپ سے خصوصاً المعهد العالي للدعوة و الفكر الإسلامي کے طلبہ اور نوجوان اساتذہ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فکری وتصنیفی میدان میں خیالات کو درست کرنے اور اسلام پر اعتماد بحال کرنے اور اسلام کی عظمت وضرورت کو دوبارہ ذہن میں جاگزیں کرنے کے لیے جو کام اس ملک میں جس سطح پر ہوا ہے، اسے آپ حقیر نہ سمجھیں، آپ ان تمام عوامل

اور ارتباطات اور کوششوں کے ساتھ اس کے لیے تیار رہیں۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ جب میں یمن پہنچا تو وہاں کے متعدد معتمد و ثقہ اور ذمہ دار لوگوں نے بتایا کہ اس ملک کو کمیونسٹوں کے قبضہ میں جانے اور ارتداد کے شکار ہو جانے سے جن پندرہ آدمیوں نے بچایا، یہ وہ لوگ تھے (مجھے آپ سے کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ آپ ایک خاص ماحول میں رہتے ہیں) جنھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، سید قطب شہید اور ابو الحسن علی ندوی کی کتابیں پڑھی تھیں، وہ یہ سمجھتے تھے کہ سیاسی انقلاب یا کمیونسٹ حکومت کے قبضہ کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے، مستقبل کو بدلنے، آئندہ نسلوں کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کے کیا وسائل پیدا ہو گئے ہیں، اور لوگوں کا ذہن کیا کام کرتا ہے۔

آپ لوگ یہ سمجھیں کہ جو کام آپ کے یہاں لکھنے پڑھنے کا ہو رہا ہے، یہ حقیر نہیں، ہم نے الحمدللہ ایسے ملکوں اور ایسے طبقوں میں ان کوششوں کو پہنچتے ہوئے پایا جہاں ایک بڑا امتاز طبقہ اس سے متاثر ہے، اس کا محرک اس ندوۃ العلماء کی بنیاد ہے، جس کی بنیاد مولانا محمد علی مونگیریؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ (میں ان دونوں کے نام خاص طور پر لیتا ہوں) نے رکھی اور جس کی تعمیر و ترقی میں ان دونوں کا بنیادی حصہ ہے، انھوں نے ہوا کا رخ پہچان لیا تھا کہ اب ہوا کا رخ عوام کی طرف سے آنے والے انقلابات کی طرف نہیں جو فوجوں کے راستے سے آئیں گے، بلکہ اب جو انقلابات آئیں گے وہ خیالات و افکار کے لشکر سے آئیں گے اور فکری راستوں سے آئیں گے۔

آپ اس چیز کو ذہن میں رکھیں، اردو عربی میں دعوت کا کام اور افکار و خیالات کے نشر و اشاعت کی قیمت سمجھیں، عربی تعلیم یافتہ طبقہ پڑھنے لکھنے کا مریض ہے، آپ اس کو غذا دیں، آپ اپنے کو دینی، علمی ہر حیثیت سے دعوت کے لیے تیار کریں، اسی کے لیے المعهد العالي للدعوة و الفكر الإسلامي کی بنیاد پڑی ہے، اس کو اس وقت کا جہاد اور عبادت سمجھیں، و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔[1]

---

(۱) ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ مطابق اگست ۱۹۸۴ء میں کی گئی ایک تقریر کا خلاصہ، ماخوذ از ''تعمیر حیات'' (شمارہ ۲۵/ اگست ۱۹۸۴ء)۔

تقویٰ اور صبر کامیابی کے دو ستون

میرے عزیزو اور بھائیو!

انسان کے غور کرنے کے لیے، اپنی زندگی کو بنانے اور ترقی دینے کے لیے، اور اپنی سیرت بہتر ثابت کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ کوئی نامعلوم حقیقت یا کوئی نئی بات کہی جائے، عام طور پر جن حقیقتوں پر انسان کی زندگی کی اصلاح و ترقی کا دارومدار ہوتا ہے، وہ آشکارا ہیں، اور خود اللہ کے آسمانی صحیفوں میں، اللہ کے محبوب بندے انبیاء (علیہم السلام) کی سیرت و واقعات میں اور پھر اللہ کے مخلص و مقبول بندوں کے حالات میں وہ حقیقتیں موجود ہیں اور اکثر مکرر آئی ہیں، جس طریقہ سے کہ انسان کی مادی و جسمانی زندگی کا دارومدار جن چیزوں پر ہے، وہ عام ہیں، ان میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے، اسی طرح جو بنیادی باتیں ہیں، انھیں بھی معلوم کرنے کے لیے کسی پہیلی کا بجھانا یا کہیں دور کی کوڑی لانا ضروری نہیں۔

اصل میں وہ رابطہ اصل ہے جو انسان کے حدود اور انسان کی قوت ارادی اور ایک طے شدہ حقیقت یا ایک صحیح علم کے درمیان ہونا چاہیے، یہ رابطہ کبھی مضبوط ہوتا ہے اور کبھی بہت کمزور ہو جاتا ہے، ایسا کمزور ہو جاتا ہے کہ اس کا کوئی اثر زندگی پر نہیں ہوتا، مادی زندگی ہو، یا روحانی و اخلاقی زندگی، یا علمی و شعوری زندگی ہو، سب میں اس رابطہ ہی کا کھیل ہے، پھر انسان کے شعور، قوت ارادی، موجودات کے حقائق کے درمیان اس رابطہ ہی کو قائم کرنے اور مضبوط کرنے کے لیے انبیاء (علیہم السلام) کی بعثت ہوتی رہی ہے۔

میں اس وقت ایسی ہی باتیں آپ لوگوں کے سامنے کہنے جا رہا ہوں، جو صرف ذکر و انبساط کے درجہ میں نہیں اترتیں، جتنی اچھی باتیں ہیں اکثر لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں، صرف

ان اچھی باتوں پر عمل کرنے کا جذبہ وفیصلہ کمزور ہو چکا ہوتا ہے، کچھ ایسے موانع پیدا ہو جاتے ہیں جو اس جذبہ کو سلب کر لیتے ہیں، اور عزم کو ختم کر دیتے ہیں، کسی عزم کو تازہ کرنا، جذبہ کو گرم کرنا اور اس کو فروزاں کرنا یہی انبیاء (علیہم السلام) کا پھر اپنے اپنے زمانے کے داعیوں کا کام ہوتا ہے۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) کا قصہ

حضرت یوسف (علیہ السلام) کا قصہ ان قصوں میں ہے جو قرآن میں بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، اور جن کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، ﴿نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ أَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَآ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ هَـٰذَا الۡقُرۡآنَ وَإِن كُنتَ مِن قَبۡلِهِ لَمِنَ الۡغَافِلِيۡنَ﴾ [1] اور ﴿لَقَدۡ كَانَ فِيۡ قَصَصِهِمۡ عِبۡرَةٌ لِّأُولِي الۡأَلۡبَابِ مَا كَانَ حَدِيۡثاً يُّفۡتَرَى وَلَـٰكِنۡ تَصۡدِيۡقَ الَّذِيۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَتَفۡصِيۡلَ كُلِّ شَيۡءٍ وَهُدًى وَرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ﴾ [2] یہ سارے کے سارے قرآن مجید میں جو ارشادات ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے قصہ سے انسانی زندگی کی تعمیر وترقی میں اور انسان کو مدارج عالیہ تک پہنچنے میں بڑی رہنمائی ہوسکتی ہے، اور اس میں بڑی تسلی وتسکین کا سامان موجود ہے، جب حضرت یوسف (علیہ السلام) کی بحیثیت عزیز مصر اپنے بھائیوں سے گفتگو ہوئی اور انھوں نے کہا کہ کیا تم کو یاد ہے کہ تم نے یوسف اور ان کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ تو وہ سب ایک دم سے چونک پڑے، اس لیے کہ یہ قصہ یا تو خدا کو معلوم ہے یا یوسف کو، اور ظاہر ہے یہ خدا تو ہو نہیں سکتے، چنانچہ انھوں نے بڑے اچنبے کی حالت میں کہا کہ ﴿أَإِنَّكَ لَأَنتَ يُوسُفُ﴾ ارے کیا آپ یوسف ہیں؟ انھوں نے کہا: ﴿أَنَا يُوسُفُ وَهَـٰذَا أَخِيۡ﴾ میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔

اب یہاں پر میں آپ سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی پوچھنے والا پوچھے کہ ایک آیت کا انتخاب کیجیے جو یکساں سب پر صادق آسکے، تو میں کہوں گا کہ ہاں وہ آیت یہ

---

(۱) سورۃ یوسف:۲ (۲) سورۃ یوسف:۱۱۱

ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا کہ ﴿ أَنَا يُوسُفُ وَهَـٰذَا أَخِي قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾ یہ کلام نبوت ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں، صاف یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ خدا کے محبوب و مقبول نبی، ایک عارف باللہ اور صرف عارف باللہ نہیں بلکہ ایک نبی عارف باللہ کا جو مقام ہوتا ہے اس مقام سے وہ بول رہا ہے، اس موقع پر دس باتیں کیا پچاس باتی کہی جا سکتی تھیں، میں نے بڑی قربانیاں دیں، میں نے بڑی تکلیف برداشت کی، میں کون ہوں، میں پیغمبر زادہ ہوں، میرے باپ بھی پیغمبر تھے، میرے دادا بھی پیغمبر تھے، اور جیسا کہ ان کے بارے میں نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا تھا کہ یوسف بن الکریم بن الکریم بن الکریم، یعنی یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم، تین تین چار چار پشتیں پیغمبر چلی آ رہی ہیں، یہ کہہ سکتے تھے میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا؟ میں کس گھر کا چراغ ہوں؟ میں کس کا بیٹا، کس کا پر پوتا ہوں؟ اور پھر خدا نے مجھے عقل دی ہے، ایسی عقل کہ آج یہاں تخت پر بیٹھا شاہ مصر بنا ہوا، اگر یہ روایت صحیح ہے کہ ان کو خود مختاری حاصل نہیں تھی تو بادشاہ کا معتمد و نائب بنا ہوا، اور اگر یہ روایت صحیح ہے کہ بالکل ان کے ہاتھ میں حکومت آ گئی تھی تو مصر کے خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے دیکھو، میں نے کیسا انتظام کیا ہے، اور غلہ کی تقسیم کس طرح کر رہا ہوں، وہ یہ سب کہہ سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کہا، بالکل معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ الفاظ ان کی زبان سے نکلوائے جو نبی کے شایان شان ہیں۔

اگر بہت بڑے بڑے عقلاء، بڑے بڑے عارف باللہ، بڑے بڑے حکماء، اور بڑے بڑے مذاہب کے رمز شناس بیٹھ کر تلاش کریں کہ اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے؟ اگر وہ ہفتوں اور مہینوں سوچیں تو اس سے بہتر جواب نہیں مل سکتا جو یوسف (علیہ السلام) نے دیا، جس میں ان کی نبوت کا ظہور بھی ہے اور ایمان کی حکمت اور اس کی معرفت بھی، صحیح بات تو یہ ہے کہ ہمارا کوئی کارنامہ نہیں، ہمارا کوئی کمال نہیں، ﴿ قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ﴾ اللہ ہی نے ہم پر احسان کیا۔

قانون الٰہی

پھر اس کے بعد وہ بات کہتے ہیں جو قیامت تک سب کام کرنے والوں کے لیے،

زندگی کے مرحلوں سے جن کو گزرنا ہے، جن کو مختلف آزمائشیں پیش آتی ہیں، ان کے لیے دشوار سے دشوار ترین حالات میں، نازک سے نازک ترین مواقع پر، پیچیدہ سے پیچیدہ حالات رکھنے والے ممالک میں، تاریخ کے دوروں میں اور ہر ماحول میں جو بالکل شمع کا کام کرسکتی ہے، وہ ہدایت یہ فقرہ ہے جسے میں آپ کے سامنے آج پھر دہراتا ہوں کہ انھوں نے اپنے متعلق تو کہا اور اس کے بعد قیامت تک لیے ﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ [۱]، جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کو کلمہ باقیہ بنا کر چھوڑ دیا گیا، گویا ایک شمع ہدایت، ایک عالمی بصیرت اور ایک دستور العمل بنا کر چھوڑ دیا کہ دیکھو میرا اور میرے بھائی ہی کا معاملہ نہیں، خدا کا اصول یہ ہے ﴿وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا﴾، ہر نسل کے لیے، ہر قوم کے لیے، ہر جماعت کے لیے، ہر ادارے کے آدمیوں کے لیے، مجاہدین اسلام کے لیے، اللہ کا کلمہ بلند کرنے والوں کے لیے، اصولوں اور صحیح مقاصد پر قائم رہنے والوں کے لیے، سب کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے کردہ قانون یہ ہے، الفاظ کی عمومیت دیکھیے کہ ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾، اسم موصول اور اس کے ساتھ جو افعال و متعلقات ہیں، وہ سب بتاتے ہیں کہ مَنْ کون ہے، یہ جس کے متعلق کہا جا رہا ہے، ان کی کیا صفات مطلوب ہیں؟ وہ کون لوگ ہیں ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ﴾ خدا کا عام قانون یہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانہ میں جو تقوی اور صبر دو باتوں پر عمل کرے گا، ﴿فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ 'اللہ تعالیٰ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرے گا'، اس میں بھی عمومیت و اطلاق ہے، اگر وہ فرما دیتے کہ اس کو بادشاہی ملے گی، اس کو سرداری ملے گی، اس کو پیشوائی ملے گی، اس کو رزق وافر ملے گا، اس کو عزت ملے گی، اس کو قیادت ملے گی، سب محدود و معین چیزیں ہیں، اس کو بھی پسند نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ الفاظ بلوائے ہیں جو اول سے آخر تک سب کے لیے بالکل عام الفاظ ہیں، یہ کلیہ قاعدہ ہے اور سب انسانوں کی میراث ہے، اس میں کسی کی تخصیص نہیں۔

---

(۱) سورۃ الزخرف:۲۸

تقویٰ کا مفہوم

﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ﴾ ، جو خدا سے ڈرے گا، اور نا مناسب چیزوں سے پرہیز کرے گا، تقویٰ کے معنی کیا ہیں؟ تقوی کے معنی صرف خوفِ خدا یا کثرتِ عبادت کے نہیں جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ تقویٰ ایک ایسا مثبت عمل ہے جس میں منفی شامل ہے، بعض مثبت عمل وہ ہوتے ہیں جو نفی پر مشتمل ہوتے ہیں، یعنی مجموعہ ہوتے ہیں مثبت و منفی اور ایجاب و سلب کا، تقوی وہی چیز ہے جس میں ایجاب و اثبات بھی ہے لیکن نفی پر وہ قائم ہے، اور وہ ہے ان تمام چیزوں سے بچنا جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اس کے یہاں خصوصیت حاصل کرنے اور زندگی کی کامیابی کے منافی ہوں، پہلی چیز ہے پرہیز اور دوسری چیز ہے عمل، یعنی یوں کہہ لیجیے پرہیز اور رضا، یا پرہیز اور توازن، ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ﴾ تو ہے پرہیز اور ﴿يَصْبِر﴾ ہے علاج یا رضا، بس دو چیزیں ہیں جو ان نا مناسب چیزوں سے جن کا تعارض ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہاں کی کامیابی سے، اس کے نزدیک کامرانیوں اور مقبولیت سے، اس کے یہاں کی محبوبیت سے اور اس کا مؤید، موفق اور منظور بننے سے، ان سے تو کرے پرہیز، ان کو ہاتھ نہ لگائے، اور ان سے دور رہے، پھر اس کی تعلیم پر عمل کرنے میں جو مشکلات پیش آئیں اس کو برداشت کرتا رہے، یہ ہے صبر یعنی وہ استقامت دکھائے اور مشکلات کو برداشت کرے۔

پھر فرماتے ہیں: ﴿فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾، یہ ایسی بات ہے جیسے بادشاہ کہے کہ اگر کسی نے ایسا ایسا کیا تو پھر ہم دیں گے، اور ہم ابھی نہیں بتاتے کہ کیا دیں گے، اسی وقت معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیا دیں گے؟ تو آدمی کیا کیا سوچ سکتا ہے، یہاں بھی انھوں نے ایسی بات کہی جو بالکل ہر شخص کے لیے مناسب حال ہے، اگر بادشاہی کہتے تو ہر ایک کے لیے بادشاہی مناسب نہیں، اور ہر ایک کے لیے یہ نعمت بھی نہیں، اسی طرح سے حکومت بہت سے لوگوں کے لیے بڑا امتحان بلکہ سزا ہے، ایسے ہی دولت بھی ہر شخص کے لیے مناسب نہیں، اسی طرح کوئی بھی چیز آپ طے کیجیے گا وہ سب کے لیے مناسب حال نہیں

ہوسکتی، لیکن ﴿فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾، میں ایسی چیز آ گئی ہے جو سب پر حاوی اور سب کے مناسب حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کے اور دین کے کام کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا، جو کچھ دے گا، وقت پر دیکھنا۔

تو میرے عزیزو! جو کسی صحیح مقصد کے لیے کہیں اپنی زندگی کا کوئی وقفہ، کوئی مدت صرف کریں، وہ کسی راہ کے مسافر ہوں، اور کسی کارواں کے وہ شریک ہوں، ان کے لیے سب سے بڑھ کر کامیابی کی ضمانت دو چیزیں ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کی زبان سے نکلوایا ہے، اور انسانی نسلوں کے لیے چھوڑا ہے ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ﴾ کہ دو باتیں کرنی ہیں، خدا کی شان کے نامناسب چیزوں سے اور مقصد کو نقصان پہنچانے والی چیزوں سے پرہیز و احتیاط، اور مقصد کے حصول کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں ان کو برداشت کرنا، بس اس کے بعد کیا مقام و مرتبہ حاصل ہوتا ہے، اس کا تعلق اللہ سے ہے، ہم سے نہیں۔

تقویٰ اور صبر کامیابی کے دو ستون

میرے عزیزو! بس یہی بات ہے کہ اس وقت آپ کسی عمر کے ہوں، کسی درجہ کے طالب علم ہوں، آپ کسی خاندان اور برادری سے تعلق رکھتے ہوں، آپ کہیں سے آئے ہوں، اور آپ کے دل میں کیسے کیسے ولولے اور ارمان ہوں، سب کے لیے راستہ یہی ہے کہ ہم دو چیزوں پر عمل کریں، ایک تو یہ کہ ہمارے مقصد، یہاں کے اصول وضوابط، شرائط اور ضروریات ولوازم سے جو چیزیں میل نہیں کھاتیں، اور جن کا ان سے جوڑ نہیں ہے، ان سے تو پرہیز کریں، اور احتیاط برتیں، اپنی خواہشات پر قابو پالیں اور دل ماریں، تھوڑا سا بس اور کچھ نہیں، تقویٰ اور صبر، یہ دو چیزیں ہیں جو بالکل کافی ہیں، یہ دو ستون ہیں جن پر ہمارے مستقبل کی پوری عمارت کھڑی ہے۔

اگر آپ سے کہا جاتا ہے کہ آپ وقت ضائع نہ کریں، غلط جگہوں پر نہ جائیں، غلط جگہوں میں نہ بیٹھیں، غلط مشاغل میں آپ وقت صرف نہ کریں، تو یہ سب تقویٰ کے تحت آجاتے ہیں، تقویٰ ایسی چیز نہیں کہ وہ صرف اولیاء اللہ ہی کے لیے ہو، وہ ہر ایک کے مناسب

حال، اس کی سطح پر اور اس کے حالات کے مطابق ہوتا ہے، ایک سپاہی کا تقوی ہے، ایک مجاہد کا تقوی ہے، ایک طالب علم کا تقوی ہے، ایک داعی کا تقوی ہے، سب کا تقوی ہے، لیکن اس کی شکلیں مختلف ہیں، قدر مشترک اس میں نامناسب چیزوں سے بچنا ہے، آپ اپنا تقوی اختیار کریں، جو آپ کے مناسب حال ہو، اور آپ کی طالب علمانہ زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

آپ باہر جارہے ہیں، جہاں آپ کے کان میں نامناسب چیزیں پڑ رہی ہیں، اور آپ کی نظروں کے سامنے آرہی ہیں، نامناسب جگہوں میں آپ دیکھے جارہے ہیں، جہاں کے سائے سے آپ کو بھاگنا چاہیے، اور جس کے نام سے آپ کو نفرت ہونی چاہیے، وہاں لوگوں نے دیکھا کہ آپ تماشوں میں بیٹھے ہوئے ہیں، ایسے تماشہ کی مجلس میں جانا اور اس میں وقت صرف کرنا، باہر شہر میں ایسے لوگوں سے دوستیاں قائم کرنا جو آپ کے ساتھ کوئی مجانست و مشارکت نہیں رکھتے، یہ ساری چیزیں آپ کے تقوی کے خلاف ہیں، اتنا تقوی آپ اختیار کرلیجیے اور اس پر عمل کیجیے اور اس کے ساتھ ساتھ اس راہ میں جو تھوڑی سی آزادی محدود و مقید ہو جاتی ہے، اس کو آپ برداشت کرلیجیے، پھر تھوڑی سے محنت کرنی پڑتی ہے، تھوڑا سا جاگنا پڑتا ہے، نمازوں کی پابندی کرنی پڑتی ہے، درجوں میں وقت پر جانا پڑتا ہے، اور سبق کی تیاری اور اس کا مطالعہ و آموختہ یہ سب ان میں آتے ہیں، اس وقت جو آپ کو تفریح کے مواقع اور معاشی مواقع حاصل ہو سکتے ہیں، تھوڑا سا ان سے صرف نظر کرلیں، اور کسی بلند مقصد پر نظر جمائیں، اور اپنے کو کسی بڑے کام کے لیے تیار کریں، یہ سب ان میں آتا ہے جن کو یوسف (علیہ السلام) نے ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ﴾ میں بیان کردیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کی، قرآن مجید میں آنے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا کلام نہیں رہا، بلکہ اب تو وہ اللہ کے کلام میں شامل ہو گیا، قیامت تک کے لیے وہ شہادت ہے اور قابل عمل ہے، ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ﴾ جو کچھ احتیاط کرے گا، نامناسب چیزوں سے اپنے کو بچالے گا اور صبر سے کام لے گا، وہ اللہ کی قدرت کا تماشہ دیکھے گا ﴿فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾، جس درجہ کا احسان ہوگا، اس درجہ کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا ملے گی۔

میرے عزیزو اور بھائیو! یہی باتیں آپ سے کہنی تھیں، ہر ایک آدمی کے موافق اور اس کے مقام کے مطابق بات کہی جاتی ہے، ایک مدرسہ اور پھر دار العلوم ندوۃ العلماء جس کی دنیا میں شہرت و عزت ہے، عام بھائیوں کو معلوم بھی نہیں کہ دنیا کس نظر سے دیکھتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے محض اپنے فضل سے (یہ اللہ تعالیٰ کا ایک امتحان ہے اور وہ اس امتحان میں کامیاب کرے) اس وقت جیسے ایک ہوا چلا دی ہو، من جانب اللہ ایک چیز پیدا ہوگئی ہے، مجھے واسطہ پڑتا ہے اور شرم معلوم ہوتی ہے کہ یا اللہ تو ہی عزت رکھ، کس قدر لوگ اس وقت ہندوستان سے باہر ممالک عربیہ میں اور دور دراز ملکوں میں ندوہ کو، ندوہ کے طالب علموں کو، اور ندوہ سے تعلق رکھنے والوں کو دیکھتے ہیں، اس کا اندازہ ہی نہیں، ایسی حالت میں پست اور نا قابل ذکر چیزوں کا نام لیں اور کہیں کہ ارے بھائیو، اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والوں کی تقلید نہ کرو، ان کا لباس اختیار نہ کرو، ان کا شعار اختیار نہ کرو، تمھارے بال ایسے نہ ہونا چاہیے، ایسے ہونا چاہیے، تمھاری صورت ایسی ہونی چاہیے، تو یہ سب باتیں آپ کے مقام سے فروتر ہوں گی، اور ہماری زبان ساتھ نہیں دے سکتی کہ میں ایسی باتیں آپ سے کہوں، آپ کا مقام اور آپ کا معیار بہت بلند ہے۔

بس آپ تقویٰ اور صبر اختیار کرلیں، یہ دو شہپر ہیں جن سے آپ اونچی سے اونچی سطح میں اور بڑے سے بڑے آفاق میں پرواز کر سکتے ہیں، اور یہ کوئی ایسی مشکل و ناممکن بات نہیں، ورنہ اس طرح عمومیت کے ساتھ نہیں کہی جاتی، تاریخ میں ہزاروں نہیں لاکھوں ایسے واقعات ہیں کہ لوگوں نے تھوڑا سا اس پر عمل کیا اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے، آپ علماء اسلام کی تاریخ پڑھیے، آپ تاریخ دعوت وعزیمت پڑھیے، آپ اور مشاہیر اسلام کے تذکرے پڑھیے، سب میں آپ دیکھیں گے کہ ہر دور میں لوگ انھی دو چیزوں سے کامیاب ہوئے: تقویٰ اور صبر، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔(۱)

(۱) دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں اساتذہ وطلبہ کے سامنے ۱۶/ جمادی الاولی ۱۴۰۵ھ (فروری ۱۹۸۵ء) میں کی گئی ایک تقریر، یہ تقریر عبد الحکیم رانچوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/ مارچ ۱۹۸۵ء)۔

چار باتیں

میرے عزیزو اور بھائیو! دار العلوم اور اکثر دینی مدارس کا دستور یہ رہا ہے کہ تعلیمی سال کے آغاز میں مدرسہ کا کوئی ذمہ دار تقریر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے، ہمیں اس سال کس طرح مدرسے کے نظام اور اس کے ماتحت مختلف شعبوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے، یا پھر سال کے اختتام پر تقریر ہوتی ہے، جو طلبہ فارغ ہو کر جا رہے ہوتے ہیں، ان سے خاص طور پر خطاب ہوتا ہے کہ آپ نے جو کچھ یہاں سے حاصل کیا ہے، اس سے کیا کام آپ کو لینا ہے اور اپنے آپ کو ملک وقوم کے سامنے کس طرح پیش کرنا ہے؟ جن طلبہ کو دوسرے سال آنا ہوتا ہے ان سے یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ اپنے خاندان، علاقے اور ماحول میں کس طرح کا نمونہ پیش کریں، اور لوگوں کے اندر تاثیر پیدا کریں۔

لیکن یہ درمیان سال میں عید الاضحیٰ کی تعطیل میں اس اہتمام سے تمام طلبہ کو جمع کرنا بعض لوگوں کو عجیب لگے گا، لیکن میرے بھائیو! آپ کو اس عید الاضحیٰ کی تعطیل کے موقع سے چند باتیں کہنے کے لیے جمع کیا گیا ہے، ان ایام کی چھٹیوں سے متعلق آپ سے کہنا یہ ہے کہ آپ ایام تشریق اور ایام نحر کی چھٹی میں گھر جا رہے ہیں، یہ کوئی دسہرہ کی چھٹی نہیں ہے، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما الصلاۃ والسلام) کی یاد میں یہ چھٹی آپ کو دی جا رہی ہے، آپ وہاں بھی اس کا خیال رکھیں، ایام تشریق کا ایک شامیانہ تو وہ ہے جو حجاج کرام کے سروں پر ہوتا ہے، لیکن ایک شامیانہ وہ بھی ہے جو پوری امت مسلمہ کے سر پر ہوتا ہے، آپ اس شامیانہ سے دور نہیں، آپ اس کا خیال رکھیں کہ یہ دن غفلت، بے توجہی، تفریح بازی اور دوسری بے مقصود مشغولیتوں میں نہ گزریں، آپ اپنے گاؤں اور گھر میں ان

ایام کے فضائل بیان کریں، جو لوگ عید قربانی کے مسائل سے ناواقف ہوں اُنھیں مسائل بتائیں، آپ اہل قریہ اور اہل خانہ کے سامنے ایسا نمونہ پیش کریں کہ وہ دینی تعلیم سے مطمئن ہوں اور انھیں اعتماد ہو جائے کہ ہم نے اپنے بچوں کو دینی مدارس میں بھیج کر کچھ ضائع نہیں کیا، بلکہ ان بچوں میں اور دیگر بچوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

میں آپ سے مدرسہ کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے چار باتیں اس وقت خاص طور پر کہتا ہوں، یہ باتیں میں نے اس سے پہلے بھی کہی ہیں، اور آج پھر کہتا ہوں کہ آپ کو اس وقت چار کام کرنے ہیں:

(۱) پہلی بات یہ کہ آپ سب ہر جگہ یہ صدا لگائیں اور اپنے خاندان اور محلے کے بزرگوں سے کہیں کہ اس وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آپ اپنی آئندہ نسل کو دین سے وابستہ رکھنے کی فکر کریں۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ اردو زبان ہم بالکل بھولتے چلے جارہے ہیں، اور یہ اندیشہ پیدا ہونے لگا ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں عربی تو کیا اُردو زبان بھی سمجھیں گی یا نہیں، اس کی فکر کی ضرورت ہے۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ معاشرہ کی اصلاح کیجیے، شادیوں میں کس کس طرح کے جہیز کی شرطیں لگائی جاتی ہیں، اور نہ جانے کیسے کیسے رسوم قبیحہ مسلمانوں میں رائج ہو گئے ہیں، آپ اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیجیے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے آپ حسن اخلاق اور سنجیدگی کا نمونہ پیش کریں، ان کو اپنے آپ سے اور اپنے مذہب سے مانوس کریں۔

یہ چار باتیں آپ سے آج خصوصاً کہنی تھیں، آپ اپنی زندگی کے پروگرام میں ان کو شامل کر لیجیے، اور اس کام کو انجام دینے کے لیے ساری محنت اور کوشش کر ڈالیے، وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمین۔(۱)

---

(۱) ۰۵/ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں اساتذہ وطلبہ کے سامنے کی گئی تقریر، ماخوذ از "تعمیر حیات"، (شمارہ ۱۰/ستمبر ۱۹۸۵ء)۔

زبان وادب خدمت دین کا مؤثر ذریعہ

ادب کے راستہ سے جہاد

آپ نے مغرب بعد جب اچانک اعلان سنا ہوگا کہ تعزیتی جلسہ ہوگا تو آپ کے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی کہ کسی بلند فائق مسلمان یا کسی بڑی اسلامی سیاسی شخصیت کے انتقال کی خبر آئی ہے اور ان کی تعزیت میں جلسہ ہورہا ہے، یا کوئی بہت بڑے عالم دین جو قرآن و حدیث کی تدریس یا علوم دینیہ کی تدریس میں مشغول تھے، اور جامع ازہر اور اس طرح کی باہر کی جامعات یا مدارس میں درس دیتے تھے، یا کسی شیخ وقت کا انتقال ہوا ہے، اور اس سلسلہ میں جلسہ ہورہا ہے، اور شاید آپ کے لیے یہ بات خلاف توقع ہو کہ ایک استاذ ادب، ایک مصنف وادیب، اور ایک محقق ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت باشا مرحوم کے سلسلہ میں جلسہ ہورہا ہے، وہ بھی مسجد میں ہورہا ہے، اور علماء وطلبہ کی موجودگی میں ہورہا ہے، تو آپ کو شاید ان دونوں باتوں میں کچھ تضاد محسوس ہوا ہو، اور شاید اس سے پہلے اس کی مثالیں کم عمل میں آئی ہوں، کسی ادیب یا شاعر، کسی صاحب قلم کے لیے یہاں اتنے بڑے پیمانہ پر جلسہ ہوا ہو، لیکن میں اس میں بالکل کسی قسم کا تضاد نہیں سمجھتا، میری نگاہ میں ادب کی راہ سے دین کی خدمت کرنے والوں کی بہت اہمیت ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک جہاد ہے، نیت کا عالم تو اللہ ہے لیکن آدمی کے طرز تحریر سے، گفتگو سے، اخلاق سے اور خود اس کی زندگی سے اور اس کے جذبات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی نیت میں اسلام کی خدمت تھی یا کچھ اور؟

ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت باشا نے جس کام کی ابتدا کی وہ بالکل نیا نہیں تھا، وہ مختلف

گوشوں میں مختلف پیمانوں پر ہوتا رہا ہے، لیکن انھوں نے اپنی زندگی اس کے لیے وقف کردی، اور اس کو وقت کا بہت بڑا جہاد اور ایک بہت بڑی دینی خدمت سمجھا۔

ادب کے اثرات

ادب کا جو اثر نوجوانوں پر اور اہل فکر پر، یہاں تک کہ اہل سیاست پر جو ملکوں میں انقلاب لاتے ہیں اور جو قوموں کو خاص رخ پر ڈال دیتے ہیں، ان پر ادب کا جو اثر ہوتا ہے اور ادب جس طرح ان کے ذہن کی تشکیل کرتا ہے، اور پھر ان کو موقع دیتا ہے کہ وہ قوموں کے ذہن کی تشکیل کریں، اور پوری پوری قوموں اور نسلوں کو اور ایک ہی نسل نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی ایک خاص رخ پر ڈالنے کی کوشش کریں، اس رخ پر جس کو ان کے ذہن نے قبول کرلیا ہے اور جس کے وہ داعی بن گئے ہیں، اور جس کے اظہار کے لیے اور اس کو قلب و دماغ میں راسخ کرنے کے لیے ان کے پاس قلم کی طاقت اور زبان کی طاقت موجود ہے، وہ اس سے ایک عظیم الشان تعمیری اور اسی کے ساتھ عظیم الشان تخریبی کام انجام دے سکتے ہیں، جو میں کہہ سکتا ہوں کہ بعض اوقات (ہر زمانہ کے متعلق نہیں کہتا) لیکن بعض اوقات خالص علمائے دین اور خالص مشائخ طریقت اور یہاں تک کہ خالص داعی و مبلغ بھی نہیں کرسکتے۔

قوت بیانیہ کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے ادب میں ایک طاقت رکھی ہے، قرآن مجید کی مشہور سورہ سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی آیتیں ہیں: ﴿الرَّحْمٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْآنَ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ (یعنی خدائے رحمان ہی ہے جس نے قرآن کی تعلیم دی، اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان سکھلایا) ہمیشہ سے انسان کی تعریف کی گئی ہے، خاص طور پر اس فلسفۂ فکر میں جو دنیا میں طویل مدت تک رائج رہا اور اب بھی اس کا اثر ہے، فلسفۂ یونانی میں انسان کی تعریف حیوان ناطق سے کی گئی ہے، اور قرآن مجید میں قوت بیانیہ کی قدر و قیمت کو صرف تسلیم ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس کو واضح کیا گیا ہے، قرآن مجید میں متعدد آیتیں آپ پڑھیں گے، ان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو جو تمام چیزوں

سے ماوراء ہے، تمام صفات سے ماوراء ہے، اور اس کی شان بہت زیادہ ارفع واعلیٰ ہے، اس کو بھی بیان کے لفظ سے متصف کیا ہے، اور اس کو "عربی مبین" کہا گیا ہے۔

اسی طرح ایک آیت ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الأَمِيْنُ، عَلىٰ قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴾ [1] (اس کو یعنی قرآن کو لے کر روح الامین اترے ہیں آپ کے دل پر تا کہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں) ﴿لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴾ کافی تھا، نبی کی زبان وحی ترجمان اور صادق ومصدوق، مؤید من اللہ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کہا گیا کہ ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِيْنٍ﴾ فصیح عربی زبان میں، واضح اور مؤثر زبان میں۔

اسی طرح فرمایا گیا: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ﴾ [سورة إبراهيم:٤] "بِلِسَانِ قَوْمِهِ" کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ٹوٹی پھوٹی زبان میں اپنا مطلب ادا کر دیا کرتے تھے، اور وہ سمجھا لیتے تھے اور لوگ سمجھ جاتے تھے کہ وہ کیا کہنا چاہتے تھے، جب قرآن کہتا ہے: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ﴾ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زبان خدا کے یہاں بھی قابل ذکر ہے، اور اس کا ایک درجہ ہے، اور اس کا ایک معیار ہے، پھر سورہ یوسف جس طرح شروع ہوتی ہے: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (یعنی ہم نے اس قرآن کو فصیح اور واضح زبان میں اتارا تا کہ اس کو سمجھو) اور خود عربی کے معنی فصیح کے ہیں۔

اور پھر رسول اللہ (ﷺ) نے خود فرمایا: "أَنَا أَفْصَحُ الْعَرَبِ، بَيْدَ أَنِّيْ مِنْ قُرَيْشٍ وَ نَشَأْتُ فِيْ بَنِيْ سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ" میں تمام عربوں میں سب سے زیادہ فصیح ہوں، اس لیے ایک بات تو یہ ہے کہ میں قریش میں پیدا ہوا جس کی زبان مسلم ہے، ٹکسالی زبان ہے اور قریش کے بعد سعد بن بکر کی زبان سب سے زیادہ محفوظ تھی اور فصیح تھی، تو ادب کی طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ادب ایک آلہ ہے تعمیر کا بھی اور تخریب کا بھی، وہ ذہنوں کو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے، اور اس میں ایسی جادوگری ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایسی طاقت رکھی ہے کہ وہ بڑے بڑے وکلاء اور ذہین لوگوں کو اس طرح مسحور کر لیتا ہے کہ ان کو جس راستہ پر ڈال دیا جائے اور چلایا جائے وہ اس راستہ پر چل پڑتے ہیں، آپ اگر دنیا کے انقلاب کی تاریخ

(۱) سورة الشعراء: ١٩٤

پڑھیں گے اور اسلام کی تجدید و اصلاح کی تاریخ پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس قوت بیانیہ سے، زبان کی فصاحت و بلاغت سے اور قلم کی طاقت سے کتنا بڑا کام لیا گیا۔

انقلاب فرانس میں ادب کا کردار

انقلاب فرانس دنیا کی تاریخ میں ضرب المثل ہے، اس انقلاب کے پیچھے آپ کو کچھ اہل قلم نظر آئیں گے، کچھ ادباء نظر آئیں گے جنھوں نے ذہنوں کو تیار کیا جمہوریت کے لیے، آزادی کے لیے اور بغاوت کے لیے، اور پھر ان کا اتنا اثر پڑا کہ ایک ایسی نسل تیار ہوگئی جو برداشت نہیں کر سکتی تھی اس وقت کے حالات کو، فرانس میں موجود استبداد کو، جمود کو، اور تقدیس کو جو دین کے نام سے وہاں مسلط تھیں، جو وہاں کی روایات تھیں اور ان کا جو اثر تھا وہ سب ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے، ان کتابوں کے ادبی شہ پاروں نے، شاعری نے جو اس دور میں پیدا ہوئی اور یہاں تک کہ ناول نگاری نے اور قصہ کہانی کی جو کتابیں لکھی گئیں اور اس کے علاوہ اور بھی (ادب کا دائرہ وسیع ہے) اس نے فرانس کو ایک ایسے مرحلہ پر پہنچادیا کہ وہ اس انقلاب کے لیے نہ صرف تیار تھا بلکہ بے چین تھا، اور کوئی استبدادی طاقت، کوئی منطق اور دین کے نام سے کوئی دعوت اور کوئی تقدیس ان کو روک نہیں سکتی تھی، یہاں تک کہ وہ لاوا کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا اور پورا فرانس بہہ گیا، اس انقلاب فرانس کا اثر پورے یورپ پر پڑا، یہاں تک کہ آج تک ذہنوں پر قائم ہے۔

زبان و قلم نے ہمیشہ تجدید کا ساتھ دیا

یہ تو سیاسی اور عوامی انقلابات کا ذکر ہے، خود آپ اسلام کی تاریخ میں دیکھیں گے کہ (اس موقع سے فائدہ اٹھا کے کہتا ہوں) ہمیشہ زبان نے اور قلم کی طاقت نے ساتھ دیا ہے تجدیدی اور اصلاحی تحریکوں کا، اور یہ ان کا سب سے بڑا ہتھیار رہا ہے اور جہاد کا سب سے بڑا آلہ رہا ہے، اور وہ حضرات جنھوں نے حالات میں تبدیلی پیدا کردی، ایک نظام کو ختم کر کے دوسرے نظام کو جاری کردیا اور ذہنوں میں نئی بیداری بلکہ بے چینی پیدا کردی، وہ وہ لوگ تھے جنھوں نے قوت

بیانیہ سے اور قلم کی طاقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اس میں مشکل سے کوئی استثناء آپ کو ملے گا، آپ اوپر سے دیکھیں، سیدنا علی مرتضیٰؓ کتنے بڑے ادیب و خطیب تھے، عربی ادب میں اس وقت سے اب تک وہ معیاری شخصیت ہیں، پھر اس کے بعد آپ دیکھیں تو حضرت حسن بصریؒ، حضرت سماکؒ اور دوسرے داعی حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ، آج تک ان کے خطبے پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بادل گرج رہے ہیں، اور بجلیاں تڑپ رہی ہیں اور کوندرہی ہیں، اور ایک شخص ہے جو گرز چلا رہا ہے اور اس سے باطل کے سارے طلسم ٹوٹتے چلے جارہے ہیں۔

پھر آپ یہاں ہندوستان میں دیکھیے، حضرت مخدوم بہاریؒ کے مکتوبات دیکھیے، صرف فارسی ادب نہیں، صرف اسلامی ادب نہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں اور میں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے کہ عالمی ادب میں، بین الاقوامی ادب میں اس کا ایک پایہ ہے، اور باوجود اس کے کہ اس کے مقاصد دینی تھے اور اس کی زبان دینی تھی، لیکن ادب کے ایسے نمونے ہیں جس کی مثال مغربی زبانوں میں ملنی مشکل ہے، آج بھی ان کے اندر وہ طاقت ہے کہ پڑھنے والا ہل جاتا ہے، دل ودماغ متاثر ہوتا ہے، اور وہ چیزیں دل میں پیوست ہوجاتی ہیں، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات پڑھیے جو اسلام کی کمزوری اور ہندوستان میں اس کے لیے جو آزمائش تھی دور اکبری میں، اس پر اس طرح آنسو بہائے ہیں کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے خطوط میں کیا طاقت ہے، آج بھی ان میں کتنی حرارت موجود ہے، اور حرارت کے ساتھ ساتھ کتنی رقت انگیزی ان میں موجود ہے۔

مختلف ادوار میں تشکیک والحاد کے راستے

ہمیں یاد ہے کہ ہمارے سب کے استاد و بزرگ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تقریر کی، انھوں نے کہا کہ پہلے عالم اسلام میں عقائد کا تزلزل اور الحاد آرہا تھا فلسفہ کی راہ سے، اس کے لیے امام ابوالحسن اشعریؒ، امام باقلانیؒ، امام غزالیؒ اور امام رازیؒ وغیرہ پیدا ہوئے، پھر جب مغربی قوموں سے واسطہ پڑا تو اسلامی عقائد میں تزلزل تجدد، الحاد اور آزاد خیالی کی راہ سے آنے لگا، اور سائنس کے راستہ سے جب سائنسی تحقیقات آئیں تو معلوم ہوا کہ کتنی سرعت پیدا کی جاسکتی ہے اور کتنی طاقت ہے ان چیزوں میں جو خدا نے پیدا کی ہیں، اور ان کو تسخیر کیا جاسکتا ہے اپنے

مقاصد کے لیے، اور نئی نئی تحقیقات ہوئیں تو دماغ مسحور ہوگئے، ہندوستان کی بعض ایسی بڑی شخصیتیں جن کا ایک مقام ہے اور جو صاحب فکر تھے، اور خالص دینی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی تھی، ان کے دماغ نے پورا اثر قبول کیا، اور قبول ہی نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنی تحریروں میں اس کو منتقل کردیا، اس سے پوری ایک نسل متاثر ہوئی اور ہندوستان میں نئے قسم کے متکلم پیدا ہوئے کہ ان کے نام لینے کی ضرورت نہیں، اور آج تک اس کا اثر کسی نہ کسی درجہ باقی ہے۔

تو سید صاحبؒ نے فرمایا کہ پھر الحاد آنے لگا سائنس کے راستہ سے، فلسفہ کا طلسم ٹوٹ گیا اور اس کی اہمیت جاتی رہی، اس لیے کہ زندگی سے اس کا تعلق نہیں رہا، پھر اس کے بعد سیاست کے راستہ سے الحاد آنے لگا، یعنی جمہوریت، ڈیموکریسی، شخصی سلطنت اور اس طرح کے نظام، یہاں تک کہ ہمارے اچھے اچھے لوگ اس سے کسی نہ کسی درجہ متاثر تھے، اور علامہ شبلیؒ جیسے آدمی نے بھی جو خود ایک دبستان تھے اور ایک دبستان کے بانی ہیں، ان کی تحریروں میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ان کو بھی اہمیت کا احساس ہے اور وہ سیدنا فاروقؓ کی سیرت نگاری میں لحاظ رکھتے ہیں اس ذہن کا جو سیاست سے متاثر ہے، اور میں نے ایک کتاب دیکھی، محبّ الدین خطیب کی چھاپی ہوئی سیرۃ عمر بن خطاب ابن الجوزی کی، اس کے ٹائٹل پر لکھا تھا "أَوَّلُ حَاكِمٍ ديمقراطيٍّ في الإسلام"، اس سے آپ اندازہ کرلیجیے کہ تعریف سمجھی انھوں نے کہ یہ کہا جائے کہ یہ پہلے جمہوری حاکم ہیں اسلام کے۔

سید صاحبؒ نے فرمایا کہ پھر اس کے بعد اقتصادیات کے راستہ سے الحاد آنے لگا، اور اکنامکس، اشتراکیت، اجتماعیت، کمیونزم، سوشلزم اور اور مختلف نظاموں کے ذریعہ سے ذہن بدلنے لگے، اور جو لوگ اکنامکس پڑھتے تھے، وہ متاثر ہوئے، اور کچھ پڑھے لکھے لوگوں نے اشتراکی نظام کا مطالعہ کیا اور متاثر ہوئے اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے الحاد اختیار کیا، پھر جب ان کے ہاتھ میں زمام اختیار آئی تو ملکوں اور معاشرتوں کو بدل کر رکھ دیا۔

اب الحاد ادب کے راستے سے آرہا ہے!

پھر سید صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کے بعد پھر اس کا بھی اثر کم ہوا، اور اب الحاد ادب کے

راستہ سے آرہا ہے، چنانچہ یہ ہمارا مطالعہ ہے کہ اکثر جامعات کے شعبۂ ادب، وہ انگریزی ہو یا اردو، یہ خاص طور پر عقائد میں تزلزل پیدا کرنے اور الحاد وتجدد اور آزاد خیالی کا مرکز رہے ہیں، اور اب بھی بہت سی یونیورسٹیوں میں یہی حال ہے کہ انگلش ڈپارٹمنٹ اور خاص طور پر اس میں پڑھنے والے جو طلبہ ہیں وہ زیادہ آزاد خیال ہوتے ہیں، اور ان کے اندر بغاوت پیدا ہوتی ہے قدیم اقدار اور دینی اقدار سے، حالانکہ زبانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور زبانوں کے دائرے سے باہر ہے، لیکن زبان کی جو بہترین چیزیں لکھی ہوئی ہیں اور جو اُن کے پڑھانے والے ہیں وہ غیر اسلامی افکار ونظریات سے متاثر رہے ہیں، بلکہ آزاد خیالی اور فکری انتشار کے داعی رہے ہیں، اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض جامعات میں (جن کا میں نام نہیں لوں گا) شعبۂ عربی مرکز رہا ہے اس آزاد خیالی کا، چوں کہ میرا قریبی تعلق رہا ہے ان جامعات سے، اور آتا جاتا رہتا ہوں، کمیٹیوں میں بھی شامل رہا ہوں، تو مجھے معلوم ہوا کہ بعض یونیورسٹیوں کا شعبۂ عربی مرکز بنا ہوا ہے الحاد اور آزاد خیالی کا، اور وہاں پڑھنے والے لوگ بہت متاثر ہوتے ہیں، اس لیے کہ ان کے جو صدر شعبہ ہیں یا بڑے اساتذہ ہیں وہ متجدد ہیں، اور داعی ہیں ان خیالات کے، میں نام نہیں لے سکتا ہوں کہ بہت سے اس دنیا سے سفر کر چکے اور بعض باقی ہیں۔

ادب کی راہ سے جو چیز مثبت یا منفی، ایجابی یا سلبی، تعمیری یا تخریبی داخل کی جاسکتی ہے، وہ دوسرے جو بہت زیادہ بھاری بھرکم، ضرورت سے زائد سنجیدہ اور دقیق علوم ہیں، جو محنت طلب علوم ہیں، ان کے ذریعہ سے داخل نہیں کی جاسکتی، ایک شعر پڑھ دیجیے، ایک فقرہ چست کر دیجیے، ایک ادیب کی چند سطریں پڑھ دیجیے، جو اس کا اثر ہوگا وہ کسی معقولات کے عالم اور فلسفہ کی کتاب کا نہیں ہوسکتا۔

اس لیے ہماری نگاہ میں بڑی قدر و قیمت ہے ان لوگوں کی جنہوں نے ادب کی راہ سے بھٹکے ہوئے ذہنوں کو سنبھالا، ان کو اسلام کی طرف مائل کیا، اور جو بغاوت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا بھٹکے ہوئے نوجوانوں میں، اور ان کے عقائد میں جو تزلزل آرہا تھا، ان کے ذہن میں جو انتشار پیدا ہو رہا تھا، اور جو تشکک پیدا ہو رہا تھا، اور جس کی سربراہی افسوس ہے کہ ہمارے

ممالک عربیہ اور خاص طور پر مصر کے بعض ادیبوں نے کی، اس پر روک لگائی اور ان کا مقابلہ کیا، اور چوں کہ مصر کا اثر تمام عرب ملکوں پر ایسا پڑتا تھا جیسا کہ پہلے ایران کا اثر پڑتا تھا مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں، ہندوستان پر ولایت کا اثر پڑتا تھا انگریزوں کے دور حکومت میں، اور لفظ ولایت ہی بتاتا ہے کہ کس احترام سے یہ لفظ نکلتا تھا، تو جس طرح انگلینڈ کا اور یورپ کا اثر پڑتا تھا، اسی طرح مصر کا اثر تھا ممالک عربیہ پر، اچھے اچھے لوگ مصر کی طرف جو چیز منسوب کی جائے اس کا نام لیتے ہی اور کسی مصری کتاب کا نام لیتے ہی وہ گویا بالکل مسحور ہو جاتے، احتراماً خاموش ہو جاتے اور اس کا جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا تھا، ان مصری ادیبوں سے سارا عالم عربی متاثر ہو رہا تھا، اور تمام عرب نوجوانوں پر ان کا جادو چلنے لگا تھا، اللہ تعالیٰ نے ہمارے بعض دوستوں کو اس کا مقابلہ کرنے کی توفیق دی، ان میں سب سے زیادہ جنھوں نے اس سلسلہ میں سرگرمی دکھائی اور اس کو ایک تحریک اور زندگی کا مقصد بنایا، اور یہ ہے اصل چیز کہ اپنی زندگی کا مقصد بنالیا اور عبادت سمجھا، وہ ہمارے مرحوم دوست ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت باشا ہیں کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی ذات سے خدمت کی اور بڑا کام کر گئے، بلکہ چوں کہ وہ شعبہ ادب کے سربراہ بھی تھے جامعہ الامام محمد بن سعود میں، انھوں نے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور ایک نسل تیار کی، اور انھوں نے اپنے زیر تربیت طلبہ اور نوجوانوں کی رہنمائی کی اور ان کو بجائے اس کے کہ کوئی اور موضوع دیں ادب کا موضوع دیا اور ان سے درجنوں کتابیں لکھوائیں جو ان کی تحریک پر لکھی گئیں، اور جیسا کہ ہمارے عزیز مولوی محمد رابع نے کہا کہ انھوں نے یہ دو سلسلے تیار کیے، ایک دعوتی اور اسلامی شعر کا سلسلہ اور ایک حیاۃ الصحابہؓ کا سلسلہ، اور چوں کہ وہ اچھے اہل قلم اور ادیب بھی تھے اس لیے ان کی کتابیں بہت کامیاب ہوئیں۔

بہر حال ان سے ہمارا تعارف ان آخری برسوں میں ہوا جس کی مدت بہت طویل نہیں ہے، لیکن بہت جلد ہمارے ان کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم ہوگیا جو صرف ادبی اور علمی رشتہ نہیں تھا، بلکہ دوستانہ اور برادرانہ رشتہ بھی تھا، میں ان کی شرافت سے بہت زیادہ متاثر ہوا، اور انھوں نے ادب اسلامی میں ندوۃ العلماء کا اور ندوۃ العلماء کے کارکنوں کا جو حصہ ہے، ان

کا انھوں نے بڑی فراخ دلی بلکہ بڑی جرأت اور شرافت کے ساتھ اعتراف کیا، اور حقیقت میں اس وقت رابطہ ادب اسلامی کی جو تحریک ہے وہ ان کی ہی رہین منت ہے، انھوں نے اس کی طرف توجہ دلائی اور خود بھی وہ کوشش کرتے رہے اور اس کو ایک ادارہ کی حیثیت سے اور تحریک کی حیثیت سے لینے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے، جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی اسی موضوع پر گفتگو ہوتی تھی، وہ یہاں رابطۂ ادب اسلامی کے جلسہ میں آئے، انھوں نے جلسہ کی رہنمائی کی اور بڑی اچھی قیادت کی، اس کو صحیح رخ پر رکھا، وہ اس کے بعد بھی برابر اس تحریک سے وابستہ رہے اور ہمارے ساتھیوں اور عزیزوں اور ان کے درمیان برابر رابطہ قائم رہا، اور ہم بڑی امیدیں رکھتے تھے کہ ان کا کام اور وسیع ہوگا اور زیادہ مؤثر ہوگا، کیوں کہ ان کا شب و روز کا مشغلہ اور گویا ان کا وظیفہ یہی تھا، اور ہم سمجھتے ہیں کہ انھوں نے وقت کا ایک جہاد اور دعوت کا کام سمجھ کر اس کو انجام دیا، اور بھی ایک فال نیک اور بشارت ہے کہ ان کی تعزیت کا جلسہ یہاں مسجد میں ہو رہا ہے جس میں علوم دینیہ کے اساتذہ، علماء، طلبہ موجود ہیں اور ایک تبلیغی جماعت موجود ہے جو بلاد عربیہ سے آئی ہے، یہ خود ایک فال نیک اور قرینہ ہے اس بات کا کہ، انشاء اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ کا معاملہ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا ہوگا، اور میں تو ان کا بہت قدرداں ہوں، اس لیے کہ میں اس کام کی قدر و قیمت سمجھتا ہوں اور ان کے جذبہ و لگن سے واقف ہوں کہ ان کو کس قدر لگن تھی، اور میں نے آپ سے ذرا تفصیل سے اس لیے یہاں کہا کہ آپ کو بھی یہ کام کرنا ہے۔

ہندوستان میں زبان و ادب کی سربراہی شروع سے علماء نے کی

دیکھیے ہمارے ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے، میں نے اپنی بعض تحریروں میں لکھا ہے کہ بہت سے اسلامی ملکوں کا رشتہ اسلام سے اس لیے کمزور پڑ گیا کہ علماء نے اس ملک کی زبان و ادب میں وہ قائدانہ حصہ نہیں لیا جس کا اثر پڑا کرتا ہے، ترکی کا معاملہ یہی ہے اور کسی حد تک مصر ذرا مستثنیٰ ہے، لیکن کئی عرب ملکوں کا اور مسلم ممالک کا حال یہ ہے کہ ادب کی قیادت اور زبان و ادب میں صدارت کا مقام حاصل کرنے اور رہنمائی کرنے کی طرف علماء نے پوری

توجہ نہ دی اور اس کی اتنی اہمیت نہیں سمجھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو نئی نسل تیار ہوئی وہ ان سے ناآشنا تھی، اور اگر ناآشنا نہیں تھی تو غیر مؤثر تھی، وہ دینی حیثیت سے تو ان کا احترام کرتی تھی کہ ہاں مسئلہ پوچھنا ہو تو ان کے پاس جانا چاہیے، یہ صالح لوگ ہیں، لیکن وہ ان کو وہ مقام دینے کے لیے تیار نہ تھی جو ایک قائد کا مقام ہوتا ہے، رخ دینے والے کا مقام ہوتا ہے، اس میں ہندوستان کا استثناء ہے، یہاں کی زبان وادب میں سربراہی شروع سے علماء نے کی ہے، آپ کو معلوم ہے جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ یہاں ایوان ادب کے چار ستون مانے گئے ہیں، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولوی محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کہا جا سکتا ہے، یہ چاروں طبقۂ علماء سے تعلق رکھتے تھے، ان کی ساری تعلیم مدارس میں ہوئی تھی، چٹائیوں پر ہوئی تھی، پھر اس کے بعد یہ لوگ ادبی میدان میں آئے۔

پھر سید سلیمان ندوی جیسی شخصیت پیدا ہوئی جو ایک طرف تو بھوپال کے قاضی القضاۃ تھے اور حیدرآباد کے دینی مشیر تھے، اور پاکستان جانے کے بعد وہاں کے دستور بنانے والوں میں ہیں، تو دوسری طرف انجمن ترقی اردو کے اور ہندوستانی اکیڈمیوں کے بار بار صدر ہوتے ہیں، اور اردو زبان پر خاص علمی موضوعات پر (Original)، مجتہدانہ اور محققانہ چیزیں پیش کرتے ہیں کہ جن کو ادب کے ہی نہیں، علم وتحقیق کے کتب خانے میں اونچی سے اونچی جگہ دی سکتی ہے، اور دینی چاہیے اور دی جا رہی ہے، یہ ایک بڑی دینی خدمت انھوں نے انجام دی، لوگ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی ذہانت کا یا ادبی قابلیت کا اظہار کیا، نہیں! بلکہ انھوں نے خالص دین کی خدمت انجام دی ہے، جب کسی ملت، کسی قوم اور ملک میں رائج زبان اور مقبول اسلوب بیان اور صحافت وتحریر اور ادب وتحقیق اور علوم دینیہ کے درمیان اور علوم دینیہ کے حاملین کے درمیان خلیج واقع ہو جائے گی، یا بیچ میں خندق واقع ہو جائے گی تو اس وقت دین اپنی بہت کچھ طاقت کھو دے گا، کم از کم نوجوانوں پر سے اس کی گرفت چھوٹ جائے گی۔

اس لیے ہمیشہ خاص طور پر ہمارے ندوۃ العلماء کے طلبہ وفضلاء کو کبھی اپنا رشتہ زبان و ادب سے ٹوٹنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے، کبھی یہ پوزیشن قبول نہیں کرنی چاہیے کہ لوگ انہیں یہ سمجھیں کہ یہ زبان وادب سے ناواقف ہیں، اور یہ وہی مولویانہ زبان لکھتے ہیں اور کلامی اور فقہی

مسائل پر ہی ان کی تحریریں پڑھنے کے قابل ہیں، ادب و زبان کے بارے میں، زبان کی تاریخ کے بارے میں، تنقید کے بارے میں ان کو بولنے کا کوئی حق نہیں، ان کی بات میں وزن نہیں۔

ایک وصیت

یہ میں ایک وصیت کے طور پر آپ سے کہتا ہوں کہ ہمارے ندوۃ العلماء کے مدرسۂ فکر کی خصوصیت رہی ہے کہ اس نے ملک کی زبان وادب سے اپنا رابطہ ورشتہ (ٹوٹنا تو بڑی چیز ہے) کمزور نہیں ہونے دیا، دارالمصنفین کے رفقاء کی تحریر اور مولانا عبدالسلام صاحب کی تحریر، آپ دیکھیے اقبال پر بہترین جو چیزیں لکھی گئی ہیں ان میں ''اقبال کامل'' ہے، اور شعراء و شاعری کی تاریخ میں اس وقت تک جو چیز کلاسیکل سمجھی جاتی ہے وہ ''گل رعنا'' ہے جو ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کی تصنیف ہے، اور ''شعر الہند'' ہے مولانا عبدالسلام صاحب کی، پھر فارسی ادبیات پر اس وقت تک جو چیز سکہ رائج الوقت کی حیثیت رکھتی ہے وہ ''شعر العجم'' ہے، ''شعر العجم'' پر دس تنقیدیں کی جائیں لیکن ''شعر العجم'' کی اہمیت آج تک کم نہیں ہوئی، اور مجھے لاہور کے ایک بڑے فاضل نے سنایا کہ ''تاریخ ادبیات ایران'' لکھنے والے براؤن نے ایک مرتبہ کہا کہ مجھے اردو زبان پڑھنے کی تمنا کبھی کبھی اس لیے ہوتی ہے کہ میں ''شعر العجم'' سے استفادہ کرسکوں، تو یہ خصوصیت اور معیار باقی رہنا چاہیے، ہم ڈاکٹر عبد الرحمٰن رأفت الباشا کا حق سمجھتے ہیں کہ اللہ کے گھر میں بیٹھ کر ایک نماز کے بعد اور دوسری نماز سے پہلے دونوں نمازوں کے درمیان اور خالص دینی علوم کے طلبہ کے سامنے ان کی خدمات کا اعتراف کریں، ان کے لیے دعائے خیر کریں، وہ بڑے اچھے مسلمان، بڑے شریف مسلمان، عالم، بڑے صاحب قلم، بڑے ادیب اور دین کی خدمت کرنے والے تھے، عرصہ تک ان کی یاد تازہ رہے گی، اور انشاء اللہ ان کے جو نقوش ہیں وہ باقی رہیں گے، اور بہت سے لوگوں کی عرصہ تک رہنمائی کریں گے۔ (۱)

(۱) عربی زبان کے مشہور ادیب و مصنف ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت باشا (پروفیسر امام محمد یونیورسٹی، ریاض) کے انتقال پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں ۲۹ رجولائی ۱۹۸۶ء کو منعقد تعزیتی جلسے میں کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا سید عمیر مرتضی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات'' لکھنؤ (شمارہ ۲۵ راگست ۱۹۸۶ء)۔

زبان وادب سے علمائے دین کا رشتہ

زبان وادب میں مہارت کی ضرورت

ہماری تاریخ میں بعض ایسے بھی دور گزرے ہیں جن میں علماء علوم دینیہ کے سمندر میں ڈوبے رہے اوران میں تبحر پیدا کیا، لیکن انھوں نے دنیا سے کوئی ایسا رابطہ قائم نہیں رکھا جس سے زمانہ کے طریقۂ فکر اورنئی نسل کے رجحانات سے واقف ہوں، اورصرف دین کی ترجمانی ہی کا فریضہ انجام نہ دیں بلکہ زمانہ پر اثر انداز ہوں اوراسے صحیح رخ دے سکیں۔ ان اوقات میں علماء سے عوام کا رشتہ کٹ چکا تھا، اور دونوں میں خلیج پیدا ہوگئی تھی جو جدید اورقدیم تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان محاذ آرائی کی شکل میں رونما ہوئی۔

سید صاحب نے فرمایا تھا کہ اس وقت اسلامی ممالک کا حال یہ ہے کہ گاڑی میں دو گھوڑے ایک دوسرے کے مخالف سمت میں جوڑ دیے گئے ہیں، جن میں ایک جدت کی طرف اور دوسرا قدامت کی طرف کھینچ رہا ہے۔ تمام ممالک اسلامیہ میں یہی صورت حال پیش آئی، علماء اپنے حصار میں محصور ہوکر رہ گئے، علمائے ازہر کا بھی یہی حال تھا، وہ اپنے علوم میں متبحر تھے، انہیں سند کا درجہ حاصل تھا، لیکن انھوں نے اپنے کو اس چیز سے بے تعلق کرلیا تھا کہ اس زمانہ میں کون سا اسلوب پسند کیا جاتا ہے، زبان وادب کا کون سا طرز نوجوانوں پر اثر انداز ہوتا ہے، اور جیتی جاگتی زبان میں کس طرح خیالات ادا کیے جاتے ہیں، اس میں کس طرح دلآویزی اور ساحری پیدا کی جاتی ہے، جو دلوں کو موڑ دے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان و ادب کی قیادت اس طبقہ میں چلی گئی جسے یا تو دین کے بہت سے اصولوں سے اتفاق نہیں تھا، اس نے دینی تربیت نہیں پائی تھی، دین کے بارے میں اس کے اندر احترام کا وہ جذبہ نہیں تھا

جوایک دین سماوی کے بارے میں ہونا چاہیے، اور یا تو اپنی مغربی تعلیم کی وجہ سے اور خاص طور سے نپولین کے حملہ کے بعد ایک پوری نسل ایسی پیدا ہوئی جس نے یورپ کا رخ کیا، خصوصاً فرانس کا اور فرانس کا مزاج برطانیہ کے یا دوسرے مغربی ممالک کے مزاج سے مختلف ہے، اس میں زبان کی آزادی اور فکری آوارگی پائی جاتی ہے۔

تو جب یہ نسل اپنے علاقوں میں لوٹی تو اس نے ایسا لٹریچر تیار کیا جو زبان کی شگفتگی اور مغربی چیزوں سے واقفیت اور مستشرقین کے خیالات کی نمائندگی کی وجہ سے بہت زیادہ اثر انداز ہوا، اور اسی کے ساتھ بعض عرب مصنفین نے مستشرقین کے خیالات کو اپنے الفاظ میں پیش کیا، جیسے مارگیولس کی کتاب کا چربہ طہٰ حسین نے ''الشعر العربی'' کے عنوان سے پیش کیا، اور بعض ناقدین نے مقابلہ کر کے دکھایا ہے کہ جو طہٰ حسین نے لکھا ہے، وہ ایک مغربی مصنف کے خیالات لے لیے ہیں اور اچھی عربی زبان میں شگفتہ اسلوب میں منتقل کر دیا ہے۔

اسی طرح ''المرأة المصرية'' کتاب لکھی گئی، اس میں سابقہ بے حجابی اور عورت کی آزادی کی دعوت دی گئی جو مغربی خیالات وتصورات کا نتیجہ تھی، اسی طرح اور بہت سی کتابیں لکھی گئیں جس سے اس موضوع کا پورا لٹریچر تیار ہو گیا، ادھر علمائے ازہر اپنے محدود حصار میں تھے، وہ اس میں نحوی غلطیاں نکالتے تھے اور زبان کی نشاندہی کرتے تھے، اس لیے یہ ادباء تھوڑا سا ڈرتے تھے، لیکن علماء نے اس کا مثبت اور متبادل حل نہیں پیش کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جدید نسل بالکل آزاد ہو گئی اور زبان وادب اور آزاد خیالی دونوں لازم وملزوم چیز ہو گئے۔

پھر زبان وادب اور آزادانہ طریقۂ فکر نے اسلامی اصولوں، اسلامی مسلمات، اور اسلامی نظام معاشرت کے سلسلہ میں ایک متشکک طبقہ پیدا کر دیا، یہ صورت حال بڑی خطرناک تھی، چنانچہ جب بھی اس طبقہ کے ہاتھ میں کوئی قیادت آ گئی، وزارت تعلیم آ گئی، یا اسی طرح وزارت تربیت، وزارت اِعلام آ گئی، تو اس کے اثرات پورے مصری معاشرہ پر پڑے، اور مصر کو چوں کہ قیادت کا درجہ حاصل تھا، اس لیے پورے عالم عربی اور پورے عالم اسلام پر اس کا اثر پڑ رہا تھا، اور ہمارے طالب علمی کے زمانہ میں جب مولانا مسعود عالم

ندوی، مولانا ناظم صاحب ندوی وغیرہ پڑھتے تھے، تو مصر سے جونئی مطبوعات اور کتابیں آتی تھیں، ان سے معلوم ہوتا تھا کہ مصر میں دین کے خلاف کھل کر محاذ آرائی قائم ہوگئی ہے، اس کا اثر جدید فرقہ پر بہت ہی انتشار انگیز ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے علمائے دین نے زبان و ادب کو اپنے مقام سے فروتر سمجھا اور اس پر اپنا اثر ورسوخ اور اس حلقہ میں اپنے احترام کا تصور قائم نہیں کیا، جس کے نتیجہ میں یہ صورت حال پیش آئی۔

ہندوستانی مسلمانوں کی ایک خوش قسمتی

خدا کے فضل سے ہندوستان میں یہ صورت حال پیش نہیں آئی، جیسا کہ میں نے رابطہ ادب اسلامی کے جلسوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ یہاں کے علماء نے کسی دور میں بھی زبان وادب سے اپنے کو غیر متعلق اور بیگانہ نہ ہونے دیا، انھوں نے ایسا نظام تعلیم بنادیا جس نے پڑھے لکھے طبقہ کو پیدا کیا، اس میں دین اور زبان وادب دونوں ملے ہوئے تھے، اس وقت کا نصاب اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ علماء نصاب کی کتابوں کے ذریعہ زبان کی ضروری چیزوں سے واقف ہو جاتے تھے۔

میں آپ کو ایک مثال دوں، دہلی میں مشاعرہ ہونے والا تھا، استاذ ذوقؔ نے شاہ نصیرؔ کی غزل پر غزل کہی اور شاہ نصیرؔ کو دکھائی، شاہ نصیرؔ نے دیکھا تو اس میں ہمسری اور مقابلہ کی کوشش تھی، تو شاہ نصیرؔ نے ایسا طرز اختیار کیا کہ استاد ذوقؔ کو شبہ ہو گیا کہ اس میں خامیاں تو نہیں ہیں، تو انھوں نے اسے شاہ عبد العزیزؒ کے پاس بھیجی کہ حضرت فرمائیں کہ اس میں کچھ خامیاں تو نہیں ہیں، شاہ صاحب نے دیکھا اور یہ کہہ کر بھیج دیا کہ بے تکلف اطمینان کے ساتھ یہ غزل پڑھی جائے، شاہ عبد العزیزؒ کا یہ کہہ دینا کافی تھا، اور اس کے بعد ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ کسی اور کو دکھائی جائے۔ آپ خیال کیجیے کہ استاد ذوقؔ جو بادشاہ کے بھی استاد ہیں، اور صاحبِ 'آب حیات' کے استاد ہیں، اور کتنے استادوں کے استاد ہیں، اور شاہ نصیرالدین کے زمانہ کے استاد ہیں، لیکن صرف ایک خالص عالم دین، محدث وقت، فقیہ دوراں کے محاکمہ پر اطمینان کر لیتے ہیں، یہ خوش قسمتی تھی یہاں کے مسلمانوں کی کہ یہاں کے علمائے

دین زبان وادب اور شاعری کے جدید اسلوب سے الگ نہیں ہوئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہ نئی نسل اس خطرہ سے بچ گئی جس سے دوسری جگہوں پر دو چار ہونا پڑا۔

آپ کو معلوم ہے کہ عمارت اردو کے چار ستون مانے ہوئے علماء ہیں، یعنی علامہ شبلی، مولانا محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا حالی۔ یہ سب طبقۂ علماء سے ہیں، جنھوں نے قدیم نصاب کی کتابیں پڑھیں اور ضروری حد تک دین وادب دونوں سے واقف تھے۔

''الاصلاح'' کا دائرۂ عمل

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ''الاصلاح'' کا دائرۂ عمل صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ تقریر وتحریر میں حصہ لیا جائے، مقالوں میں حصہ لیا جائے، بلکہ اس سے بڑھ کر بیش قیمت معنی میں ملک کی زبان وادب سے ایسا تعلق پیدا کیا جائے کہ دین کے خلاف محاذ آرا اور برسر جنگ نہ ہونے دیا جائے، اور دین کو ایسی زبان اور ایسے اسلوب میں پیش کیا جائے کہ ادبی ذوق رکھنے والا بھی نہ صرف یہ کہ اس کو پڑھنے پر آمادہ ہو، بلکہ اس کو اس میں چاشنی محسوس ہو، اس کا ادبی ذوق اور ادبی حاسہ اس سے غذا حاصل کرے، تو ''الاصلاح'' کو میں مقرروں اور لکھنے والوں کی ایک متوسط درجہ کی جماعت تیار کرنے کا ادارہ ہی نہیں سمجھتا، بلکہ اس سے وسیع تر معنی میں ہمارے علماء ملک کی زبان وادب کے جدید اسلوب سے واقف ہوں، زبان وادب سے ہمارا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے اور صرف ٹوٹنے ہی نہ پائے، بلکہ زبان وادب ہماری ضرورت محسوس کرے اور ہم سے رہنمائی حاصل کرے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج سے پچاس برس پہلے انجمن ترقی اردو کا جلسہ ہو یا کوئی ادبی مجلس، اس بات پر فخر محسوس کیا جاتا تھا کہ اس میں سید سلیمان ندوی شریک ہوں یا مقالہ پڑھیں یا مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اس کی صدارت کریں اور اس میں شرکت فرمائیں، آپ دیکھیے کہ ''گل رعنا'' جو ہمارے والد مولانا عبدالحی صاحب مرحوم کی تصنیف ہے، اور جو ''آب حیات'' کے بعد اردو شاعری کی تاریخ میں ناقدانہ کتاب سمجھی جاتی ہے، اور جس نے ''آب حیات'' کی غلطیوں کا پردہ فاش کیا، ایک عالم دین کی لکھی ہوئی ہے جو خالص قدیم نصاب کی تعلیم کا فاضل تھا۔

اپنے کو زبان وادب سے بیگانہ نہ ہونے دیں

میں خاص طور سے دار العلوم کے فرزندوں سے کہوں گا کہ وہ اپنے کو زبان وادب سے بیگانہ نہ ہونے دیں، اور قلم میں ایسی شگفتگی اور طاقت پیدا کریں کہ جدید طبقہ کو مجبور کردیں کہ وہ ان کی چیزیں پڑھیں، اور یہ نہ سمجھیں کہ ہم دینیات کی کتاب پڑھ رہے ہیں، یا اس وقت ایک خشک کام کر رہے ہیں، بلکہ وہ ان کے ادبی ذوق کا ساتھ دے، ہمارا مطالعہ وسیع ہو۔

سید صاحب فرمایا کرتے تھے ایک صفحہ لکھنے کے لیے سو صفحہ پڑھنے کی ضرورت ہے، وہ کہتے تھے کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں پڑھے لکھے آدمی ہیں، حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ پڑھے کم اور لکھے زیادہ ہوتے ہیں، اس وقت لکھنے والے زیادہ اور پڑھنے والے کم ہیں، قلم اٹھاتے ہیں اور لکھنا شروع کردیتے ہیں، اس کے پیچھے کوئی مطالعہ نہیں ہوتا۔

تو ندوی شعار ہے پڑھ کر لکھنا، لکھ کر پڑھنا نہیں کہ آپ خود ہی لکھیں اور پھر اسی کو پڑھیں، تو پہلی چیز ہے پڑھ کر لکھنا۔

اور دوسری خصوصیت ہے قلم کی شرافت، آپ کا قلم مہذب ہو، شریف ہو، آپ تنقید بھی کریں تو مہذب انداز میں، عامیانہ انداز نہ ہو۔

پھر ایک بات اور یہ کہ کتابیں ترتیب سے پڑھیں، ترتیب سے پڑھنے سے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوگا، اور آہستہ آہستہ صلاحیت بڑھے گی، مطالعہ ایک فن ہے اور ایک ذمہ داری ہے، اس سلسلہ میں اپنے اساتذہ سے مشورہ کریں اور مطالعہ کا طریقہ معلوم کریں، بعض اوقات غلط مطالعہ ایک اچھے خاصے آدمی کو الحاد کے مرحلہ تک پہنچا دیتا ہے۔ (۱)

---

(۱) ۶ / ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ کو دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں جمعیۃ الاصلاح کے افتتاحی جلسہ میں کی گئی تقریر، ماخوذ از "تعمیر حیات"، لکھنؤ، (شمارہ ۱۰ / ستمبر ۱۹۸۷ء)۔

علمی طبقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت پیدا کیجیے!

''الاصلاح'' سے متعلق ضروری باتیں شروع میں کہی جاتی ہیں، اس موقع پر ایک بات ذکر کرتا ہوں، ''الاصلاح'' کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے پڑھے لکھے طبقہ کو مطمئن کرنا، اس وقت مسلمانوں کے خلاف مشترکہ ایک عنوان قائم ہے، بنیاد پرست (Fundamentalist)، جن کا زمانہ گزر چکا ہے، ہم ان کو دین کہیں گے، آئیڈیل اور اخلاق وقیم (Values) کہیں گے۔

آج کل پوری زندگی میں انھیں اصول وضوابط کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے تشدد ہے، انتشار ہے، اس لیے کہ جب کوئی اصول اور حد متعین نہیں ہے، جو دل میں آتا ہے کرتے ہیں۔

آج کا جیتا جاگتا مسئلہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کو جو اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اہلیت رکھتا ہے، اس کو ایمان بالغیب، قرآن و حدیث اور سلف صالحین کی تحقیقات پر اطمینان کروانا ضروری ہے۔

Fundamentalism کی اصطلاح کے خلاف مقابلہ کے لیے آپ کو پوری تیاری کرنی ہوگی، سب سے پہلے تو عقائد صحیح ہوں، مطالعہ راسخ ہو، اور پھر اس کو پیش کرنے کا صحیح طریقہ ہو جس سے وہ متاثر ہوں۔

آج کل کی خرابی ہی یہ ہے کہ نہ اصول ہیں نہ ضوابط، اصول وضوابط پر قائم رہنا دانشمندی اور ہوش مندی کی بات ہے، ہم کو فخر سے کہنا چاہیے کہ ہم Fundamentalist ہیں۔

اب آخر میں ایک بات پھر کہتا ہوں، آپ کے اندر ایسی صلاحیت ہونی چاہیے کہ علمی طبقہ کو متاثر کرسکیں، اور جو اقتدار پر آرہا ہو، اس کو مؤثر ذریعہ سے تحریر وزبان کے ذریعہ سے یہ سمجھا سکیں کہ اسلام کے اصول وضوابط پر عمل پیرا ہونے میں ہی فلاح وکامیابی ہے، یہ اصل

مقصد ہے ''الاصلاح'' کا۔

دوسرے یہ کہ آپ علامہ شبلی نعمانیؒ اور سید الطائفہ سید سلیمان ندویؒ اور دوسرے ندویوں کی تحریر سے واقف ہوں، اور ان کی کتابوں کی حفاظت کریں۔

اور آپ کو جو کتابیں انعام میں ملی ہیں، ان کا انتخاب عمدہ ہے، ان کو حفاظت سے رکھیں، آپ کو ان سے اپنے ساتھی اور یہ دار العلوم یاد آئے گا، اور ممکن ہے جن کے ہاتھوں سے لے رہے ہیں، وہ بھی یاد آئیں، میں مبارکباد دیتا ہوں ان تمام فائزین کو جنھوں نے اپنے آپ کو انعام کا مستحق قرار دیا اور انعام حاصل کیا۔ (۱)

(۱) جمعیۃ الاصلاح، دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک جلسہ تقسیم انعامات میں کی گئی تقریر کا خلاصہ، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۲۵/ مارچ و ۱۰/ اپریل ۱۹۹۳ء)۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) کے قصہ کا پیغام

أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم

بسم اللّٰه الرحمن الرحيم

﴿ إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾ (١)

تقویٰ اور صبر

میرے عزیزو اور بھائیو!

مجھے جو کچھ آپ کے سامنے کہنے کی توفیق ہوگی اور جو کچھ کہنا چاہیے، وہ حقیقت میں اسی آیت کی شرح ہے، اسی آیت کی تفسیر ہے: ﴿ إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾ ۔ میں نے کئی بار عرض بھی کیا کہ ہم سے اگر کوئی کہے کہ فلاں دینی مدرسے، فلاں دینی جامعہ کے صدر دروازے پر ایک بورڈ آویزاں کرنا ہے، ایک تختہ لگانا ہے، اس کے لیے کسی آیت کا، کسی حدیث کا، کسی توجیہ، کسی رہنمائی کرنے والے فقرے کا آپ انتخاب کر دیجیے، تو میں کہوں گا کہ بس یہ لکھ دیجیے: ﴿ إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾ ۔

پھر حضرت یوسف (علیہ السلام) کے قصے میں اس سیاق میں یہ آیت خاص معنی رکھتی ہے، اور یہ معنی کیا ہے؟ یہ ایک دریائے معانی، ایک بحر حقائق اور ایک اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت اور انسان کی کوشش کے بہترین نتائج کا اعلان ہے، کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) اور حضرت یوسف (علیہ السلام) کی زبان سے اس موقع پر یہ آیت جو نکلی ہے، اور بھی خاص معنی اس میں پیدا ہو گئے ہیں، کہ یہ بات ان سے کہی جا رہی ہے جو اتنا جانتے ہیں کہ ہم نے اپنے

(١) سورة يوسف: ٩٠

بھائی یوسف کو حسد میں، ایک نفسانیت کے اثر سے کنویں میں ڈال دیا تھا، اور پھر اس کے بعد کیا انجام ہوا؟ اس کی ان کو خبر نہیں تھی، یا اگر معلوم ہوا ہو کہ قافلہ آیا اور اس قافلہ نے ان کو وہاں سے نکالا، تو اس کے بعد یوسف (علیہ السلام) جس مقام تک پہنچے، اس مقام کا تصور، اس مقام کا تخیل بھی بڑے سے بڑا بلند خیال اور بڑے سے بڑا مفروضات کو سوچنے والا بھی نہیں کرسکتا کہ جس کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے کنویں میں ڈالا تھا، وہ اس وقت کرسی سلطنت پر، کرسی وزارت پر بیٹھا ہوا ہے، اور ہم اس سے مدد لینے آئے ہیں کہ آپ ہمیں کچھ غلہ دلوایئے، ہماری مدد کیجیے، ہم بڑی تنگی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ تو کنویں کی گہرائی، کنویں کی نیچے کی تہہ اور اس کرسی کی بلندی، اِن دونوں میں جو تفاوت ہے، جو فاصلہ ہے، وہ فاصل میلوں کا فاصلہ نہیں ہے، وہ فاصلہ ایک شہر سے دوسرے شہر کا فاصلہ نہیں ہے، وہ فاصلہ موت اور زندگی کا فاصلہ ہے، وہ جگہ تھی کہ جس کے متعلق ہر طرح قیاس کیا جاسکتا تھا کہ وہاں سے وہ جس کو ڈالا گیا وہ نکل نہیں سکتا، اور نکلے گا تو معلوم نہیں کیا اس کو دیکھنا نصیب ہوگا، اور اس کا کیا حشر ہوگا؟

تو اس پورے فاصلے کے طے کرنے کی اور اُس عزت کے ساتھ، اعزاز خداوندی کے ساتھ، اور اجتبائے خداوندی کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی تکریم اور اللہ تعالیٰ کی قدردانی کے ساتھ، اُس فاصلہ کو کامیابی کے ساتھ، کامیابی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے ساتھ طے کر کے، اُس کنویں کی تہہ سے نکل کر، اُس وقت کی دنیا کی متمدن ترین اور وسیع ترین سلطنت کے ایک تخت وزارت پر اور کرسی وزارت پر بیٹھنے کا یہ سارا جو سفر طے ہوا ہے، حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اس کی دو وجہیں بتائی ہیں: ﴿ إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾ یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا - کہ یہ پیغمبر کا مقام ہے، کوئی دوسرا ہوتا تو صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا - کہ میں یوسف ہوں، کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ یا میں وہی ہوں جس کو تم نے کنویں میں ڈالا تھا، نہیں! وہ أنـــا یـوسف کہنے کے بعد کہتے ہیں کہ بات صرف اتنی نہیں کہ میں پیغمبر کا بیٹا ہوں، ﴿ إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾ دو چیزیں ہیں: تقویٰ اور صبر، محظورات سے بچنا، احتیاط سے کام لینا، نفس پر قابو رکھنا، اور اس کے تقاضوں اور اس کی خواہشات کو مغلوب کرنا، اور اس پر قابو پالینا، اور صبر سے کام لینا۔

یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ پورے نظام تعلیم پر، نظام تربیت پر، پورے اصلاحی نظام پر، دعوتی نظام پر، اخلاقی نظام پر، اور یوں کہنا چاہیے پوری تقدیر انسانی پر یہ دو چیزیں حکومت کر رہی ہیں، ان دو چیزوں کا سایہ ہے، اور ان ہی دو چیزوں کے طفیل میں، ان ہی دو چیزوں کے سایہ میں یہ سب چیزیں، یہ سب ادارے، یہ سب شعبے، یہ سب مقاصد کامیاب ہو سکتے ہیں، ترقی کر سکتے ہیں۔

اللہ کا شکر

اب میں آپ سے اس وقت بغیر کسی ترتیب کے وہ باتیں جو اللہ تعالیٰ میرے دل میں ڈالے گا، جس کی توفیق عطا فرمائے گا، کہنا چاہتا ہوں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ آپ میں دو قسمیں ہیں، ایک تو ہمارے وہ عزیز طلبہ ہیں، ہمارے عزیز بھائی اور فرزند ہیں جو یہاں پہلے سے پڑھ رہے تھے اور کسی کو دو سال گزرے، کسی کو چار سال، چھ سال، اور کسی کا ایک سال باقی ہوگا، وہ آئے ہیں، ان سے تو میں کہوں گا کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو زندگی عطا فرمائی، اور توفیق عطا فرمائی، توفیق ان سب چیزوں پر حاوی ہے، صحت، زندگی، صحیح ارادہ، کامیابی، منزل مقصود کو پہنچنا، یہ توفیق ان سب پر شامل ہے، کوئی ایک چیز رکاوٹ بن سکتی تھی، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ آپ اور آپ کے خاندان میں، اور آپ کے مقام پر بھی، اور آپ کے ملک میں بھی کوئی ایسی چیز پیش نہیں آئی، اور اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، جسمانی طور پر بھی آپ کو، ذہنی طور بھی آپ کو، کوئی ایسی رکاوٹ پیش نہیں آئی کہ آپ نہ آ سکتے، اس کا بالکل امکان تھا، اور اس کی صدہا مثالیں ہیں، مدارس کے رجسٹروں میں آپ جا کر دیکھیے، اساتذہ سے پوچھیے، تو ان سے تو میں یہ کہوں گا کہ اس پر شکر کریں۔

شعور اور ایمان واحتساب کے ساتھ عمل

اور خاص طور پر جس چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ کسی فعل کو شعور کے ساتھ کرنے

میں اور بغیر کسی شعور کے کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے، یہ سارے قرآن وحدیث سے، پوری دینی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیت اور شعور کو بہت بڑا دخل ہے، اور یہ وہ حقیقت ہے جس سے اس زمانہ میں بہت غفلت ہوگئی ہے، اچھے سے اچھے کام کیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ اللہ معاف کرے، یہاں تک شبہہ ہوتا ہے بعض لوگوں کے متعلق کہ شاید وہ حج بھی کرآتے ہوں، اور عمرے بھی کر لیتے ہوں، اور حجاز اور دیار مقدسہ جانے والے تو خیر بہت ہیں، لیکن شعور نہیں، نیت نہیں، اللہ کی رضا کی نیت نہیں ہے، ایمان و احتساب نہیں ہے، ملازمتوں کے لیے جاتے ہیں، وہاں سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں، وہاں سے وہ چیزیں جو یہاں نہیں ملتیں آسانی سے ان کو لانے کے لیے، میں نام نہیں لینا چاہتا، اس مجلس میں اور اس مسجد میں ان کا نام لینا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا، ان چیزوں کو لانے کے لیے وہ جاتے ہیں۔

ایک پہلی بات تو یہ ہے کہ میں آپ کا شعور بیدار کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے وہ عزیز، ابھی جن کی تعلیم کی تکمیل نہیں ہوئی، اللہ نے ان کی مدد فرمائی، ان کے والدین کو توفیق دی، یا ان کے ذمہ داروں کو، یا براہ راست ان کو توفیق دی کہ وہ آئیں اور وہ اس پر شکر کریں، اور کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ اس پر دو رکعت شکرانہ کی نماز پڑھیں، کہ اللہ! تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ تو نے ہمیں یہاں پھر آنے کے قابل بنایا، اور توفیق دی، معلوم نہیں نوکری کرنے لگتے، دکان کھول لیتے، کسی دوسرے ملک میں چلے جاتے۔

یہ بھی ایک سلسلہ چل پڑا ہے، کہ کسی عرب ملک میں چلے جاتے ہیں چھوٹی موٹی نوکری کے لیے، کہیں بھی تھانے میں جگہ مل جائے، چنگی میں جگہ مل جائے، کہیں جگہ مل جائے، اس سے بحث نہیں کہ ہم نے کیا مضامین پڑھے تھے، ہم نے کتاب وسنت کا علم حاصل کیا تھا، ہمیں معلوم ہے، ہمارے کتنے عزیز دوست ہیں یہاں کے پڑھے ہوئے ہیں، اور دوسرے مدارس کے پڑھے ہوئے ہیں، کہ وہ خلیج میں جاکر ایسے محکموں میں ملازم ہیں کہ جہاں ڈاڑھی رکھنے کے متعلق بھی ان کو ہدایت ہے کہ ڈاڑھی یہاں رکھنا مشکل ہے، اور جہاں ان کو لباس بدلنے اور معلوم نہیں کن کن چیزوں کو اختیار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، انھوں نے ہم سے

شکایت کی، جب ہمارا سفر ہوتا ہے تو وہ شکایت کرتے ہیں، یہ سب کچھ پیش آ سکتا تھا، ایک بیماری ہی بہت کافی تھی، اللہ آپ کو صحت کے ساتھ رکھے، اس پر شکر ادا کرنا چاہیے، ذہن کو حاضر کرنا چاہیے، یہ نہیں کہ آ گئے آ گئے، اور جیسے تھے ویسے ہی رہے، گویا گئے ہی نہیں تھے، اور پھر پڑھنا شروع کر دیا، تو آپ دیکھیں گے پورے دینیات کے کتب خانہ میں، دینیات کے دفتر میں، شعور کو بیدار کرنے اور نیت کو حاضر کرنے اور اللہ کی رضا کو طلب کرنے پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ یہ دین کا ایک مستقل باب ہے، اور اس سے بڑی غفلت برتی جا رہی ہے۔

سچی بات یہ ہے، ایک ادائے فرض اور شکر کے طور پر میں کہتا ہوں کہ اس کی طرف توجہ میری حضرت مولانا محمد الیاس صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے یہاں جا کر خاص طور پر ہوئی، میں جب وہاں حاضر ہوا، یہاں حدیث کا درس بھی دیتا تھا، بخاری شریف کا درس بھی دیا ہے، اور غالباً ابوداؤد کا درس بھی دیا ہے، اور قرآن شریف کا تو درس دیتا تھا، لیکن ان کے یہاں جا کر میں نے دیکھا کہ وہاں اس پر خاص زور ڈالا جاتا ہے کہ وضو اور نماز سے لے کر جتنے کام کیے جائیں وہ ذہن کو حاضر کر کے اور رضائے الٰہی کی نیت سے کیے جائیں، اس کو ایماناً واحتساباً کے لفظ سے حدیث میں تعبیر کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ چیزیں جن کی شکل، جن کی حقیقت اور جن کی ساخت ہر چیز بالکل دین کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے، کہ اس میں ذرا شبہ نہیں کیا جا سکتا، وہاں بھی کہا گیا ہے: "مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيْمَاناً وَ احْتِسَاباً"، اب کوئی کہے کہ بھلا رمضان کے روزے، اس میں کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ اگر کوئی کہے کہ بازار جو جائے، کسی غریب کی مدد کرے، سودا خرید کر کے لائے، یا کوئی کسی کا کام کر دے، تو جو وہ اللہ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے اور اس کے اجر وثواب کی لالچ میں- یہ مولانا الیاس صاحب کا ترجمہ ہے- اجر وثواب کی لالچ میں کرے تو ٹھیک سمجھ میں آتا ہے، لیکن روزہ؟ روزہ تو رکھا ہی اسی نیت سے جاتا ہے، روزہ تو خالص عبادت ہے، اس کے ساتھ بھی کہا گیا، یہ نبی ہی کا مقام تھا، اور نبی ہی کا منصب تھا، اور نبی ہی کی خصوصیت تھی کہ وہ یہ کہے، دوسرا مصلح، کوئی دوسرا دینی پیشوا، کوئی عالم دین شاید اس کا ذہن بھی ادھر نہ جاتا کہ روزے کے ساتھ یہ شرط لگائیں کہ "مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيْمَاناً وَ احْتِسَاباً"۔

ایک واقعہ

ہم نے آپ کو سنایا ہے کہ ہماری یہاں لکھنؤ سے تقریر ہوئی، بہت شروع شروع میں جب ریڈیو قائم ہوا ہے، تو ہماری ایک تقریر یہاں رکارڈ کر لی گئی، ہم ایک بڑے لمبے سفر پر چلے گئے، افغانستان کی سرحد قریب تک ہم کو جانا تھا، تو وہاں کوئٹہ میں رمضان کی پہلی یا دوسری تاریخ پڑ گئی، تو وہاں کے ایک بڑے افسر نے جو ہندوستانی تھے، انھوں نے ہماری افطار کی دعوت کی، وہ تقریر سن کر کے آرہے تھے، انھوں نے کہا: مولانا! آپ کی تقریر سن کر ہم آرہے ہیں، بہت خوب تقریر کی اور آپ نے بڑی ضروری باتیں کہیں، ایک بات آپ نے نہیں کہی کہ افطار کرنے میں جو مزہ آتا ہے، وہ کسی چیز میں مزہ نہیں آتا، میں تو روزہ رکھتا ہی اسی لیے ہوں، میں تو روزہ ہی اس لیے رکھتا ہوں کہ افطار میں جو مزہ آتا ہے، اس وقت پانی پینے میں، یا کھانے میں جو مزہ آتا ہے، وہ کسی چیز میں نہیں آتا۔ تو صفائی سے کہہ دیا، بعد میں ہمیں ان کے دوستوں نے بتایا کہ یہ اتھیسٹ (Atheist) ہیں، یہ تو بے دین ہیں اور روزہ رکھتے ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ روزہ رکھا جائے اور نیت نہ ہو، مگر یہ بات نبی ہی کہہ سکتا تھا، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مامور ہے، اور وحی سے اس کی رہنمائی کی جارہی ہے، پھر "مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيْمَاناً وَ احْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ"، شب قدر میں بغیر ایمان واحتساب کے کون اٹھے؟ لیکن اٹھتے ہیں، ایسے آپ تلاش کریں تو آپ کو ایسے لوگ مل جائیں گے کہ جن کی سرنے سے کوئی نیت ہی نہیں ہوتی، سب لوگ اٹھے تھے ہم بھی اٹھ گئے، یا کوئی تکلیف تھی، یا نیند نہیں آرہی تھی، یا اس کے بعد آگے بڑھ کر بات یہ ہے کہ لوگ کہیں کہ یہ بھی بڑے شب بیدار ہیں۔

تو اس لیے ایک بات تو یہ ہے کہ جو یہاں پہلے سے پڑھ رہے تھے، اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنی تعلیم کی تکمیل اور صحیح فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے، ان سے بھی ہم یہ کہیں گے کہ اس پر شکر کریں، ذرا ذہن کو حاضر کرلیں، شکر کریں کہ کوئی مانع پیش نہیں آیا، اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہاں بھیجا، تو ان کے تعلیمی اشتغال اور مطالعہ میں ایک برکت ہوگی، اور تائید الٰہی ہوگی کہ

شعور کے ساتھ وہ شروع ہوا ہے اور نیت کے ساتھ شروع ہوا ہے۔

اور ہمارے جو عزیز بھائی پہلی مرتبہ آئے ہیں، ان سے تو ہم یہ کہیں گے کہ ان کو تو بہت ذہن کو حاضر کر کے نماز شکرانہ پڑھنی چاہیے، دو رکعت کم سے کم پڑھیں، اور اللہ کا شکر کریں کہ بالکل ممکن تھا کہ ہم کو کسی اسکول میں بھیج دیا جاتا، کسی انگلش میڈیم اسکول میں بھیج دیا جاتا، کسی ہندی اسکول میں بھیج دیا جاتا، کسی کام پر لگا دیا جاتا، کوئی پیشہ سیکھنے کے لیے ہمیں کہیں بٹھا دیا جاتا، اور کچھ نہ ہوتا تو کوئی بیماری مانع بن جاتی، یا ماں باپ کی محبت مانع بن جاتی، سب ہو سکتا تھا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہاں آنے کی توفیق دی، اس پر استحضار ہونا چاہیے، ذہن کو حاضر کرنا چاہیے، تو اس سے بہت بڑا فرق ہوگا، تو ان سے تو یہ کہ اس پر اللہ کا شکر ادا کریں، زبان سے الحمد للہ اس نیت کے ساتھ کہیں، دل کی گہرائی سے الحمد للہ کہیں، اور انجام کو سوچیں کہ اگر ہم اور کسی لائن میں جاتے تو کیا انجام ہوتا؟ کہ ہم کو صحیح عقائد کا بھی علم نہ ہوتا، اور عقائد کا علم ہوتا تو ان عقائد پر ہمارا کوئی ایمان وعقیدہ نہ ہوتا، ہم کو فرائض کا علم نہ ہوتا، ہم کو اپنے پڑوسیوں، عزیزوں کی عاقبت کی فکر نہ ہوتی، ہم کو ملک میں جو حال ہو رہا ہے، جس خطرہ میں یہ ملک مبتلا ہو رہا ہے، اور اس کا سامنا کرنے جا رہا ہے، اور جو یہاں اسلام کا بظاہر انجام نظر آتا ہے، کہ کہیں یہ ملک اسپین تو نہیں بن جاتا، ہمیں ان باتوں میں سے کسی چیز کی پرواہ نہ ہوتی، بلکہ ممکن ہے کہ ہم اس مخالف لشکر میں، اس مخالف محاذ میں ہم شریک ہوتے، تو اس کو، ذہن کو حاضر کر کے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اس سے فرق پڑے گا ان شاء اللہ آپ کے پڑھنے میں، آپ کے فہم میں، اور انتفاع میں اور اس وقت کے انتفاع میں بھی اور آئندہ بھی اُس سے کام لینے میں فرق پڑے گا، ایک بات تو یہ کہتا ہوں۔

اخلاص اور اختصاص

اب اس کے بعد یہ کہتا ہو کہ میں نے بہت دنوں سے ایک عنوان بنایا، بہت سے مدارس میں خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے، تو میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارے دینی مدارس کے طلبہ کو دو چیزوں کی ضرورت ہے: اخلاص - اختصاص۔

ایک تو اخلاص ہو کہ ہم اللہ کی رضا کے لیے، اللہ کے احکام ومنشا کو معلوم کرنے کے لیے، اور ضلالت سے بچنے کے لیے، اور قیامت کے خطرات سے، عذاب جہنم اور دوسرے اھوال سے بچنے کے لیے ہم یہ علم پڑھ رہے ہیں۔

اور دوسری یہ کہ اختصاص ہو، یعنی آپ استعداد پیدا کریں اور آپ کسی ایک علم کو اپنا خاص موضوع، مرکزی موضوع بنا کر محنت کریں۔

سب علوم ہیں، اور یہ ہمارا نظام تعلیم جو ہے، قدیم دینی تعلیم، اس میں علوم میں باہمی تعاون بھی ہے، اور ایک کا دوسرے پر انحصار بھی ہے، اور یہ علوم ایک دوسرے کے معاون بھی ہیں، تو اس لیے یہاں یہ تفریق نہیں ہے کہ اگر ادب ہے تو دین نہیں، اور دین ہے تو ادب نہیں، اور ادب ہے تو فلاں، نثر ہے تو نظم نہیں، نظم ہے تو نثر نہیں، یہ سب کچھ نہیں، تو یہ پورا ایک مجموعہ، پورا اجتماعی نظام جو ہے دینی تعلیم کا، اُس میں اُس سب میں ہم مشارکت پیدا کریں گے، اور اُن کا علم ہم حاصل کریں گے، اُن پر قدرت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے، اُس موضوع کی کتابوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت پیدا کریں گے، اور بلکہ اس میں صاحب تصنیف اور صاحب تعلیم اور صاحب توجیہ بننے کی کوشش کریں گے، لیکن کسی ایک فن کو اپنا خاص موضوع بنائیں گے، اور اس میں اختصاص پیدا کریں گے۔

تو ہم کہا کرتے ہیں کہ اخلاص و اختصاص، یہ دو چیزیں ہمارے مدارس کے لیے دو بڑے عنوان ہیں، کہ تمام علوم کے بارے میں تو اخلاص کا معاملہ، پورے نظام تعلیم کے بارے میں اخلاص کا معاملہ، اللہ کی رضا کے لیے ہم پڑھ رہے ہیں، اسلام کے احکام کو، اسلام کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے، اور اس کو جذب کر لینے کے لیے، اور اس پر اپنے ایمان کو علی وجہ البصیرۃ قائم کرنے کے لیے، پھر اس کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہم یہ پڑھ رہے ہیں، نہ ہمیں نوکری مقصود ہے، نہ عزت مقصود ہے، نہ دولت مقصود ہے، اللہ دے دے اور وہ بھی اگر کسی درجہ میں جا کر ضروری بھی ہو تو اس کے لیے کوشش کرنا بھی کوئی حرام نہیں ہے، لیکن مقصود اصلی یہ نہیں ہے۔

فقہ کی طرف امتیازی توجہ کی ضرورت

تو ایک تو اخلاص ہو، اور دوسرے اختصاص ہو، کسی موضوع کو اپنا مخصوص، اختصاصی موضوع بنا کر اس میں کوشش کرنا، تفسیر کو لے لیجیے، حدیث کو لیجیے، اور فقہ کے متعلق آج کل یہ خیال بار بار میرے ذہن میں آتا ہے کہ ہمارے دارالعلوم میں فقہ کی طرف جتنی توجہ ہونی چاہیے، اتنی توجہ نہیں ہے، اور کچھ شروع سے ایسی روایت چلی آرہی ہے کہ جو استحضار ہونا چاہیے اور تحقیق ہونی چاہیے، مسائل پر نظر ہونی چاہیے، اور افتاء کی جو صلاحیت ہونی چاہیے، اس کی کمی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ایک وصیت

تو اس کو میں کل یا پرسوں بھی کسی موقع سے بیان کر رہا تھا، ہمارے اور آپ کے سب کے استاد مخدوم، فخر زمانہ اور فخر ہندوستان اور فخرِ عالمِ اسلام حضرت علامہ سید سلیمان ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) یہاں ڈھاکہ سے تشریف لائے، وہ بہت دل شکستہ تھے، ان کے ساتھ یونیورسٹی میں ایک بہت نامناسب واقعہ پیش آیا تھا، ہماری یہاں ٹھہرے، آخر میں ہماری یہاں، ہمارے بڑے بھائی صاحب کے پاس ٹھہرتے تھے، تو دیکھا کہ مسکراہٹ آتی ہی نہیں تھی ان کے لبوں پر، اور ایک حزن کی کیفیت ان کے چہرے پر طاری تھی، تو وہ ہمارا بہت خیال کرتے تھے، اس لیے کہ والد صاحب کے شاگرد بھی تھے، اور ان کے زمانۂ نظامت میں اور ان کے زمانۂ ذمہ داری میں انھوں نے یہاں تعلیم حاصل کی تھی، تو میں نے عرض کیا ان سے کہ سید صاحب! آپ کا طلبہ سے کوئی خطاب ہو جانا چاہیے، انھوں نے ایک دو مرتبہ تو مناسب الفاظ میں ٹال دیا کہ نہیں، پھر میں نے دو تین مرتبہ کہا تو کہا: اچھا، یہیں اسی مسجد میں ان کا خطاب ہوا، اور انھوں نے فرمایا کہ فقہ کی طرف توجہ کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

انھوں نے جب دارالمصنفین چھوڑا، تو وہ بھوپال گئے تھے، اور دارالقضاء کے وہ نگران اعلیٰ اور گویا سب سے بڑے قاضی اور اس کے صدر تھے، ان کو بہت تجربہ ہوا، پھر جب وہ پاکستان گئے تو ان کو اور مزید تجربہ ہوا، تو یہ بات انھوں نے فرمائی، اور گویا یہ ان کی وصیتوں

میں سے ایک وصیت ہے، لیکن اس کے بعد نہ ان کو یہاں تشریف لانے کی نوبت آئی، اور نہ خطاب کرنے کی۔

آپ کو سب سے زیادہ فقہ سے واسطہ پڑے گا

تو ایک بات تو یہ آپ سے کہتے ہیں کہ آپ کو سب سے زیادہ جس چیز سے واسطہ پڑے گا، وہ فقہ کا علم ہے، کہ آپ جب جس گاؤں میں ہوں گے، جس محلّہ میں چھوٹا ہو یا بڑا ہو، وہاں کوئی نہ کوئی مسئلہ ایسا پیش آئے گا کہ لوگ آپ سے مسئلہ پوچھنے آئیں گے کہ صاحب! نماز میں یہ غلطی ہوگئی، کیا سجدۂ سہو کرنا چاہیے تھا؟ یا دوبارہ نماز پڑھنی چاہیے؟ یہ نماز صحیح ہوگئی؟ اور کوئی زکوٰۃ کا مسئلہ پوچھے گا، کوئی میراث کے متعلق مسئلہ پوچھے گا، اور کوئی طہارت وغیرہ کے متعلق پوچھ سکتا ہے۔

تو ایک بات تو آپ سے یہ کہنا ہے کہ فقہ کی طرف آپ ایک امتیازی توجہ کریں، اور اب ماشاء اللہ یہاں دارالقضاء بھی قائم ہوگیا ہے، اور وہاں تربیت کا بھی کوئی نظام ہوگا، اور وہاں مقدمات بھی آتے ہیں، تو اس سے آپ مناسبت پیدا کریں، یہ مناسبت ہمارے یہاں بہت کم ہوگئی۔

علوم قرآن میں اختصاص

پھر اُس کے بعد قرآن مجید ہے، قرآن مجید کا اعجاز، قرآن مجید کا اس زندگی پر انطباق، اور قرآن مجید سے عدول کی جو اس وقت پوری نسل انسانی کو اور ہمارے ماحول کو جو سزائیں مل رہی ہیں، اور قرآن مجید ہی جو دنیا اور آخرت میں ایک کامیاب زندگی کا ضامن ہے، اور پھر اس کا معجزانہ اسلوب اور ایک ایک لفظ کا معجزہ ہونا، اور اس کی پیشین گوئیاں اور اس کی اخلاقی تعلیمات، ان ساری چیزوں سے آپ کو ایک زندہ مضمون کی طرح، ایک کتابی مضمون کی طرح نہیں، بلکہ ایک زندہ حیاتی مضمون کی طرح، حَیَوی مضمون کی طرح اور ایک عملی مضمون کی طرح آپ کی توجہ ہونی چاہیے۔ اللہ کے فضل سے، اللہ نے آپ کو ایسے استاد بھی عطا کیے

ہیں جو آپ کی اس میں مدد کر سکتے ہیں اور آپ کو روشنی دے سکتے ہیں۔

فن حدیث میں اختصاص پیدا کریں

پھر اس کے بعد حدیث کا فن ہے، حدیث کے فن کو بہت تیزی سے زوال آرہا ہے، اور ہندوستان جو مرکز بن گیا تھا، اخیر میں یمن مرکز تھا، ہماری نظر ہے تاریخ پر اور ممالک عربیہ کی تاریخ پر، یمن مرکز بن گیا تھا، پھر اس کے بعد حجاز مرکز بنا، اسی زمانے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی حجاز گئے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حجاز گئے، وہاں سے علم حدیث لے کر آئے، پھر یمن کے اساتذہ وشیوخ یہاں آئے، شیخ حسین بن محسن انصاری آئے اور ہندوستان کے بڑے بڑے عالم ان کے شاگرد ہوئے، اور اس میں ایک نئی طاقت اور انجذاب پیدا ہوا۔

تو حدیث کا فن بھی بہت تیزی سے زوال کی طرف جارہا ہے، اس کی طرف بھی آپ کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے، اس کے جو مقدمات ہیں ان کو اچھی طرح سے پڑھیں، اور پہلے سے تیار ہو کر جائیں، اور اس کے بعد بھی مطالعہ کریں، اور احادیث کی شروح بھی دیکھیں، اور اس میں پھر محدثین کے حالات سے واقفیت آپ کو ہونی چاہیے، بڑی کتابیں تذکرۃ الحفاظ وغیرہ پڑھیں، لیکن کم از کم شاہ عبدالعزیز صاحب کی بستان المحدثین، اور پھر اس کے بعد آپ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی چیزیں پڑھیں، اور حدیث کو بحیثیت فن کے، اور ایک بہت بڑے مکتبہ کے، ایک بہت بڑے مستقل کتب خانہ کے آپ اس سے تعلق اور مناسبت پیدا کریں، اور اس سے ایسا تعلق خاطر پیدا کرلیں کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو موقع دے تو آپ جا کر اس کا درس دے سکیں۔

آج بڑے بڑے مدرسوں میں مسندیں خالی ہو رہی ہیں، اس وقت نام لینے کی ضرورت نہیں، کہ جہاں افغانستان اور صوبہ سرحد اور اب جو پاکستان کہلاتا ہے، اور ہندوستان کے آخری کنارے اور جو بنگلہ دیش کہلاتا ہے، جہاں وہاں سے طلبہ آتے تھے ان سے پڑھنے کے لیے اور استفادہ کے لیے، اور عرب تک آتے ہوں، تعجب نہیں، آج وہاں ان کے درجہ کے لوگ نہیں ہیں، اور تقریباً پورے ہندوستان کا حال یہ ہو رہا ہے، تو حدیث میں بھی

اختصاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

صرف ونحو میں رسوخ پیدا کریں

اور پھر اس کے بعد سب کے جو مقدمات ہیں، صرف ونحو میں آپ کو رسوخ ہو، آپ اس پر پورے طور پر حاوی ہوں، اور عبارت صحیح پڑھنا تو معمولی بات ہے، جو نحوی توجیہ ہے اور صرفی توجیہ ہے اور تصحیح ہے، اور اس میں جو نزاکتیں ہیں، ان سب کو آپ سمجھتے ہوں، اس چیز کی طرف بھی آپ کو توجہ کرنی چاہیے۔

عربیت کی طرف توجہ کی ضرورت

اور ایک بات میں یہ کہوں گا کہ عربیت کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ عربیت ندوہ کا گویا ایک امتیازی نشان ہے، اور گویا ایک موروثی چیز ہے، وہ چلی آرہی ہے، اس لیے اس کا نام لیا جاتا ہے، یہ گویا یہاں کا ایک افتخار بن گیا ہے، باقی اس کی کوئی اور قدر و قیمت اور اس کے فوائد ذہن میں نہیں ہیں، یہ بات نہیں ہے، عربی زبان قرآن مجید کے اعجاز کو سمجھنے کے لیے، بلکہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے، اعجاز تو بڑی چیز ہے، قرآن مجید کے فہم کے لیے، حدیث کے فہم کے لیے، فقہ کی باریکیوں اور جو مجتہدین کے آراء ہیں، اور ان کے فتاویٰ ہیں، ان کے فیصلے ہیں، اُن کے فرق کو سمجھنے کے لیے، اُس فرق کے مبنیٰ کو سمجھنے کے لیے جو بعض مرتبہ الفاظ پر موقوف ہوتے ہیں، اُس سب کے لیے صرف ونحو میں پوری کامل استعداد حاصل کرنی چاہیے، اور اس میں آج کل عام طور پر بہت ہی گراوٹ اور ایک انحطاط پیدا ہو گیا ہے کہ مدارس کے لوگ آتے ہیں اور ہمیں ہمارے امتحان لینے والے اساتذہ بتاتے ہیں کہ دو سطر بھی صحیح عبارت نہیں پڑھ سکتے۔

دوسری بات یہ کہ اس کی قدر و قیمت، کہ اس وقت عالم اسلام میں ممالک عربیہ کئی حیثیتوں سے، ممالک عربیہ پہلے تو اسلام کا مرکز تھے، خاص طور سے حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب، لیکن اب بھی ممالک اسلامیہ دین کا سرچشمہ، دین کا مرکز ہیں، اور دنیا کی سیاست

میں اور اسلام کے مستقبل میں، اسلام کی آئندہ تاریخ میں اور مستقبل میں ممالک اسلامیہ کو بہت بڑا رول، بہت بڑا کردار ادا کرنے کا موقع ہے، اور موقع رہے گا، اور اس کی اہمیت رہے گی، اور یورپ وامریکہ کی جیسی نظر ممالک عربیہ پر ہے، اور ممالک عربیہ کے افساد پر ہے، ممالک عربیہ میں بے دینی پیدا کرنے پر ہے، ممالک عربیہ میں اسلام پر اعتماد کھو دینے، اسلام پر سے اعتماد اٹھ جانے کی صلاحیت پیدا کرنے اور اس کے لیے نئی نسل کو تیار کرنے کے جیسے منصوبے امریکہ اور یورپ میں ممالک عربیہ کے لیے تیار ہو رہے ہیں، میں اپنی عملی واقفیت اور اپنی سیاحتوں کی بنا پر اور اپنے ان حلقوں سے تعلق کی بنا پر کہتا ہوں کہ ویسی توجہ یورپ وامریکہ کی نہ پاکستان پر ہے، نہ ایران پر ہے، اور نہ ہندوستان پر ہے۔

تو ان ممالک عربیہ میں ایسے فتنے اٹھ سکتے ہیں، ایسی تحریکیں پیدا ہو سکتی ہیں، ایسے رجحانات پیدا ہو سکتے ہیں کہ ان میں ضرورت ہے ان کا مقابلہ کرنے کی، اور عربوں کو ان کی زبان میں متاثر کرنے کی، اور ان کے ذہن کو بدلنے کی، اور یہ اتنا بڑا دعوتی کام بلکہ اتنا بڑا انقلابی کام، اتنا بڑا اپنے وقت کا جہاد، اپنے وقت کی عبادت ہوگی کہ جس سے روح نبوی کے خوش ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔

سب سے بڑھ کر فخر و شکر کی بات

میں آپ سے مسجد میں بیٹھ کر کہتا ہوں کہ روح نبوی جس سے سب سے زیادہ شادماں ہوگی، وہ یہ ہے کہ جن کے صدقے میں آپ کو ایمان ملا ہے، جن کے طفیل میں آج آپ مسلمان ہیں، جنھوں نے آپ کو کلمہ پڑھایا ہے، آپ اگر وہاں کوئی ضلالت پیدا ہو رہی ہو، تو آپ کے لیے اِس سے بڑھ کر کوئی توفیق کی بات، اِس سے بڑھ کر کوئی فخر و شکر کی بات، اِس سے بڑھ کر اگر لفظ غلط و بے محل نہ ہو تو کہوں، اس سے بڑھ کر معراج نہیں ہو سکتی، وہ معراج تو معراج آسمانی تھی، لیکن میں اس معراج زمینی کے متعلق کہتا ہوں، میں اس معراج اصلاحی کے متعلق کہتا ہوں، میں اس معراج علمی کے متعلق کہتا ہوں، اس سے بڑھ کر کوئی معراج نہیں ہو سکتی، اللہ اکبر! ماں باپ نہیں، اجداد کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے، اجداد اگر اس پر فخر کریں

اور عالم برزخ میں بھی شکر کریں کہ اللہ نے ہمارے بیٹے اور پوتے کو توفیق دی کہ یہ مصر جا کر، یہ شام جا کر، یہ حجاز مقدس جا کر وہاں کی کسی غلط چیز کو غلط کہتا ہے، اور وہاں ان کے سامنے ایسی تقریر کرتا ہے، اور ان کے سامنے ایسی تحریر پیش کرتا ہے جس سے ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے، اور جن سے ان کے اندر غیرت پیدا ہوتی ہے، کہ ہم نے یہ مستشرقین کا یہ اثر قبول کرلیا، ہم نے مغربی تہذیب کا یہ اثر قبول کرلیا۔

یہودی دماغ اور عیسائی وسائل بمقابلہ اسلام

آج یاد رکھیے، ابھی جب آپ کا مطالعہ بڑھے گا، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت یہودی، یہودی دماغ اور عیسائی وسائل اور طاقت و اقتدار، اور امریکہ اور برطانیہ کے تجربات، سیاسی تجربات، انقلاب لانے والے والے تجربات، سب اس وقت اس بات پر تل گئے ہیں اور ان کی ساز باز ہوگئی ہے کہ اسلام کے مستقبل کو مشکوک بنادیا جائے، بلکہ اس کو بالکل ختم کردینے کی کوشش کی جائے، انھوں نے اپنے مطالعہ سے یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر اسلامی بیداری کو اسی طرح بڑھنے دیا گیا، تو دوبارہ دنیا اسلام کے قبضہ میں چلی جائے گی، یہ نهضة ثانية ہے، اس لیے اس کو روکنے کے لیے وہ تدبیریں کی جارہی ہیں جہاں آپ کا دماغ نہیں پہنچ سکتا۔

میں انگلستان جاتا رہتا ہوں، ہر سال جاتا ہوں، امریکہ بھی جانے کا موقع ملا ہے، اور دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت پوری یہودی ذہانت اور پوری مسیحی طاقت اس پر اکٹھا ہوگئی ہیں کہ ممالک عربیہ میں قومیت عربیہ کی تحریک پیدا کی جائے۔ جو البعث العربي کے نام سے پہلے شروع ہوچکی ہے۔ اور مغربی تہذیب کو اختیار کرنے کی دعوت پیش کی جائے، اور مادیت کی، اور دولت پرستی کی، اور حدود شرعیہ اور احکام الٰہیہ سے انحراف کی، اور اگر ہوسکے تو بغاوت کی کوشش کی جائے۔

سب سے بڑی سعادت

تو آپ کی یہ سب سے بڑی سعادت ہوگی کہ آپ عربی زبان میں مشق اس نیت سے

پیدا کریں کہ آپ وہاں جائیں گے، میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں، اللہ مجھے معاف فرمائے، اللہ مجھے معاف کرے، اور مؤاخذہ نہ فرمائے، لیکن اس وقت آپ کے فائدہ کے لیے کہتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ تمھیں اپنی عمر میں سب سے بڑی عزت کا کون سا موقع حاصل ہوا ہے؟ اور تم سب سے زیادہ کس بات پر خوش ہوئے ہو، تم نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے؟ تو میں آپ سے اس وقت کہتا ہوں کہ میں ایک مرتبہ مکہ معظّمہ گیا، اور جایا کرتا تھا، ہر سال جایا کرتا ہوں، اور میرے جانے کی سب کو خبر بھی نہیں ہوتی، جمعہ کا دن آیا، جمعہ کی نماز کا وقت آیا، اور میں گیا تو خطیب حرم شیخ عبداللہ الخیاط نے جو بڑے فاضل تھے، انھوں نے اپنے خطبہ میں میری تحریر کا ایک اقتباس پڑھا، پوری تحریر کا ایک پورا اقتباس پڑھا، یقول أحد الفضلاء، یقول أحد المفکرین کچھ اس طرح کہہ کر، تو مجھے یاد آ گیا کہ یہ میری فلاں تحریر کا، ماذا خسر العالم کا، یا کسی فلاں کتاب کا اقتباس ہے، تو میں نے کہا: اللہ اکبر! رائے بریلی کا دیہاتی، رائے بریلی کا اردو بولنے والا، جو ذہانت میں، محنت میں، کسی چیز میں کوئی فوقیت نہیں رکھتا، اس نے ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی، اور عرب استادوں سے پڑھا، اور آج وہ اتنے بڑے مجمع میں، اور اللہ تعالیٰ کی سب سے محبوب ترین زمین میں، حرم شریف میں، بیت اللہ شریف کے سامنے جو خطبہ دیا جا رہا ہے، جس سے بڑھ کر کسی فرمانروا کا کوئی خطاب، کسی شہنشاہ کا کوئی خطاب نہیں ہو سکتا، وہ خطیب جو ممبر پر کھڑا ہے، وہ جو خطاب دے رہا ہے، اس کے برابر دنیا میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا، اس کلام میں مجھ جیسے ہندی کی عبارت شہادت کے طور پر نقل کی جا رہی ہے، تو اس سے مجھ پر جو اثر ہوا، وہ آج تک مجھے یاد ہے۔

پھر اس کے بعد اتفاق سے دوسرے دن یا تیسرے دن، یاد نہیں، یا اسی دن وہاں کے رئیس المطوفین جو ہندی الاصل تھے، شاید بھوپال کی طرف کے تھے، انھوں نے دعوت کی، تو اس میں کئی علماء کو بلایا، اور خطیب صاحب کو بلایا، اور مجھے بھی بلایا، تو میں نے کہا کہ فضیلۃ الشیخ! آپ نے خطبہ میں ہماری ایک عبارت پڑھی، ہمیں بڑی خوشی ہوئی، اور بہت شرم بھی آئی، بہت فخر ہوا، کہنے لگے کہ میں تو کئی مرتبہ تمہاری عبارتیں پڑھ چکا ہوں، پہلے نام لے کر پڑھا کرتا

تھا، پھر حکومت کی طرف سے اشارہ ہوا کہ نام نہ لیا کرو، تو اب میں بغیر نام کے پڑھتا ہوں۔

تو بھائی! تم بتاؤ، میرے عزیزو! میرے فرزندو! بھائیو! تم بتاؤ، اس سے بڑھ کر دنیا میں فخر کی، اس سے بڑھ کر دنیا میں شکر کی کوئی بات ہو سکتی ہے، کہ تم عربوں کو جا کر خطاب کرو، تم عربوں کو جا کر اس دین کی دعوت دو، جو دین وہیں کے ذریعہ سے آیا اور تمام دنیا میں پھیلا ہے، اور ان کی زبان میں دعوت دو اور وہ متاثر ہوں، اور وہ اس میں کوئی عیب نہ نکال سکیں، یہ چیزیں تم کو حاصل ہو سکتی ہیں، کوئی ہماری خصوصیت نہیں، ہم تو کسی حیثیت سے بھی، ہم کوئی اپنے ساتھیوں میں بھی اپنے زمانے میں بھی تفوق نہیں رکھتے تھے، ایاز قدر خود را بشناس، لیکن یہ اللہ کا فضل اور ہمارے سرپرستوں کا اخلاص اور دعائیں تھیں کہ جو اللہ نے اس قابل کیا۔

اور یہ تو حرم شریف کا ذکر ہے، اس لیے کہہ دیا، ورنہ چوٹی کی جو جگہیں ہو سکتی ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ نے خطاب کرنے کا موقع دیا، جہاں چوٹی کے ادباء اور خطباء اور فضلاء جہاں موجود تھے، دمشق میں وہاں کی یونیورسٹی کے ہال میں ہماری تقریر ہوتی تھی، اور ہم نے دیکھا ہے اور اب یہ اس وقت کہہ رہے ہیں، اللہ معاف کرے، دیکھا ہے کہ وہ لوگ جن سے ہم استفادہ کر سکتے تھے، یعنی شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء، شیخ معروف الدوالیبی، علامہ بھجۃ البیطار اور محمد المبارک تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلے آرہے ہیں کہ آج کا خطبہ فوت نہ ہو جائے، اور کوئی ہمارا مقالہ جو رجال الفكر و الدعوة في الإسلام میں چھپے ہیں، پہلی جلد جو ہے، وہ اصل میں وہاں پڑھے ہوئے خطبات ہیں، سوائے آخری خطبہ کے جو مولانا روم پر ہے، تو اس کے لیے اس طرح آتے تھے جیسے طالب علم آتے ہیں، ہال بھر جاتا تھا، پھر رمضان المبارک آگیا، اور مغرب کے بعد ہمارا محاضرہ ہوتا تھا، اب آپ خیال فرمائیے، یہاں کوئی بڑے سے بڑا محترم آدمی بھی اگر رمضان میں مغرب کے بعد کوئی تقریر کرے، تو اس کی سننے کے لیے کون آئے گا؟ مغرب کے بعد تیاری ہوتی ہے تراویح کی، اور کھا پی کر کچھ آرام کر لینے کی، لیکن ہم دیکھتے تھے کہ اسی طرح ہال بھرتا تھا اور اسی طرح سے یہ علماء آتے تھے، تو یہ آپ کے لیے بڑے شرف کی بات ہے۔

عربی پر زور کیوں؟

یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں اور سمجھنے لگے ہیں کہ کیا ندوہ میں عربی عربی کا ہر وقت چرچا اور زور دیا جاتا ہے!! نہیں! یہ اس لیے کہ آپ کچھ حق ادا کر سکیں، وہ حق ادا نہیں ہو سکتا، صاف کہتا ہوں حق نہیں ادا ہو سکتا، اگر ہم جان دے دیں جب بھی حق ادا نہیں ہو سکتا، لیکن بہر حال حق ادا کرنے کی کوشش بھی ایک طرح کی شرافت ہے، وہ یہ کہ جن کے ذریعہ سے ہم کو ایمان ملا، جن کے ذریعہ سے ہم کو انسانیت ملی، اخلاق ملے، شعور ملا، خدا شناسی ملی، رسول سے تعلق ملا، ان کو ہم دین کی بات سنا سکیں، اور ان کے کسی انحراف پر ہم ان کو ٹوک سکیں، ان کا محاسبہ کر سکیں۔

آپ کو معلوم ہے جب قومیت عربیہ کی تحریک شروع ہوئی، تو سارا عالم عربی گونج رہا تھا، لیکن یہ میں نہیں کہتا، مجھ سے وہاں کے بعض مصروں نے کہا، شیخ محمد محمود الصواف نے کہا، جن کا ابھی انتقال ہوا ہے، بڑے مجاہد تھے، اور قائد تھے، اور رابطہ عالم اسلامی کے ممبر بھی، انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں نے جیسا، اور البعث العربي اور آپ کے پرچوں نے جس طرح جمال عبد الناصر کو ننگا کیا، اور جس طرح قومیت عربیہ پر ضرب لگائی، ہمارے یہاں کسی نے نہیں لگائی، اور پھر جو وہاں تقریریں ہوئیں مدینہ طیبہ میں، اللہ نے ہمیں توفیق دی، تقریباً ہر سال تقریر ہوتی تھی قومیت عربیہ اور اس طرح کی چیزوں پر، اور مکہ معظمہ میں، یہاں چوٹی کے لوگ، شیخ محمد سرور الصبان جیسے آدمی، جو وزیر مالیات رہ چکے تھے، اور رابطہ عالم اسلامی کے بانی اور سکریٹری جنرل تھے، وہ بھی تھے، وہاں ہم نے ان عربوں سے کہا: رِفْقًا رِفْقًا أَيُّهَا الْعَرَب! اور اس کے بعد ہم نے کہا کہ آپ جمال عبد الناصر کو اسلام کی دعوت کے سامنے اپنا بطل، اپنا ہیرو مانتے ہیں، آپ سے زیادہ غیرت دار تو ہندوستان کے ہندو ہیں جو ہر سال راون کو جلاتے ہیں، وہ راون کو جلاتے ہیں کہ وہ رام چندر جی کا مخالف تھا، اور آپ محمد رسول اللہ (ﷺ) کے سامنے، آپ کی دعوت کے سامنے جو کھڑا ہوا ہے، حجاب بن گیا ہے، جو قومیت عربیہ کی طرف بلا رہا ہے، آپ اس کی قدر کرنے اور اس کی تعریف کرنے کی دعوت

دیتے ہیں، تو ہم نے کہا: رِفْقًا رِفْقًا أَيُّهَا الْعَرَب! محمود الصواف دور بیٹھے تھے، انھوں نے کہا: سُحْقاً سُحْقاً أَيُّهَا الْعَرَب! اور ہماری آواز میں آواز ملائی، اور کہا کہ یہ نہ کہیے، یہ کہیے۔

یہ سب جب ہوگا جب آپ کو عربی زبان پر قدرت ہوگی، اور جب آپ قدر کریں گے یہاں اور یہاں کے اساتذہ کی، الحمدللہ نام لینا مناسب نہیں، ورنہ میں نام بھی لیتا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ایسے اساتذہ دیے ہیں، کم سے کم عربی زبان اور انشاء اور صحافت اور اسلام کی دعوت دینے کے لیے، اور اسلامی فکر کو عربی میں اس کا اظہار کرنے کے لیے، جن کی مثال دور دور نہیں ملتی، اور عربوں کے خطوط ہمارے پاس آئے ہیں، اور ان سے زبانی ہم نے سنا ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

میرے عزیزو! یہ چند باتیں ہیں، اخلاص، اختصاص، اور تفسیر، حدیث، فقہ، جس جس مرتبہ کے یہ فنون ہیں، ان مرتبوں کے لحاظ سے آپ ان کی طرف توجہ کریں، اور ان میں سے کسی میں اختصاص پیدا کریں، اس لیے کہ بہت تیزی سے زوال، تنزل آرہا ہے، آج کہیں کوئی ایسی مسند درس حدیث کی نہیں کہ جس کے لیے دوسرے ملکوں سے لوگ سفر کر کے آئیں، آخر میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب تھے، وہ بھی اس دنیا سے رحلت فرما گئے، اور ان سے پہلے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، ان سے پہلے مولانا انور شاہ صاحب تھے، اور ہمارے یہاں یہیں اسی ندوہ میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) تھے جو شیخ حسین بن محسن الانصاری کے خاص شاگرد تھے، اور جگہ جگہ ایسے لوگ تھے، اب وہ حدیث کی مسند بھی خالی ہو رہی ہے، کوئی اس میں اختصاص پیدا کرے، اور فقہ سے عمومی تعلق اور مناسبت ہونی چاہیے۔

اور پھر اس کے بعد عربیت کو آپ حقیر نہ سمجھیں، یہ نہ سمجھیں کہ یہ ایک تفریحی چیز ہے، اور ایک فیشن بن گیا ہے، اور ندوہ والے اس پر فخر کرتے ہیں، بلکہ اس کو دعوت کا ایک ذریعہ سمجھ کر، دعوت کی زبان سمجھ کر، اور قرآن کی زبان سمجھتے ہوئے اپنی محنت کا میدان بنائیں، اور جب دعوت قرآن کی زبان میں دی جائے تو اس کے درجے کو کون پہنچ سکتا ہے؟ کوئی دل نکال کر کے رکھ دے، تب بھی وہ بات نہیں ہوسکتی، قرآن کی زبان میں دعوت دینا بہت بڑی بات ہے، اس

کے لیے آپ صلاحیت پیدا کریں تقریر میں بھی اور تحریر میں بھی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کا سامان مہیا کیا ہے، النادي العربي وغیرہ میں بھی آپ شریک ہوں، یہاں کے البعث الإسلامي اور الرائد پڑھیں، اور پابندی سے پڑھیں، اور اس کے علاوہ آپ تقریر کی مشق کریں، اور پھر یہاں ہمارے ایسے جوان اور ادھیڑ اساتذہ ہیں جو اگر آج بھی کسی جامعہ عربیہ میں چلے جائیں تو ہاتھوں ہاتھ لیے جائیں، اور ان کو مسند درس پہ بٹھایا جائے، الحمد للہ، میں نام نہیں لیتا ان کا، لیکن آپ ان سے واقف ہیں، اور واقف ہو سکتے ہیں، تو ادھر توجہ کریں۔

دینی امور کا اہتمام

اور پھر اس کے بعد یہ کہ یہاں نمازوں کی پابندی خود اپنے شوق سے، جلد سے جلد اذان کے بعد حاضری، اس سے پہلے بھی مسجد سے ایک تعلق ہو، نوافل بھی پڑھیں، اللہ آپ کو توفیق دے، کچھ فجر سے پہلے دو چار رکعت کی توفیق ہو جائے تو بہت بڑی بات ہے، یہ سب چیزیں معاون ہیں آپ کی تعلیم کے لیے بھی، اور تعلیم کے بغیر بھی ان کی فضیلت اپنی جگہ ہے، تو یہ اور اس کے بعد یہ باہر کا جانا آنا، اور گھومنا پھرنا اس کو کم کریں، یہ ہمیں دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے، ہم اکثر گاڑی پر باہر سے آتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک پارٹی اِدھر سے اُدھر جا رہی ہے، ایک پارٹی اِدھر جا رہی ہے، ایک پارٹی اُدھر جا رہی ہے، اس میں بھی حتی الامکان کمی کریں، اضطراراً آپ شہر میں نکلیں، اس لیے کہ شہر خصوصاً آج کل کے شہر، وہ تو ایسی چیزیں ہیں کہ اگر ہو سکے تو کوئی شریف آدمی اور جس کو اپنی عفت نگاہ اور عفت قلب مطلوب ہے، وہ تو وہاں مضطر ہو کر جائے تو جائے، ورنہ جانا پسند نہیں کرے گا۔

تو زیادہ تر یہاں وقت گزاریں، اور درجہ میں حاضری کی پابندی کریں، اور نمازوں میں سب سے پہلے آنے کی کوشش کریں، جلد سے جلد آنے کی کوشش کریں، اور پھر نماز کو ترقی دینے کی بھی کوشش کریں، اور پھر اس کے بعد یہ کہ ان علوم کے لیے، کتابوں کے لیے مطالعہ دیکھیں، اور اپنی استعداد میں جو خامی نظر آئے، اس خامی کو پورا کرنے کی کوشش کریں، اگر آپ کی فلاں چیز کمزور ہے تو اس کی طرف خصوصی توجہ کریں، فلاں چیز کمزور ہے تو اس کی

طرف خصوصی توجہ کریں، اور اپنے اساتذہ کو مطمئن کریں، ان کی دعائیں لیں، اور آپ یہاں سے ایسے ندوی فاضل بن کر نکلیں کہ اس پر صرف ندوے ہی کو فخر نہ ہو، ہندوستان کو فخر ہو، اور آپ جہاں جائیں ہاتھوں ہاتھ لیے جائیں۔

الحمدللہ کہ ندوہ کا اس وقت ایک مقام ہے، میں یہ آپ سے اس لیے نہیں کہتا کہ میں اس کا ایک خادم وناظم ہوں، یا اس کا فرزند ہوں، بلکہ آپ سے کہتا ہوں کہ آج بلاد عربیہ میں ندوہ کا جو احترام ہے، اور اس کی جو وقعت ہے، وہ میں نہیں کہتا کہ کسی مدرسے کی نہیں، لیکن وہ بہت قابل شکر اور قابل فخر ہے، کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ندوہ کا ایک اسلوب ہے، اسلوب فکر ہے، اسلوب تحریر ہے، اسلوب صحافت ہے، اور وہاں ہر چیز پر فکر اسلامی غالب ہے، اور وہ لوگ کسی مغربی چیز کا اس طرح سے آسانی سے شکار نہیں ہوتے جس طرح سے ہماری جامعات کے لوگ ہوتے ہیں۔

خلیج میں جا کر نوکری کرنا آپ کے مقام سے فروتر ہے

پھر اس کے بعد ایک بات یہ بھی میں کہہ دوں، بہت سے طالب علم ہمارے یہاں اس لیے آتے ہیں کہ یہاں سے پڑھ کر وہ بلاد عربیہ میں، خلیج وغیرہ میں جائیں، اور وہاں جا کر نوکری تلاش کریں۔ یہ چیز بھی آپ کے مقام سے فروتر ہے، مجبوری کی بات الگ ہے، میں کوئی فتویٰ نہیں دیتا کہ حرام ہے یا ناجائز ہے، مکروہ ہے، لیکن آپ کے مقام سے فروتر ہے، آپ کوشش یہ کریں کہ وہاں داعی بن کر کے جائیں، آپ وہاں خطیب بن کر کے جائیں، مفکر اسلامی بن کر کے جائیں، تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کا احترام بھی ہوگا، اور باقی یہ کہ جواز اور اباحت میں کوئی کلام نہیں، اور اس کے بعد یہ کہ آپ میں سے کچھ لوگ جامعات میں چلے جاتے ہیں، یہاں کی یونیورسٹیوں میں چلے جاتے ہیں، ہمیں وہاں دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے، ہمارا بھی آنا جانا ہوتا ہے، علی گڑھ پہلے ہم بہت جایا کرتے تھے، اب تو برسوں سے نہیں جانا ہوا، لیکن اور بعض یونیورسٹیوں میں کہ وہاں جاتے ہی ان کی وضع بدل جاتی ہے، لباس بدل جاتا ہے، پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ یہ ندوی ہیں، بڑی شرم آتی ہے، اتنی جلدی تغیر

آ گیا؟ بالکل معلوم ہوتا ہے کہ ایک چولا تھا جس کا انتظار تھا کہ جلدی سے موقع ملے تو ہم اس چولے کو اتار دیں، دوسرا چولا پہن لیں، آپ کو وہاں استقامت میں، نمازوں کی پابندی میں اور وضع وہیئت میں میں نمونہ بننا چاہیے۔

علم میں کمال اور صلاح وخشیت الٰہی سب سے بڑی قابل احترام وردی

اور جب وضع و ہیئت کا نام آ گیا تو میں آپ سے ایک بات صفائی سے کہتا ہوں کہ یہاں کے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ڈاڑھی رکھے، یہاں کے طالب علم کے لیے حلقِ لحیۃ ناجائز ہے، حرام ہے، ممنوع ہے، اور خلاف قانون ہے، اور یہاں کے طالب علم کے لیے کسی طرح یہ بات زیبا نہیں کہ وہ وہ لباس اختیار کرے جس سے یہ شبہ ہو کہ یہ کالج کا طالب علم ہے، یونیورسٹی کا طالب علم ہے یا کسی عربی مدرسے کا طالب علم ہے، ٹخنہ سے نیچے پائجامہ ہونے کو جب شریعت نے ناپسند کیا ہے تو پھر وہ جو بار بار آتا ہے کہ خَالِفُوا الْیَھُوْدَ وَ النَّصَارَی، خَالِفُوا الْیَھُوْدَ وَ النَّصَارَی، یہود و نصاری کے شعارات کو منع کیا گیا ہے، اس لیے کہ ان کا نفسیاتی اثر ہوتا ہے، اور یہ پیغمبر ہی کی زبان سے یہ بات نکل سکتی تھی، تو ڈاڑھی شرعی ڈاڑھی ہونی چاہیے، صورت شکل مولویوں کی سی، صفائی سے کہتا ہوں مولویوں کی سی ہونی چاہیے، اس سے شرمانا نہیں چاہیے، اور کسی مولوی کو اب شرمانے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ ہمارے سامنے انگریزی داں لوگوں کے، ماہرین کے، یورپ وامریکہ سے واپس آنے والوں کے، برسوں وہاں زندگی گزارنے والوں کے اور جو ان کے اسپیشلسٹ (Specialist)، اور بڑے بڑے باکمال ہیں، ان کے مطالعہ، اور ان کے علم، ان کے فہم، ان کی تحقیق، ان کے کردار، ان کے اخلاق کے وہ نمونے ہمارے سامنے آ چکے ہیں کہ بالکل رعب ان کا اٹھ گیا ہے، سب دھوکہ ہے، کوئی ہم پر ان کو تفوق حاصل نہیں ہے، آپ اپنے فن میں کمال پیدا کریں، تو آپ دیکھیں گے آپ یورپ جائیں گے، تو وہاں آپ کا احترام ہوگا۔

ہم نے وہاں کے بڑے بڑے مستشرقین سے باتیں کی ہیں، انھوں نے بہت توجہ سے ہماری باتیں سنی ہیں، تو بس ایک بات یہ کہنا ہے کہ اس میں شرمانے کی بالکل ضرورت نہیں، ہم آپ سے صاف کہتے ہیں، یہاں آپ رہیں تو آپ یہاں عالموں کی شکل اختیار کریں، اپنے استادوں کی تقلید کریں، اور علمائے ربانی کی تقلید کریں، اور بالکل اُس سے نہ شرمائیں، اور آپ کو تمام شرعی حدود اور محظورات کا پورا خیال رکھنا چاہیے، اور کم سے کم اِس کی اجازت بالکل نہیں ہے کہ آپ یہاں رہ کر آزادی کے ساتھ ڈاڑھی منڈائیں اور بالکل اسکول کے ایک طالب علم معلوم ہوں، اور اس طرح کا لباس آپ پہنیں، کوٹ پتلون پہنیں، اس کی یہاں اجازت نہیں دی جاسکتی، اور یہ کسی معنی میں بھی آپ کے لیے مفید نہیں ہے۔

علمائے ربانی اور نائبین رسول سے ظاہراً و باطناً مشابہت

آپ یاد رکھیے، جتنا ظاہراً و باطناً آپ کو مشابہت ہوگی علمائے ربانی سے، نائبین رسول سے، مشائخ کرام، اولیائے عظام سے، اور خادمین حدیث وفقہ اور حاملین علم سے، اتنی ہی آپ میں مقبولیت اور محبوبیت پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کے ساتھ ہوگی، آپ کا احترام کیا جائے گا، اور آپ کامیاب زندگی گزاریں گے۔

اختصاص اور امتیاز جھکاتا اور احترام پر مجبور کرتا ہے

یہ سب غلط ہے کہ فلاں شعار اختیار کر لینے سے یہ ہوتا ہے، فلاں شعار اختیار کر لینے سے یہ ہوتا ہے، علم جھکاتا ہے، اختصاص اور امتیاز، کوئی علمی امتیاز، کوئی تحقیقی کتاب، کوئی تحقیقی مقالہ، وہ بڑے بڑے امراء کو بلکہ بعض اوقات ملوک اور بادشاہوں تک کو احترام پر مجبور کر دیتا ہے، اور الحمد للہ ہم بھی اپنی تمام پستیوں کے باوجود اس منزل سے گزر چکے ہیں، کہ بادشاہ بھی احترام سے ملے ہیں، تو یہ سب باتیں محض مغالطہ ہیں کہ ہم یہ پہن کر جائیں گے تو ہمارے گاؤں میں عزت ہوگی، قصبہ میں عزت ہوگی، بازار میں عزت ہوگی، ہمارے بہت برادری کے لوگ جو انگریزی داں ہیں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں، وہ ہمارا

احترام نہیں کرتے، کچھ نہیں، آپ کا علم سب سے بڑا سائن بورڈ ہے، اور سب سے بڑی قابل احترام وردی ہے، یہ وردی ہے آپ کی اصلی، علم میں کمال اور صلاح اور خشیت الٰہی اور سنتوں کی پابندی، اور عبادت کا ذوق اور اصلاح کی کوشش۔

اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ

آخر میں ایک بات کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ دیکھیے! اس وقت ہندوستان میں ایک ایسا دور آیا ہے جو ہمارے علم میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا، دورا کبری کو کسی قدر مشابہت ہے، لیکن دور اکبری بھی اس درجہ میں خطرناک نہیں تھا جتنا یہ دور ہے، جواب چل رہا ہے، وہ یہ کہ اس وقت اکثریت نے یہ طے کرلیا ہے کہ اس ملک کو اسپین بنا کر رہیں گے، یعنی اس میں مسلمان رہیں گے، لیکن اپنے تمام ملی تشخصات کو چھوڑ کر، ابھی زبان کے اوپر یہ بات نہیں آئی، لیکن ہمیں معلوم ہے (ہمیں ایسے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے) کہ اذانیں بھی زور سے نہ ہوں، لاؤڈ اسپیکر تو خیر الگ چیز ہے، وہ کوئی مسنون چیز نہیں، مسجدوں کی کثرت بھی اور مسجدوں کا جائے وقوع بھی، اور مسجدوں کا وجود بھی خطرے میں ہے، اور بابری مسجد کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، اس نے اس کے لیے راستہ کھول دیا ہے، اور اب وہ ہندو اخبار نویس اور کالم نگار، اور ان کے سوچنے سمجھنے والے، انگریزی اور ہندی اخباروں میں جو مضامین نکل رہے ہیں، ان میں صاف صاف یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کو بالکل ہندو بن کر رہنا ہوگا، ہندوستانی بن کر رہنا ہوگا، یہاں مسلمان بن کر رہنے کی اب گنجائش نہیں ہوگی، وہ لباس میں، صورت وشکل میں، اور زبان میں، اور رسم الخط میں، اور تہذیب میں، سب میں ان تمام امتیازی خصوصیات سے دستبردار ہو جائیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہو دور سے کہ یہ مسلمان ہیں، یہ کہا جائے کہ یہ مسلمان ہیں۔

اس فتنہ کو روکنے کے لیے علماء کی ذمہ داریاں

اس وقت اس فتنہ کو روکنے کے لیے سب سے بڑی طاقت جو ہوسکتی ہے وہ علماء کی ہوسکتی ہے، وہ ہمارے فضلائے مدارس کی ہوسکتی ہے، کہ وہ جہاں جہاں کے رہنے والے ہوں،

وہاں کی مسجدوں میں تقریر کریں، جمعہ کے دن تقریر کریں، عیدین میں تقریر کریں، خوشیوں کے موقع پر تقریر کریں، نکاح وغیرہ کی مجلسوں میں تقریر کریں، کہ ہم کو اپنے پورے ملی تشخص کے ساتھ اس ملک میں رہنا ہے، کسی ایک چیز کو نہیں چھوڑنا ہے، ہم اس کے لیے بھی تیار نہیں کہ ہمارا پائینچہ ٹخنے سے نیچے ہو، ہم اس کے لیے تیار نہیں کہ ہم اپنی ڈاڑھی کو ایسا کرلیں کہ سمجھا جائے کہ اتفاقاً کچھ بال اُگ آئے ہیں، نہیں، کچھ نہیں، ہم بالکل شریعت پر عمل کریں گے، اور شریعت کے ساتھ رہیں گے، اور ہمارا نظام تعلیم وہی رہے گا، ہم اپنے بچوں کو توحید کی تعلیم دیں گے، دینیات پڑھائیں گے، اردو سے واقف بنائیں گے، اردو رسم الخط کو زندہ رکھیں گے، یہ سب سے بڑی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے، اور آپ ہی سب سے بہتر طریقہ پر اس ذمہ داری کو ادا کرسکتے ہیں۔

اس وقت کا اہم ترین فریضہ

یہ باتیں سن لیجیے، اور دل پر لکھ لیجیے، کہ اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ جو ہے، وہ ہے یہی متحدہ کلچر، اور ملی تشخص سے دستبردار ہونا، اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے دینی حلقے یا علمی حلقے کے بعض لوگ بھی جو قلم کا استعمال جانتے ہیں، اور علمی زبان میں بات کرسکتے ہیں، وہ بھی اس کی دعوت دینے لگے ہیں کہ مسلمانوں کو کسی بات پر اصرار نہیں کرنا چاہیے، اور پرسنل لا کے سلسلے میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف جو اصرار کیا، یہ بھی مسلمانوں کی ایک غلطی تھی، خواہ مخواہ کے لیے ہندوؤں میں ایک ردعمل پیدا ہوا، اور وہ سمجھے کہ مسلمان بہت تنگدل اور تنگ نظر ہیں۔

نہیں! ہم صاف صاف کہتے ہیں، ہم یہاں اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ رہیں گے، اور اس کے ساتھ ہم امید رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس ملک کی قیادت نصیب فرمائے گا، اس لیے کہ اس ملک کی آبادی کے کسی عنصر نے اپنے کو اس قابل نہیں رکھا کہ اس ملک کو خطرے سے بچائے، سب دولت پرست ہیں، مادہ پرست ہیں، نفس پرست ہیں، طاقت پرست ہیں، اقتدار پرست ہیں، جاہ پرست ہیں۔

اس لیے ہم عزت کے ساتھ رہیں گے، ہم اپنے تشخصات کے ساتھ رہیں گے، لیکن عزت کے ساتھ رہیں گے، سر اونچا کر کے چلیں گے، ہماری نگاہیں شرم سے جھکی ہوئی نہیں ہوں گی، بلکہ ہماری نگاہیں بلند ہوں گی، اور ہم سمجھیں گے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، وہ صحیح ہے، اور ہندوستان کا دستور اس کی اجازت دیتا ہے، اور ہندوستان صحیح سلامت اور مامون و محفوظ اور خوشحال اسی حالت میں رہ سکتا ہے، جب اس میں ایک دوسرے کو اس کی آزادی دی جائے کہ وہ اپنے مذہب پر عمل کرے، اور مذہبی شعائر کا مظاہرہ کر سکے اور ان کو قائم رکھے، اور اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھے، بس یہ اس وقت کا بہت اہم ترین فریضہ ہے، میں نے اس کو اس لیے کہہ دیا کہ آپ ابھی سے اس کو اپنے پروگرام میں شامل کر لیں کہ اللہ تعالیٰ جب ہم کو موقع دے گا، بحیثیت خطیب کے، بحیثیت داعی کے، بحیثیت مدرس کے، بحیثیت مضمون نگار کے، بحیثیت صحافی کے، بحیثیت زعیم کے، تو ہم اپنے کو اس کا پابند سمجھیں گے کہ ہم مسلمانوں کو اس کی دعوت دیں کہ وہ اپنے پورے ملی تشخص کے ساتھ اس ملک میں رہیں، و آخر دعوانا أن الحمدللّٰہ رب العالمین۔ (۱)

---

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی مسجد میں نئے تعلیمی سال کے آغاز کے موقع پر ۱۷/شوال ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۰/اپریل ۱۹۹۳ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر ٹیپ رکارڈر کی مدد سے قلمبند کی گئی۔ (مرتب)

زبان وادب کی اہمیت اور اس کی ضرورت

قوت بیانیہ کی نعمت

عزیز بھائیو اور فرزندانِ دارالعلوم! مجھے بہت خوشی ہے کہ ''الاصلاح'' کے اس دوسرے بازو اور اس دوسرے خاندان میں آنے اور اپنے عزیزوں کو دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا ہے، 'الاصلاح' درحقیقت اس قوت بیانیہ کو پیدا کرنے کی جگہ ہے جو زبان وقلم کے ذریعہ سے وقت اور دین کے تقاضوں کو پورا کر سکے، اور دین پر جو حملے ہو رہے ہیں ان کا جواب دے سکے، اور پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام پر وہ اعتماد بحال کر سکے جو متزلزل ہوتا جارہا ہے، اور جس کے بہت سے اسباب ہیں اور ان اسباب پر کتابوں میں اپنے اپنے رقبہ اور اپنی اپنی وسعت کے مطابق بحث کی جا چکی ہے۔

کل ''النادی العربی'' کے جلسے میں میں نے کہا تھا کہ اللہ کی ذات بے نیاز ہے، غنی ہے، اس کو نہ وسائل کی ضرورت ہے، نہ طاقتوں کی، خواہ جسمانی ہوں، غیبی ہوں، یا مصنوعی ہوں، کسی چیز کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ قوت بیانیہ کا ایک نعمت کے طور پر تذکرہ کیا ہے اور اس کی تاثیر بیان کی ہے، مثلاً اس نے کہا کہ ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴾ [1] یہاں تک ہی کافی تھا، اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے لحاظ سے کہ ﴿لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴾ ''تاکہ آپ ڈرانے والے بنیں''، لیکن اس کے بعد فرماتا ہے: ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾ آپ ڈرانے والے بنیں ایسی عربی زبان میں جو واضح کرنے والی ہو، دل نشین ہو اور جو دل و دماغ کو متاثر کرے، اور جو

(۱) سورة الشعراء: ۱۹٤

یقین پیدا کرے، اور پھر فرمایا: ﴿إِنَّآ أَنزَلۡنَاهُ قُرۡآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُونَ﴾ [۱] یہاں عربی کہنے کی ضرورت کیا تھی؟ ﴿إِنَّآ أَنزَلۡنَاهُ قُرۡآنًا﴾ کافی تھا، لیکن چونکہ اہل عرب مخاطب ہورہے ہیں، اور عرب ہی داعی اول ہیں دین کے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے لیے نہ صرف عربی زبان کا انتخاب کیا بلکہ عربی مبین کہا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کا جہاں ذکر کیا ہے خلقت انسانی کے موقع پر، تو وہاں پر بھی اس کو فراموش نہیں کیا، یہ تو کہنا بے ادبی ہے، بلکہ اس کو ترک نہیں فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿اَلرَّحۡمٰنُ، عَلَّمَ الۡقُرۡآنَ، خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ، عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ﴾ [۲] اور انسان کو پیدا کیا' اور آگے فرماتا ہے کہ ﴿عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ﴾ اس کو قوت بیانیہ عطا کی، اس کو سلیقہ دیا اس بات کا کہ وہ اپنی بات کو واضح کر سکے، دل نشیں کر سکے۔

تو یہ ایک طاقت ہے، اس طاقت کا استعمال جن لوگوں یا جس گروہ اور جس طبقہ اور جس ذہنیت اور مقاصد کے حامل لوگوں کے ہاتھ میں جاتا ہے، اس سے لوگ ویسا ہی فائدہ اٹھاتے ہیں، اگر وہ ضالین ومضلین کے ہاتھوں میں چلا جائے، قوت بیانیہ ان کو ملے اور وہ اس سے فائدہ اٹھائیں، تو وہ جاہلیت کی دعوت کا کام کرتے ہیں، اور عقائد سے لے کر اخلاق وسلوک اور پورے انسانی تعلقات سب کو متاثر کرتے ہیں، اور دنیا کی بین الاقوامی تاریخ میں ایسا واقعہ اور ایسا دور بار بار آیا ہے کہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں قلم پہنچ گیا اور قلم تو خیر ہر ایک لے سکتا ہے، لیکن وہ چلنے والا اور متاثر کرنے والا قلم پہنچ گیا، اور ان کو وہ زبان ساحر اور بیان ساحر مل گیا جس سے وہ بگاڑ پیدا کرسکیں، اور ایک ایسا ادب وجود میں آیا جس نے پورے معاشرہ کو متاثر کیا۔

آپ یونان کی تاریخ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں بہت بڑا حصہ اس ادب کا تھا جو یونان سے پیدا ہوا، لادینیت کا ادب، تشکیک کا ادب، نفس پرستی کا ادب، ان کو ملاحم یا رزم نامہ اور شاہ نامہ کہتے ہیں، اگر یونانی شاہ نامے پڑھیں گے جن کا عربی میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے، خود عیسائیوں نے کیا ہے اور کچھ تاریخ میں محفوظ بھی ہے، پھر اگر آپ قرون وسطی کی تاریخ پڑھیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے فساد کی بہت بڑی علت یہ تھی کہ قلم وزبان

(۱) سورة يوسف: ۲ (۲) سورة الرحمن: ۱-٤

ان لوگوں کے قبضہ میں آ گئے جن کو نہ خدا کا خوف تھا، نہ انسانیت سے محبت ہی تھی، اور نہ محاسبہ کا کوئی ڈر تھا، اور وہ نفس پرست تھے، اور وہ فساد کے داعی تھے، ان کا ایسا اثر ہوا آپ کو معلوم ہے کہ یورپ بالکل ان کے چنگل میں گرفتار اور ان کے پھندے میں پھنس گیا، گبن کی (Gibbon) مشہور اور شہرۂ آفاق کتاب The History of the Decline and Fall of the Roman Empire پڑھیں یا ڈریپر (Draper) کی History of the Conflict between Religion and Science ''معرکۂ مذہب و سائنس'' پڑھیں۔ یہ میں آپ کو بتادوں کہ میں ''الاصلاح'' کا ممنون ہوں کہ میں جب یہاں پڑھتا تھا تو تعلیم کے آخری دور میں جب یہاں تدریسی کام میرے سپرد ہوا تو مجھے اس کتاب کی ضرورت تھی، میں انگریزی جانتا تھا، انگریزی پڑھی تھی اور محنت سے میں اصل انگریزی میں کتاب پڑھ سکتا تھا، History of the Conflict between Religion and Science، لیکن مجھے یہاں اس کا ترجمہ مل گیا، مولانا ظفر علی خاں کا شاہکار ترجمہ ہے ''معرکۂ مذہب وسائنس''، یہ مجھے ''الاصلاح'' سے ملا، اور ایسے ہی History of European Morals ''تاریخ اخلاق یورپ'' تھی، یہ بھی میرے لیے کام کی چیز تھی، اور ان دونوں کتابوں سے میں نے اپنی کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین میں فائدہ اٹھایا، اس لیے کہ ان دونوں کتابوں کے ترجمے ہو گئے تھے، اور بڑے لائق مترجمین کے قلم سے جو سند کا درجہ رکھتے تھے، ایک مولانا ظفر علی خاں صاحب کے قلم سے ہوا تھا، ایک مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے، میں الاصلاح کا ممنون ہوں، احسان مند ہوں، اور میں چاہتا ہوں کہ الاصلاح میں یہ صلاحیت باقی رہے کہ اس سے لوگ اپنی تصنیف و تالیف میں اور تحقیقات میں کام لے سکیں۔

میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اپنے ذخیرۂ کتب پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہیے کہ کون سی کتابیں ابھی حال میں شائع ہوئی ہیں، جو ہمارے طلبہ ہی نہیں بلکہ اساتذہ کی نظر سے گزرنی چاہئیں، اور میں اس کا اعتراف کرتا ہوں اور میں نے خود اپنے

متعلق شہادت دی ہے کہ اساتذہ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، ''الاصلاح'' کوئی تفریح کی چیز نہیں ہے، اس لیے نہیں ہے کہ وہاں جا کر اخبارات پڑھے جائیں، اخبارات تو آپ ہر جگہ پڑھ سکتے ہیں، کون سی جگہ ہے جہاں اخبار نہیں آتا، یا آپ رسائل پڑھنے آئیں، سطحی قسم کے رسائل پڑھیں جو ہندوستان کے مختلف صوبوں سے نکلتے ہیں، آج کل تو ہر مدرسہ سے، ہر ادارہ سے، ہر انجمن سے، ہر شہر سے رسالے نکلتے ہیں۔

ایسی چیزیں ہونی چاہئیں ''الاصلاح'' کے دارالکتب میں جن سے ذہن بنے، اور جن سے بامقصد مصنفین اور داعیوں کو اسلحہ ملے، جن سے وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مطمئن کر سکیں، یہ ''الاصلاح'' کی بہت بڑی افادیت اور بہت بڑی خدمت ہوگی، اور اس وقت ضمناً میں کہہ رہا ہوں کہ اس کے لیے میں ایک ذمہ دار اور ناظم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے یہ صفائی سے کہتا ہوں کہ اس میں اہتمام ونظامت دونوں آپ کی مدد کرنے اور آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں، آپ نئی کتابوں کی فہرست تیار کریں، اچھے اہل نظر کے مشورہ سے اور سنجیدہ اور فکر انگیز اور مواد فراہم کرنے اور رہنمائی کرنے والی کتابوں کی، اور اس کے بعد آپ کا بجٹ اس مد کے لیے کافی نہ ہو تو میں اعلان کرتا ہوں کہ دارالعلوم اس میں مدد کرے گا۔

یہودی دماغ اور عیسائی وسائل

تو اس وقت یہ قوت بیانیہ خواہ وہ تحریری ہو یا تقریری ہو، اس وقت اور زیادہ مسلح ہوگئی ہے، اور مسلح ہی نہیں بلکہ جیسا کہ ہمارے عزیز ''الاصلاح'' کے غالباً ناظم ہیں، انھوں نے جو مضمون پڑھا، اس میں انھوں نے کہا کہ یہ بات میں نے بہت دن پہلے کہی تھی کہ صدیوں کے بعد یہ بات پیش آئی ہے کہ یہودی دماغ اور عیسائی وسائل وطاقت دونوں متحد ہوگئے ہیں، حالانکہ دنیا کے جن دو مذہبوں میں زیادہ سے زیادہ تضاد ہو سکتا ہے، وہ یہودیت اور عیسائیت ہیں، عیسائیت کی بنیاد اس پر ہے کہ مسیح ابن اللہ ہیں، اور یہودیت کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ حضرت مسیح پر تہمت لگاتے ہیں، نسبی تہمت لگاتے ہیں، جو کوئی عیسائی برداشت نہیں کر سکتا، لیکن اس کو عیسائیوں نے فراموش کر دیا، یہاں تک کہ پاپائے اعظم نے یہ قصور معاف کر

دیا یہودیوں کا، جو عیسی علیہ السلام پر اعتراض کرتے تھے، تہمت لگاتے تھے، تو اس وقت ایک بڑی گہری سازش ہے دنیا میں اور اس نے اس وقت عنوان اختیار کیا ہے Fundamentalism کا، یعنی روس کے زوال کے بعد امریکہ نے یہ سمجھ لیا اور برطانیہ اور عیسائی اور بڑی طاقتوں نے کہ اگر اب خطرہ ہو سکتا ہے اور کوئی حریف میدان میں آ سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس لیے بڑی ہوشیاری سے اور اس میں یقیناً یہودی دماغ کام کر رہا ہے، انھوں نے اس کو عنوان دیا ہے Fundamentalist کا یعنی اصول پرست، گویا قدامت پرست اور حق پرست، یا یوں کہیے کہ جو قدیم ذخیرہ ہے اس کے پرستار، اس کی اصطلاح کی جگہ پر Fundamentalist کی اصطلاح استعمال کی جا رہی ہے، اور اس کا اس قدر پروپیگنڈا ہے اور اس زور شور اور بلند آہنگی کے ساتھ اور ایسے مدلل بلکہ منظم طریقہ پر یہ بات کہی جا رہی ہے، کہ کسی آدمی کے لیے مشکل ہو گیا ہے کہ وہ اقرار کرے کہ میں Fundamentalist ہوں، حالانکہ ایک مذہبی کے لیے Fundamentalist ہونا ضروری ہے، مذہبی کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ منصوصات قطعی پر، نصوص دین پر، آسمانی صحیفوں پر اور کتاب اللہ پر، عیسائی ہو تو انجیل اور اگر مسلمان ہے تو اللہ کے آخری کلام قرآن مجید کے بیانات پر، اس کے احکام پر، اس کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں۔

اور اس وقت یہ Fundamentalist کی اصطلاح اتنی عام ہو گئی ہے کہ بہت ہی تأسف اور ندامت کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ممالک عربیہ میں بھی یہ اصطلاح پہنچا دی گئی ہے، ابھی ہمارے پاس ایک خط آیا، شاید ایک ہفتہ یا دو ہفتہ ہوا ہو، میں نام نہیں لوں گا اور ایک ایسی جگہ سے آیا ہے کہ جہاں کے حاکم وسلطان ہم سے ذاتی طور پر واقف ہیں، احترام کرتے ہیں، ہمارا ان کا لندن میں ساتھ رہا ہے، اور انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ انھوں نے اپنے منطقہ میں (جس جگہ کے وہ امیر ہیں) ایک سڑک کا نام ہمارے نام پر رکھا تھا "شارع أبي الحسن الندوي"، اتنا وہ خیال کرتے ہیں، اور ایک بڑے بین الاقوامی ادارے میں وہ ہمارے ساتھ رہے ہیں، ان کے عزیز قریب کیا بلکہ ان کے ترجمان کا خط آیا ہمارے نام کہ متشددین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ہم چند مفکروں اور چند علماء کے

نام یہ سوال نامہ بھیج رہے ہیں کہ متشددین کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں، جس کو عربی اصطلاح میں "متطرفین" کہتے ہیں، انتہاپسند، Fundamentalist کا ترجمہ اصلاً مبدئیین ہے، جو مبادی پر یقین رکھتے ہیں۔

نفس پرستی دنیا کے فساد کا سبب

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا کا سارا فساد اس لیے ہے کہ کسی اصول پر یا کسی بنیاد پر یقین نہیں ہے، خالص نفس پرستی ہے، اور خالص فائدہ اندوزی اور اپنے نفس کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ہے، خواہ تمام دنیا کے مسلمہ اخلاقی اصول کے خلاف ہو، چاہے اس کا پوری انسانیت، پورے معاشرۂ انسانی اور پورے عہد پر کچھ اثر پڑے لیکن اپنا کام نکالنا ہے، یہ معنی تھے بے اصولی کے اور اس بے اصولی نے آج دنیا کو اس جگہ پر پہنچا دیا ہے کہ کسی وقت قیامت آسکتی ہے، وہ قیامت تو اللہ تعالیٰ لاسکتا ہے، اس قیامت کا ذکر نہیں، ایک ویسی قیامت یعنی قیامت صغریٰ ہر وقت ہوسکتی ہے، پہلی جنگ عظیم بھی ایک طرح کی قیامت صغریٰ تھی، دوسری جنگ عظیم بھی، ایسی جنگیں ہوسکتی ہیں اور اس سے بڑے پیمانے پر ہوسکتی ہیں، وہ صرف برطانیہ اور جرمنی کی جنگ تھی اور اس میں کچھ اور طاقتیں شامل ہوگئی تھیں، اور دوسری جنگ بھی ایسی ہی تھی، لیکن اب جو جنگ ہوگی وہ بہت خطرناک ہوگی، اس لیے کہ اس وقت ایٹمی ہتھیار وسیع پیمانہ پر موجود ہیں۔

اور دوسرے یہ کہ اس جنگ کا رقبہ اس جنگ سے کہیں زیادہ وسیع ہوگا، اور یہ سب نتیجہ ہوگا بے اصولی اور نفس پرستی اور مطلق آزادی کا اور ظاہر بینی کا، لیکن ان کو شرم نہیں آتی انھوں نے یہ اصطلاح ایجاد کی، حالانکہ سارا فساد یہی ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ [1] یہ کیا ہے، اس کی اصل بنیاد آپ دیکھیں اور قرآن مجید کے پورے سیاق وسباق پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ﴿بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ میں یہ بے اصولی اور نفس پرستی اور مکمل آزادی اور

---

(۱) سورة الروم: ٤١

ہر طرح کی چھوٹ اور نفس کی تسکین کا ہر قیمت پر سامان کر لینا ہے ﴿بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا﴾[1] کہ اللہ تعالیٰ جس کو فرماتا ہے، یہ سب Fundamentalist کے منکروں کے خیالات ہیں، اور ان کے مقاصد اور ان کی دعوت میں یہ ساری چیزیں موجود ہیں جس کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ خیال کیجیے قرآن مجید کی بلاغت کا کہ ﴿أَيْدِي النَّاسِ﴾ پہ اس کی نسبت کی ہے، اس کی نسبت کسی اور چیز پر نہیں ﴿بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ ان لوگوں کے ہاتھوں نے کیا جو کسی اصول پر ایمان نہیں رکھتے تھے، کسی بنیاد پر ان کا اتفاق نہیں تھا، کوئی حدود ان کے لیے مقرر نہیں تھے کہ یہاں سے یہاں تک جائیں گے، اور اس کے بعد آگے نہیں جائیں گے۔

خطرناک سازش

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وقت بڑا نازک اور خطرناک ہے، اس میں تبادلۂ خیال کی صلاحیت، تحریری صلاحیت اور لسانی و بیانی صلاحیت، خطابت کی صلاحیت اور تقریر کی صلاحیت ان سب چیزوں کی ضرورت ہے، اور اب وہ صرف اس لیے نہیں ہے کہ جیسے کہ آج سے پچاس برس پہلے تھا کہ آپ کسی میلاد اور کسی سیرت کے جلسے میں تقریر کردیں، یا کسی انجمن کے پلیٹ فارم سے کوئی تقریر کردیں، یا اپنے مدرسہ کا تعارف کرادیں، یا کوئی نیک مقصد کے لیے جلسہ ہو اور اس میں آپ تقریر کردیں، اب تو ایک عالمی سازش ہے، بڑے وسیع اور نہایت گہرے پیمانے پر، اور اس کے مضمرات بہت دور رس اور بہت دقیق اور بہت عمیق ہیں، یہ اتنی بڑی سازش کم سے کم میرے محدود مطالعہ میں جس کے پیچھے اتنا پروپیگنڈہ ہوا اور اتنے ذرائع ابلاغ ہوں جسے آج میڈیا کہتے ہیں، ذرائع ابلاغ سب کے سب ریڈیو، ٹیلی ویژن، پریس اور سیمنارس، ملکوں کے دورے اور آنے جانے والے وفود یہ سب کے سب اس نکتہ پر آکر متحد ہوگئے ہیں کہ دنیا میں (Fundametnalism) کا مقابلہ کیا جائے، یعنی کوئی اصول ہی باقی نہ رہے، حدود ہی باقی نہ رہیں، وہ سب کر سکتے ہوں جس سے دل خوش ہو جائے۔

---

(۱) سورة القصص:۵۸

یورپ کا دماغ اور لذتیت

ایران کا ایک فلسفہ لذتیت جس کا نام آتا ہے، لذتیت کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز میں مزہ آئے وہ کرنا چاہیے، آج کا یورپ اسی انداز سے سوچ رہا ہے، پورے یورپ کا دماغ گویا لذتی بن گیا ہے، جس میں مزہ آئے، جس میں فائدہ ہو، البتہ لذت کو ذرا وسیع کر دیا ہے انھوں نے کہ وہ صرف لذت بطن یا لذت لسان ہی نہیں، بلکہ لذت ذہن بھی ہو، اس میں لذت سیاسی بھی شامل ہو اور لذت سائنسی بھی شامل ہو، اور وہ جو ایک فاتحانہ خوشی ہوتی ہے، اور فاتحانہ مسرت ہوتی ہے، وہ بھی اس میں شامل ہو، تو لذت کا انھوں نے دائرہ اور وسیع کر دیا ہے، اس سے وہ اور خطرناک بن گئی ہے، یونان کا جو لذتی اسکول تھا وہ وہاں تک جا ہی نہیں سکا تھا، اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی، لیکن یورپ کا لذتی اسکول بہت ہی آگے پہنچ گیا ہے۔

یہ اس وقت گہری سازش ہے، اس سے بڑھ کر کوئی سازش نہیں، چوں کہ ہمارا آنا جانا ہوتا ہے اور ہمارے روابط ہیں ثقافی اور صحافی اور تحریری، چنانچہ عرب ممالک میں بھی خلیج میں بھی یہ بات داخل ہوگئی ہے کہ متشددین کا مقابلہ کرنا چاہیے، متشددین کے معنی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ معاشرہ اسلام کے احکام کے مطابق ہونا چاہیے، اس میں خوف خدا، خوف آخرت ہو، اور سے محاسبہ ہونے کا خیال ہو، اور اس میں دوسروں کے اخلاق اور حقوق کا لحاظ ہو، اور جو لوگ حکام شریعت کو جاری کرنا چاہتے ہیں، حدود شرعیہ تو خیر بڑی چیز ہیں، تعزیرات بڑی چیز ہیں مثلاً رجم ہے یا جلد ہے، یہ چیزیں تو بڑی ہیں اور ان کی نوبت نہیں آتی، لیکن جو روز مرہ کے حالات ہیں اور بہت قابل عمل حدود کے اندر جو احکام شرعیہ کا اجراء چاہتے ہیں، ان سے بھی حکومتیں ڈر رہی ہیں اور وہاں سے نکلنے والے اخبارات میں اور خطوط میں یہ بات نظر آتی ہے۔

عدم اصول پرستی کے خلاف جہاد

اب بالکل (Fundametalist) کے بارے میں امریکہ اور برطانیہ اس طرح سوچ رہا ہے اور پروپیگنڈہ کر رہا ہے، ایک صدائے بازگشت آرہی ہے ان ملکوں سے، آپ کو

ان سب خطرات کو سامنے رکھنا چاہیے، اب معاملہ صرف اتنا نہیں ہے کہ سنیما مت جاؤ بہت بری بات ہے، اس کی برائی اپنی جگہ پر مسلم ہے، جو شناعت ہے وہ شناعت ہے، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اب صرف یہ نہیں کہ کھیل کود میں زیادہ مت پڑو، فضول خرچی مت کرو، اب یہ اصلاح معاشرہ کا کام بہت اہم ہے، میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایک رکن کی حیثیت سے اس کی پوری وکالت کرتا ہوں، یہ کام آپ کو کرنا ہے اپنی اپنی جگہوں پر، اصلاح معاشرہ کی دعوت دینا ہے، مکاتب و مدارس کو جاری کرنے کی آپ کو دعوت دینا ہے، مسجد مسجد مکتب قائم ہو اور کچھ گھروں پر بھی اس کا انتظام ہو جیسے پہلے ہوا کرتا تھا، کئی پڑھے لکھے آدمی بیٹھیں اور وہاں کے بچے آئیں اور اردو لکھنا پڑھنا سیکھیں، قرآن مجید پڑھ سکیں، اور جو دین کی بنیادی باتیں ہیں مثلاً کلمہ اس کو صحیح یاد ہو اور وہ شرک و توحید کا فرق سمجھتے ہوں، کفر و ایمان کا فرق سمجھتے ہوں، اور سیرت نبویؐ سے ضروری حد تک واقف ہوں، یہ سب کام آپ کو کرنا ہے۔

لیکن اس سے بڑی ایک گہری سازش اس وقت ہے جس کے لیے بڑے پیمانے پر آپ کو عملی تیاری کرنی ہے، وہ ہے عدم اصول پرستی کے خلاف جہاد، اس وقت امریکہ نے خاص طور پر جو مہم چلائی ہے اور ایک بہت بڑی سازش اور ایک بہت بڑا منصوبہ ہے، اس میں یہودی دماغ کام کر رہا ہے، اور عیسائی وسائل اور عیسائی طاقتیں اس کے پیچھے ہیں، وہ یہ ہے کہ اس وقت سارے عالم میں عقیدہ کو، ایمان کو، تعلق باللہ کو، ایک دین کی پابندی کو اور آخرت کے خیال کو متزلزل کریں، اور یہ کہہ کر کہ یہ سب بنیادی باتیں ہیں، پرانی باتیں ہیں، فرسودہ باتیں کہتے ہیں، تو اس کے لیے (Fundamentalism) وغیرہ کے نام رکھتے ہیں، اس کے لیے آپ کو تیاری کرنا ہے۔

''الاصلاح'' محض تقریر و تحریر کا شعبہ نہیں

میں ''الاصلاح'' کو محض تقریر و تحریر کا ایک شعبہ نہیں سمجھتا، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ندوۃ العلماء کے ایک مقصد کے پورا کرنے کا یہ ایک ذریعہ ہے، اور وہ ہے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کو مطمئن کرنا، اسلام پر اعتماد دوبارہ واپس لانا اور خاص طور پر ترقی یافتہ جو اسلامی ممالک ہیں،

ان میں اسلام پر اعتماد متزلزل ہو چکا ہے، الجزائر میں کیا ہو رہا ہے؟ الجزائر میں خالص دینداروں اور حکومت کے نمائندوں کے درمیان جنگ ہے، نہ اسرائیل کی ان کے خلاف جنگ ہے، نہ اسرائیل کا ان کے خلاف معرکہ ہے، اور نہ کسی یورپین طاقت کی ان کے خلاف جنگ ہے، اور نہ ملک میں بگاڑ وفساد پیدا کرنے والوں کے درمیان، خالص دیندار، دین پسند، میں دین پرست نہیں کہتا، دین پسند طبقے اور جو چاہتے ہیں کہ كلمة الله هي العليا اس پر عمل ہو، یہاں اللہ کا نام بلند ہو، یہاں اللہ کا نام سب سے اونچا ہو، اللہ کا حکم سب سے زیادہ قابل اطاعت سمجھا جاتا ہو، یہاں فرائض کی پابندی ہو، اور محارم سے، حرمات سے اجتناب ہو، یہاں مسجدیں آباد ہوں، اس کا ذکر کرنا بھی الجزائر میں ایک بڑا جرم ہے، برابر خبریں آتی رہتی ہیں کہ دین پسند لوگوں میں سے اتنے آدمی شہید ہوئے، لیبیا میں بھی ہو چکا ہے، اور اب بھی لیبیا کا حال وہی ہے، اور شام تو بالکل غیر مسلم عنصر کے قبضہ میں ہے، وہاں کے دروزی حقیقت میں وہ مسلمان نہیں ہیں، کسی طور پر ان پر مسلمانوں کی تعریف صادق نہیں آتی، اس طور پر یہ فتنہ مشرق کی طرف بڑھ رہا ہے، اور ہمیں اندیشہ ہے کہ پاکستان بھی اس کے لپیٹ میں نہ آجائے، اور ضیاء الحق شہید مرحوم کی شہادت اور ملک فیصل کی شہادت میں بھی امریکہ کا ہاتھ تھا، اور وہ اس بنا پر تھا کہ کوئی ایسا عنصر یا ایسا فرد غالب نہ ہونے پائے، حاوی نہ ہونے پائے اس ملک پر، اس ملک کے مستقبل کی تعمیر میں وہ آزاد نہ ہو جو اصول پسند ہو اور عقیدہ کا پختہ ہو اور اسلام کی حقانیت پر پورا یقین رکھتا ہو، اور ضروری حد تک وہ فرائض کا بھی پابند ہو، یہ ایک سازش چلی آرہی ہے فکری طور پر بھی اور سیاسی وانتظامی طور پر بھی، انقلابی طور پر بھی، ہمیں اسی طور پر اس کا مقابلہ کرنا اور تعلیم یافتہ طبقہ کو مطمئن کرنا اور اسلام کی ابدیت پر اس کا یقین واپس لانا، دوبارہ یقین پیدا کرنا ہے، اسلام ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے، قیادت کرسکتا ہے۔

اس زمانہ کا اصل فتنہ

جدید نصاب تعلیم اور یورپ سے جو طریقۂ تعلیم آیا ہے، وہاں سے امپورٹ کیا گیا ہے،

اس میں یہ خاصیت ہے کہ وہ اسلام پر اعتماد کو متزلزل کردے کہ اسلام نے بیشک ایک زمانہ میں اچھا کام کیا تھا، اچھا پارٹ ادا کیا تھا، لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے، اس وقت وہ بہت ہی غیر ترقی یافتہ زمانہ تھا، خدا بھلا کرے ان لوگوں کا، مثلاً عورت کے کچھ حقوق مل گئے، دختر کشی بند ہوگئی، اور شراب اتنی نہیں پی جانے لگی، لیکن اب اسلام اس زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا ہے۔

آپ کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اسلام اس زمانہ کا ساتھ دینا تو الگ رہا یہ تو اس تنزل کے بعد اس زمانہ کو ہلاکت سے بچا سکتا ہے، اسلام اس زمانہ کو راہ پہ لگا سکتا ہے، اسلام اس زمانہ کو مبارک بنا سکتا ہے اور اسلام اس زمانہ کو رہنے کا سلیقہ سکھا سکتا ہے، اس کے لیے آپ کو تیاری کرنی ہے، بہتر ہوگا کہ ہمارے بعض اساتذہ اس میں کتابوں کا انتخاب کریں۔

کتابوں کا مطالعہ

ایک زمانہ میں ہم نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی سے مشورہ کر کے ایک فہرست بنائی تھی کہ فلاں درجے سے لے کر فلاں درجہ کے طلبہ یہ کتابیں پڑھیں، اور فلاں درجے سے فلاں درجہ تک کے طلبہ یہ کتابیں پڑھیں، اور ہم نے یہ بھی انتظام کیا تھا کہ 'الاصلاح' میں ایک رکن کی ڈیوٹی مقرر کی تھی کہ آپ یہاں بیٹھا کریں، 'الاصلاح' کے کھلنے کا جو وقت ہے اس میں ایک گھنٹہ آپ وقت دیں کہ طلبہ کو معلوم ہو کہ ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کون سی کتابیں پڑھنی ہیں، طلبہ ان کے پاس جائیں اور کہیں کہ ہم اس درجہ کے طالب علم ہیں، بتایئے ہم پہلے کیا پڑھیں؟ بتایئے ہم تاریخ کا مطالعہ کہاں سے شروع کریں؟ بتایئے ہم سیرت میں اس وقت کون سی کتابیں پڑھیں؟ اس منزل پر کون سی کتاب مناسب ہوگی؟ یہ دو انتظامات ہم لوگوں نے کیے تھے، ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔

میں نے اتنی طوالت اور اتنی تفصیل کے ساتھ بات کردی، حالانکہ میں اس حال میں نہیں تھا، اور میں آپ سے معذرت کرنے والا تھا، کہ مجھے بعض ضرورتیں ہیں، ہمارے معزز مہمان بھی آئے ہوئے ہیں، ذہن دوسری لائن پر کام کر رہا ہے، لیکن یہ آپ کی محبت ہے، آپ کا خلوص ہے، یا اللہ تعالیٰ جو آپ سے کام لینا چاہتا ہے، اس کی اہمیت اور قدر و قیمت

ہے کہ میں نے اتنی تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا۔

بس آخر میں یہ کہنا ہے کہ انجمن الاصلاح کو محض آپ تحریر وتقریر کی مشق، مضمون نگاری سیکھنے کی جگہ نہ سمجھیں، بلکہ یہاں سے آپ کو وہ ذخیرہ لینا ہے، وہ مواد لینا ہے کہ جس سے آپ یہاں سے نکلنے کے بعد جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو انٹلیکچول کلاس (Intellectual Class) کہلاتا ہے، ذہین طبقہ جو ہے، آپ اس کو مطمئن کرسکیں، اس میں اسلام کی ضرورت کا احساس پیدا کرسکیں اور اسلام کے بارے میں اعتماد واپس لاسکیں۔

یہاں سے لے کر انڈونیشیا اور مغرب اقصیٰ اور مراکش تک ان سب جگہوں پر اس وقت جو ڈر ہے وہ یہ کہ امریکہ اور یہودیوں اور عیسائیوں کی سازش سے ان سب جگہوں تک جراثیم پہنچ گئے ہیں کہ اسلام پر اعتماد متزلزل ہوجائے اور اسلام پر عمل کرنے کو وہ فرسودگی اور رجعت پسندی اور (Fundamentalism) سے تعبیر کرنے لگیں اور ایک پڑھے لکھے آدمی کو شرم آنے لگے کہ ہم حاشا وکلا (Fundamentalist) نہیں ہیں، آپ کو وہ کام کرنا ہے کہ لوگوں سے سینہ تان کر اور آنکھیں ملا کر یہ کہیں کہ ہاں ہم (Fundamentalist) ہیں، اور ہمارے نزدیک (Fundamentalist) ہی دنیا کو بچا سکتا ہے، اور ساری خرابی اور سارا فساد (Fundamentalism) نہ ہونے کی وجہ سے ہے، کوئی اصول نہیں، کوئی معیار نہیں، کوئی حدود نہیں، صرف نفس پرستی ہے، صرف خواہش پرستی ہے، صرف اقتدار پرستی ہے، صرف سیاست پرستی ہے، اس لیے آپ کو بھی تیاری کرنی ہے۔[1]

---

(۱) انجمن الاصلاح خورد، رواق سلیمانی، ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے افتتاحی جلسہ میں ۲۱؍ذیقعدہ ۱۴۱۳ھ کو کی گئی تقریر، یہ تقریر عبداللہ وسیم ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ، (شمارہ ۲۵؍مئی ۱۹۹۳ء)۔

حفاظتِ دین کے مراکز

میرے عزیزو! کوئی عملی بات، مخلصانہ مشورہ، ہدایت اور نصیحت انفرادی طور پر کی جاتی ہے تو اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے اور اثر بھی زیادہ ہوتا ہے، لیکن اگر یہی باتیں جلسۂ عام میں کی جاتی ہیں تو جتنا مجمع زیادہ ہوتا ہے، اسی اعتبار سے حصہ رسدی کم ہو جاتا ہے، اندیشہ ہے کہ آپ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ ایک عام تقریر ہے جو جلسۂ عام میں کی جاسکتی تھی، کسی پبلک ہال میں کی جاسکتی تھی، تو ہم آپ سے یہ درخواست کریں گے کہ آپ یہ نہ سمجھیں، بلکہ یہ سمجھیں کہ جیسے آپ پانچ، سات، دس آدمی ہمارے پاس آئے اور کہا کہ آپ ہمیں مشورہ دیجیے کہ ہم دارالعلوم کے نظامِ تعلیم، اس کے نصاب درس، یہاں کے اساتذہ اور علمی ماحول سے کیسے فائدہ اُٹھائیں؟ ہم اپنی زندگی کو کس رخ پر ڈالیں اور کن مقاصد کو ہمیں اپنانا چاہیے؟ دارالعلوم کے مطالبات اور تقاضے کیا ہیں؟ ہم اپنی استعداد کیسے پختہ کریں تاکہ دورِ جدید کے فتنوں کا مقابلہ کرسکیں؟ آپ نے ہم سے عزیزانہ، سعیدانہ، اور فرزندانہ طریقہ پر سوال کیا، جیسے آپ رائے بریلی یا مہمان خانہ میں ہم سے سوالات کرتے ہیں، ہم بھی آپ سے اسی طرح باتیں کریں گے، آپ بھی ان باتوں کو سنیے گا، اسی کان سے سنیے گا، اور اسی دل سے قبول کیجیے گا۔

دارالعلوم کی بنیاد اور اس کی علمی وفکری ترقی کا معیار کیا ہے؟

عزیزو! پہلی بات آپ کو یہ معلوم ہونی چاہیے کہ آپ جس دارالعلوم میں پڑھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جس ادارے میں آپ کو پڑھنے کا موقع دیا، اور شرف بخشا ہے، اس کی بنیاد

کیا ہے؟اس کی علمی وفکری ترقی کا معیار کیا ہے؟

تاریخ کے ایک مصنف اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلیمی ،فکری ہی نہیں ، بلکہ خاندانی تعلق کی بنیاد پر کہتا ہوں، اور اس بنا پر کہتا ہوں کہ ندوۃ العلماء کے بانیوں کے حالات سے الگ الگ واقف ہوں، ایک ایک کے مسلک، ایک ایک کے مقاصد اور ایک ایک کی فکر سے واقف ہوں، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دار العلوم ندوۃ العلماء (اور دوسرے صحیح الفکر و الاعتقاد مدارس) ہندوستان کی دو عہد ساز شخصیتوں کے مدرسۂ فکر پر قائم ہوا ہے، ایک حضرت مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (م ۱۰۳۴ھ)، دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ)، یہ دو اس کے اصل بانی، اس کے روح رواں، اس کے رہبر اور معیار ہیں، اس کی علمی ترقی کا بھی معیار ہیں، اور اس کے فکری ارتقاء کا بھی معیار ہیں، اور اس فکر کی اشاعت اور جدّ وجہد کا بھی معیار ہیں۔

اس دار العلوم کے اصل بانی دو شخصیتیں ہیں: ایک مجدد الفِ ثانیؒ اور دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔

یہی دو اس کے روح رواں، اس کے رہبر اور معیار ہیں، اس کی علمی اور فکری ارتقاء کا معیار بھی یہی دونوں ہیں۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں

حضرت مجدد الفِ ثانیؒ وہ ہیں جنہوں نے پورے برصغیر میں انقلاب برپا کردیا، جن کے مکاتیب آپ کو پڑھنا چاہیے، ہم آپ کو مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ یہیں یا یہاں سے نکلنے کے بعد ان کے مکتوبات پڑھیں، اب ہندستان میں بہت کم لوگ رہ گئے ہیں جو ان کے مکتوبات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، خدا آپ کو اس کی توفیق دے کہ آپ ان کے مکتوبات پڑھیں، یا کم از کم یہاں کے زمانۂ قیام میں 'تاریخ دعوت وعزیمت' کا چوتھا حصہ پڑھیں، جو انھیں کے حالات کے ساتھ مخصوص ہے، اقبال نے بہت صحیح ان کا تعارف کرایا ہے۔

وہ ہندمیں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار

یہ وہ مجدد صاحب ہیں جو بدعت حسنہ کے بھی قابل نہیں، میں آپ کو ان کے ایک مکتوب کا اقتباس سناتا ہوں، جس میں دین کی حمیت اور شریعت کے بارے میں ان کی غیرت وحساسیت صاف نظر آتی ہے۔

ایک معاصر نے اپنے خط میں شیخ عبدالکریم یمنی کی (جو غالباً شیخ محی الدین ابن عربی اور بعض مشائخ تصوف سے متاثر تھے) ایک ایسی تحقیق لکھی جو اہل سنت والجماعت اور اجماع امت کے خلاف تھی، حضرت مجدد صاحب نے اس کے جواب میں جو طاقتور مکتوب لکھا، اس کی نظیر نہیں ملتی، فرماتے ہیں:۔

''مخدوما! ایں فقیر تاب استماع ایں چنیں کلمات ندارد، بے اختیار رگ فاروقیم درحرکت می آید، شیخ عبدالکبیر یمنی باشد یا محی الدین بن عربی، مارا محمد عربی درکارست نہ ابن عربی، فتوحات مدنیہ از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ اند، مارا بہ نص کار است نہ بہ فص''۔ (۱)

شیخ محی الدین ابن عربی جن کے ذریعہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ تمام دنیا میں پھیلا، اور بڑے بڑے عارفین باللہ اور بڑے بڑے مشائخ اس کے قائل ہی نہیں، اس کے داعی بلکہ اس پر مصر تھے، ان کی دو کتابیں ہیں: ایک فتوحات مکیہ ہے، جس میں انہوں نے وحدۃ الوجود کے عقیدہ کی صاف صاف تبلیغ کی ہے، اور اس کو پیش کیا ہے، دوسرے فصوص الحکم۔

مجدد صاحب فرماتے ہیں:۔

''مخدوما! اس طرح کی باتوں کے سننے کی میرے اندر تاب بھی نہیں، بے اختیار میری رگ فاروقی حرکت میں آجاتی ہے، اور تاویل وتوجیہ کا موقع نہیں دیتی، ایسی باتوں کے قائل

---

(۱) مکتوب ۲/۱۰۰ بنام ملا حسن کشمیری

شیخ کبیر یمنی ہوں یا شیخ اکبر شامی، ہمیں کلام محمد عربی (علیہ وعلی آلہ الصلاۃ والسلام) درکار ہے، نہ کہ کلام محی الدین بن عربی، صدر الدین قونوی، اور شیخ عبد الرزاق کاشی، ہم کو نص سے کام ہے، نہ کہ فص سے، فتوحات مدینہ نے فتوحات مکیہ سے مستغنی بنادیا۔"

یہ سب مجدد صاحبؒ کا فیض ہے

جس وقت ہندوستان کے تخت پر ۹۶۴ھ میں جلال الدین اکبر بیٹھا ہے، اسلام کی آمد پر ایک ہزار سال ہو رہے تھے، ایرانیوں کی ایک جماعت نے ایک گہری سازش کی کہ پوری دنیا کو یہ باور کرائیں کہ اسلام اور دین محمدی کا دور ختم ہو گیا، اس جماعت نے یہ اصول اکبر کے ذہن نشین کرادیا، کہ ہر مذہب کی عمر ایک ہزار (۱۰۰۰) سال ہوتی ہے، یہودیت ہزار سال رہی پھر ختم ہو گئی، عیسائیت ختم ہوئی، پھر اسلام آیا، اب اس کو ایک ہزار سال ہو رہے ہیں۔

اس جماعت نے اپنی ذہانت سے سمجھا کہ اس بات کو قبول کرنے اور اس کو پوری طاقت سے نافذ کرنے والا وہ ہو سکتا ہے جو زیادہ پڑھا لکھا اور متشرّع نہ ہو، اس جماعت نے اکبر کا انتخاب کیا جس کی سمجھ میں ان کی یہ بات آ گئی اور وہ الحاد کے راستہ پر پڑ گیا، وہ برہمنوں، پنڈتوں اور علماء کو جمع کرا کے بحث کرواتا تھا، پھر لادینیت کو تسلیم کیا جاتا تھا۔

ایسے نازک وقت میں مجدد صاحبؒ اور ان کا خاندان سامنے آتا ہے، اس خاندان نے اس ملک کو اس خطرہ سے محفوظ کر دیا کہ یہاں لادینیت کا دور دورہ ہو جائے، اسلام کا رشتہ اس ملک سے کٹ جائے اور دینی حس ختم ہو جائے۔

میں آپ سے صاف کہتا ہوں، اور خانۂ خدا میں بیٹھ کر کہتا ہوں کہ اس ملک میں دین جتنا اور جہاں بھی صحیح شکل میں پایا جاتا ہے، اس میں بڑا حصہ حضرت مجددؒ صاحب اور ان کے خاندان کا ہے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ نے تقریر کرتے ہوئے ایک بار فرمایا کہ لوگ اس تاریخی حقیقت پر غور نہیں کرتے، سرسری انداز میں گزر جاتے ہیں کہ عام طور

پر جب بادشاہ جاہل ہو، مخالف دین ہو، اس میں کوئی خرابی ہو، تو اس کے بعد اس کا جو جانشین آتا ہے وہ اس سے بدتر ہوتا ہے، وہ اس میں اپنی سعادت سمجھتا ہے کہ اپنے والد اور سابق بادشاہ کے طریقہ پر قائم رہے، لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ اکبر کے بعد جب جہانگیر ہوا تو وہ اس سے بہتر ہوا، دین پر قائم رہا، اور بعد میں حضرت مجدد صاحبؒ کا معتقد بھی ہو گیا تھا، پھر جہانگیر کے بعد شاہ جہاں ہوا تو اس سے بہتر تھا، وہ جب تخت طاؤس پر بیٹھا جو بڑے فخر کی بات تھی تو وہ اتر گیا، نماز پڑھی اور سجدہ کیا اور کہا کہ فرعون بڑا کم عقل اور کم ظرف تھا کہ مصر کے تخت پر بیٹھا اور خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا، میں تخت طاؤس پر بیٹھ کر سجدہ کرتا ہوں، شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب عالم گیر ہوا (جن کو ہمارے فاضل دوست و ادیب شیخ علی الطنطاوی چھٹے خلیفۂ راشد سے تعبیر کرتے ہیں، ان کے نزدیک حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے بعد پورے عالم اسلام میں عالم گیر جیسا متبع سنت، صاحب حمیت اور اسلامی قانون اور اسلامی شریعت کا جاری کرنے والا پیدا نہیں ہوا) اس میں جو راز ہے وہ یہ کہ حضرت مجدد الفِ ثانیؒ اور ان کا خاندان اندر اندر کام کر رہا تھا، اور متاثر کر رہا تھا، حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ جو حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کے ممتاز ترین فرزند تھے، اور جن سے ان کا سلسلہ پھیلا ہے، وہ عالم گیر کو شہزادگی کے دور میں جب خط لکھتے تو انہیں ''شہزادۂ دین پناہ'' سے خطاب کرتے۔

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ دار العلوم ندوۃ العلماء اور صحیح الفکر و حاملِ دعوت مدارس و مراکز باقی رہیں گے، اور اگر خدا کو ان کی حفاظت مطلوب اور محبوب ہے تو حضرت مجدد الفِ ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے راستہ پر رہیں گے، اگر یہ دار العلوم دونوں کے راستہ سے ہٹا تو یہ دار العلوم وہ دار العلوم نہیں ہوگا، جس کی بنیاد حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوریؒ، مولانا سید عبد الحی رائے بریلویؒ، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوریؒ، منشی اطہر علی کاکورویؒ اور مولانا شبلی نعمانیؒ نے ڈالی تھی، یہ بات آپ یاد رکھیے کہ یہ دار العلوم حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے راستہ پر ہے۔

امتیازی خصوصیات

عزیزو! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان دونوں کے طریقۂ عمل، ان کی دعوت، ان کی تحریک اور ان کی جدوجہد کی چند امتیازی خصوصیات ہیں:-

(۱) عقیدۂ اسلام:- سب سے پہلے اس اسلامی عقیدہ کو پورے طور پر قبول کر لینا جو صحابۂ کرام کا عقیدہ تھا، جو تابعین عظام، ائمہ اربعہ اور مجددین اور مصلحین کا عقیدہ تھا۔

(۲) دوسری بات ہے: اشاعت دین، یعنی اس دین کی اشاعت وتبلیغ کی جائے۔

(۳) اور تیسری بات جو ان دونوں حضرات کا خاصہ ہے، وہ: ''حمایتِ دین'' بلکہ ''حمیتِ دین'' ہے، بہت سے ایسے حضرات ہیں، ہم ان کی قدر کرتے ہیں، احترام کے ساتھ ہم ان کا نام لیتے ہیں، ان کے یہاں اشاعت دین کا جذبہ تھا، لیکن وہ چیز جس کو دینی غیرت اور حمیت کہتے ہیں، وہ ان کے یہاں یا کم از کم ان کے حالات میں زیادہ نمایاں نہیں معلوم ہوتی، ان دونوں حضرات کی خصوصیت یہ ہے کہ اشاعت دین کے ساتھ حمیت بھی تھی، یہ بہت اہم چیز ہے، کہ دین مخالف اور اس کے منافی کوئی چیز برداشت نہ ہو، اس کی نیند اڑ جائے، کھانا پینا بھول جائے اور اس کو ایک سخت کرب اور شدید درد لاحق ہو جائے، یہ بات اور حضرات میں تھی، لیکن ان دو حضرات میں سب سے نمایاں تھی۔

شاہ ولی اللہؒ کی خصوصیت اور ان کے کارنامے

حضرت شاہ صاحبؒ نے ہماری معلومات کے مطابق سب سے پہلے ہندوستان میں حدیث شریف کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا، وہ حجاز گئے اور وہاں عرب اساتذہ سے انہوں نے حدیث پڑھی اور اس کی سند حاصل کی، پھر یہاں آکر انہوں نے حدیث کا درس شروع کیا، ہماری محدود معلومات کی حد تک صحاح ستہ کی تدریس کا رواج اس سے پہلے ہندوستان میں نہیں تھا، یہ کام حضرت شاہ صاحب نے شروع کیا، آپ کسی عالم سے حدیث پڑھیے اور سند لیجیے تو یہ سلسلہ شاہ ولی اللہؒ تک پہنچتا ہے، پھر اور یمنی اور حجازی سلسلہ ہے، خاص طور پر صحیحین

کا درس، پھر ان کی شرح و تحشیہ کا کام اور ان کی خدمت۔

ان کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کے تراجم کا سلسلہ شروع کیا، یہ بات شاید بہت سے لوگوں کے لیے انکشاف ہوگی کہ یہاں کے بہت سے علماء قرآن مجید کا دوسری زبانوں میں ترجمے کو خطرناک سمجھتے تھے، اس کی دو وجہ تھی، ایک تو یہ کہ جو اہلِ ہوئی و ہوس تھے، وہ سمجھتے تھے کہ اس سے ہماری فرماں روائی چلی جائے گی، ہماری سرداری اور ہمارے مطاع ہونے کی جو حیثیت ہے، اور ہماری بات کو اللہ و رسول کی بات کی طرح لوگ سمجھتے ہیں، ہماری یہ حیثیت ختم ہو جائے گی، ہماری خیریت اسی میں ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ یہاں کی زبانوں میں نہ ہو، ایسے دنیا پرست علماء قرآن مجید کے ترجمہ کو بدعت بتاتے ہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

شاہ صاحب نے اس کی طرف توجہ کی، ان کے دونوں صاحبزادوں نے اردو میں ترجمے کیے، ایک شاہ رفیع الدین کا ترجمہ جو لفظی ہے، اور ایک شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ جو بے نظیر ہے، اس میں خاص اللہ تعالیٰ کی مدد معلوم ہوتی ہے، اگر وقت ہوتا تو میں تفصیل سے آپ کو مثالیں دے کر بتاتا۔

یہاں صرف دو مثالیں دیتا ہوں، قرآن مجید میں ہے: ﴿قَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ﴾ [1] زمخشری جیسے ادیب مفسر کو بھی ''عزّۃ'' کا مفہوم ادا کرنے میں دشواری پیش آئی ہے، عام طور پر اس کا ترجمہ ''فرعون کی عزت'' ''فرعون کا غلبہ'' کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے، شاہ صاحب جو دہلی کے رہنے والے تھے، وہ درباری زبان سے واقف تھے، اور محاوروں کو بھی جانتے تھے، وہ خود فرماتے تھے کہ جب کسی آیت کا ترجمہ سمجھ میں نہیں آتا تو بازار چلا جاتا تھا، لوگوں کی باتیں سنتا کہ وہ کس طرح اس مفہوم کو ادا کرتے ہیں، شاہ صاحب نے ''بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ'' کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: ''فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب ہوں گے''، درباریوں اور خوشامدیوں کی زبان ایسی ہی ہوتی ہے۔

---

(۱) سورۃ الشعراء: ٤٤

شاہ صاحب نے اپنے ترجمہ میں صوتی آہنگ کا بھی خیال رکھا ہے، ﴿فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيراً﴾ (۱) کا ترجمہ کیا ہے: ''تب اکھاڑ مارا ان کو اٹھا کر''۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا تیسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توحید خالص پر بہت زیادہ زور دیا، ان کے پوتے حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ نے کتاب ''تقویۃ الایمان'' لکھی، جس سے زیادہ صاف، واضح اور طاقتور کتاب توحید کے موضوع پر ہمارے علم میں نہیں، اس کتاب کے بارے میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ اس سے ہزاروں نہیں لاکھوں لوگوں کو ہدایت ملی ہے، حضرات علمائے دیوبند و مظاہر علوم اور علمائے ندوہ سب اس کے قائل تھے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے (اللہ ان کے درجات بلند فرمائے) ہمیں اس کتاب کے عربی میں ترجمہ کا حکم دیا، ہم مدینہ منورہ میں تھے، جانا بھی تھا، گاڑی مسجد نبویؐ کے دروازہ مجیدی پر کھڑی تھی، سامان رکھا جا چکا تھا کہ نماز پڑھیں اور روانہ ہو جائیں، حضرت شیخ الحدیث نے پیغام بھیجا کہ ترجمہ کا کام شروع کر کے جائیں، ہم نے روضة من رياض الجنة میں عزیزی محمد واضح سلمہ کو سامنے بٹھا کر ترجمہ کا کام شروع کر دیا، ہمیں صاف معلوم ہوا کہ یہ کتاب عند اللہ و عند الرسول مقبول ہے، جو کچھ لکھا تھا وہ حضرت شیخ کو سنایا گیا، حضرت نے سن کر بڑی دعائیں دیں، جب اس کتاب کا ترجمہ ''رسالة التوحید'' کے نام سے مکمل ہو کر شائع ہو گیا، تو ہم نے ایک بڑے سعودی عالم جو جامعہ اسلامیہ کے استاذ بھی تھے، ان کو یہ کتاب پڑھنے کو دی، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شیخ محمد بن عبد الوہابؒ کی کتاب ''کتاب التوحید'' سب سے بڑھی ہوئی ہے، اور ان کے متبعین تو اس کے سوا کسی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، لیکن انہوں نے سعودی اور ''وہابی'' ہونے کے باوجود صاف صاف کہا کہ ''یہ تو توحید کی منجنیق ہے، یہ تو پتھراؤ کرتی ہے''۔

تو شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خاندان نے توحید خالص، قرآن کی اشاعت اور

---

(۱) سورة الإسراء: ۱۶

حدیث شریف کی خدمت انجام دی، آج اس ملک میں جہاں بھی حدیث شریف پڑھائی جاتی ہے، وہ سب شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خاندان کا فیض ہے۔

شاہ صاحب نے اس پر اکتفا نہیں کر لیا، بلکہ انھوں نے اپنی خداداد فراست سے محسوس کیا کہ اب جو دور آنے والا ہے وہ عقلی دور ہوگا، عقلی طور پر متاثر کرنے والا دور ہوگا، اس کے لیے انھوں نے ''حجة الله البالغة'' جیسی بے نظیر کتاب لکھی، جو جدید علم کلام کا بہترین نمونہ ہے۔

یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ جہاد کی تحریک شاہ صاحبؒ ہی کے زمانہ سے شروع ہوئی، مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے (جن سے دہلی کے مسلمانوں کی جان اور عزت محفوظ نہیں تھی) شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو افغانستان سے بلایا، جس نے مرہٹوں کو ایسی شکست فاش دی کہ تاریخ میں لکھا ہے کہ مرہٹواڑہ میں کوئی گھر نہیں بچا جہاں ماتم نہ ہوا ہو، سب سے پہلے حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔

ٹیپو سلطان شہیدؒ کا بھی روحانی تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ کے خانوادہ سے تھا، انگریزوں کے حقیقی خطرہ کا ادراک سلطان ٹیپو نے کیا، اس کے خاندان کا تعلق روحانی حضرت سید احمد شہیدؒ کے نانا شاہ ابو سعیدؒ، حقیقی چچا سید نعمانؒ، خاص طور سے شاہ ابو اللیثؒ سے تھا، جو سید صاحب کے حقیقی ماموں تھے۔

عزیزو! ایک جسمانی نسب نامہ ہوتا ہے، ایک علمی و دینی نسب نامہ ہوتا ہے، اور ایک اعتقادی نسب نامہ ہوتا ہے، آپ اس علمی و فکری نسب نامہ کو ہمیشہ یاد رکھیے، اس نسب نامہ کو آپ نہ یہاں بھولیے اور نہ اپنے گھر جا کر بھولیے کہ ہم سب حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خاندان کے فیض یافتہ اور ان کے تربیت یافتہ ہیں۔

نئے دور کے فتنوں کے مقابلہ میں ندوۃ العلماء کا کارنامہ

عزیزو! ندوۃ العلماء نے اپنے قیام کے بعد ہی سے وقت کے فتنوں کو نہ صرف پہچانا،

بلکہ ان کا مقابلہ بھی کیا، ان فتنوں میں قادیانیت اور عیسائیت کے فتنے تھے، جن کا مقابلہ بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے کیا، ہم نے خود یہ واقعہ مونگیر میں سنا کہ جب قادیانیوں کا بہار میں خطرہ محسوس ہوا، تو مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے مولانا مرتضٰی حسن چاند پوریؒ کو قادیانیوں سے مناظرہ کے لیے مدعو کیا، ادھر مولانا مرتضٰی حسن چاند پوری قادیانیوں سے مناظرہ کر رہے تھے، ادھر مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سجدہ میں دعا وگریہ زاری میں مصروف تھے، یہاں تک کہ کسی نے آ کر سنایا کہ قادیانیوں کو شکست ہوئی اور جوتے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں، تب جا کر مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے سجدہ سے سر اٹھایا۔

دوسرا فتنہ ''روشن خیالوں'' کا تھا جنھوں نے ایک بڑا ادارہ قائم کیا، اس جماعت کے لکھنے والوں نے دین کے حقائق کو بدل کر پیش کیا، اس کی وجہ سے اسلامی عقیدہ میں ایک تزلزل اور خطرہ پیدا ہوا، ان روشن خیالوں کا سب سے بڑا نشانہ غیبی حقائق اور معجزات تھے، وہ معجزات کی ایسی تاویل کرتے کہ وہ معجزہ ہی نہ معلوم ہوتا، اپنی تفسیروں میں انھوں نے خاص طور سے اس پر زور دیا۔

ندوۃ العلماء نے اس طبقہ کو راہ راست پر لانے کے لیے اپنے نصاب میں انگریزی کا اضافہ کیا، اس کے ساتھ اس نے اس بات پر بھی زور دیا کہ نئے اسالیب بیان اور نئے طرز فکر سے طلبہ واقف ہوں، اور کون سا فتنہ کہاں اٹھ رہا ہے؟ اور کیوں یہ فتنے اٹھ رہے ہیں؟ اور کس زبان اور اسلوب میں اٹھ رہے ہیں؟ ان سے واقف ہوں۔

ان روشن خیالوں کے مقابلے کے لیے علامہ شبلیؒ کا قلم چلا، پھر مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبد الباری ندویؒ کا قلم چلا، پھر تو ندوی فضلاء نے ان فتنوں کا بھی تعاقب کیا جو عالم عربی میں قومیت عربیہ اور ''تجدد وتنور'' کے نام سے اٹھے تھے۔

ندوۃ العلماء کے بانیوں اور منتظمین نے ہمیشہ نصاب کو ''وسیلہ'' سمجھا، ''غایت'' نہیں، غایت ومقصد میں ترمیم نہیں ہوتی، لیکن وسیلہ میں ترمیم ہوتی ہے، درس نظامی میں بھی برابر ترمیم ہوتی رہی، ہمارے والد صاحب مولانا حکیم سید عبد الحئیؒ کا فاضلانہ مقالہ ''ہندوستان کا

نصاب درس اور عہد بعہد اس کے تغیرات'' کا آپ مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ کس دور میں کون سی کتاب پڑھائی جاتی تھی، اور کب اس میں تبدیلیاں ہوئیں، اس طرح ندوۃ العلماء نے اپنے نصاب میں تاریخ اور جغرافیہ کا بھی اضافہ کیا۔

عربی زبان کی تدریس ایک زندہ زبان کی حیثیت سے

عزیزو! ندوۃ العلماء کے بانیوں اور اس کے روشن ضمیر کارکنوں نے اس وقت یہ محسوس کر لیا کہ اب تک دینی مدارس میں عربی زبان اس حد تک پڑھائی جارہی ہے کہ تفسیر وحدیث اور فقہ کی کتابیں سمجھ سکیں (اللہ تعالیٰ ان مدارس کے بانیوں کی محنتوں اور کوششوں کو قبول فرمائے) لیکن اب جو دور آنے والا ہے، اس میں اس سے کام چلنے والا نہیں ہے، اب تو عربی زبان کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے کہ وہ دعوت اور تصنیف وتقریر کی بھی زبان ہے، پڑھایا جانا ضروری ہے، اس زمانے میں ہندوستان کا عالم عربی سے زیادہ تعلق بھی نہیں تھا، صرف حجاج کی حجاز آمد ورفت رہا کرتی تھی، حیرت ہوتی ہے کہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے حجاز کے دوران قیام میں ہمارے والد صاحب کو خط لکھا تھا کہ یہاں ایک عالم جن کو عربی پر بڑی قدرت ہے، عربی میں اچھی تقریر کرتے ہیں، میں ان کو راضی کر رہا ہوں، کہ وہ دار العلوم جائیں، اور وہاں عربی زبان کا درس دیں، آپ اس کا خیال رکھیے کہ طلبہ کو عربی زبان میں مہارت پیدا ہو، اور اس میں وہ تقریر کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبد العلی صاحبؒ کی نگرانی و ہدایت پر ندوۃ العلماء نے عربی کے ابتدائی نصاب کی ترتیب کا کام شروع کیا، جو اس کے بنیادی مقاصد میں سے ایک تھا، اور وہ عالم عربی میں بھی مقبول اور کہیں کہیں رائج ہوا۔

اپنی استعداد کیسے مضبوط بنائیں؟

عزیزو! دنیا کی تمام زبانوں میں عربی زبان سب سے زیادہ حساس، ذکی الحس اور غیرت مند زبان ہے، ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ قرآن کی زبان ہے، پیغام الٰہی کی زبان ہے،

تعلیمات نبوی ؐ کی زبان ہے، اس کے علاوہ دو چیزیں اور ہیں، ایک اعراب جو کسی اور زبان میں نہیں، دوسرے مختلف المخارج اور مختلف الاصوات حروف جو دوسری زبان میں نہیں، ذراسی غلطی سے، زیر کو زبر اور منصوب کو مجرور پڑھنے اور 'ث' کو 'س' کی طرح بولنے سے سب پر پانی پھر جائے گا، آپ ایسی استعداد بنائیے کہ صحیح اعراب پڑھ سکیں، اور صحیح مخارج سے حروف کو ادا کر سکیں۔

ایک بار ہمیں جامعہ دمشق میں جس کا وائس چانسلر ایک عیسائی فاضل تھا اور جس کے جلسے میں فضلائے دمشق اور ممبران پارلیمینٹ شریک ہونے والے تھے، فلسطین کے قضیہ پر مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی، ہم نے ''العوامل الأساسية لكارثة فلسطين'' (المیۂ فلسطین کے بنیادی اسباب) کے موضوع پر مقالہ لکھا، اس کو جلسہ میں پڑھنے سے پہلے احتیاط کے طور پر علامہ بهجة البيطار کی خدمت میں گئے، اور عرض کیا کہ آپ ہمارے استاد مولانا سید سلیمان ندوی ؒ کے دوست ہیں، براہ کرم آپ ہمارا یہ مقالہ سن لیجیے کہ شاید کوئی غلطی ہو، انہوں نے فرمایا کہ نہیں، تم کو اس کی کوئی ضرورت نہیں، تم تو ماذا خسر العالم کے مصنف ہو، پھر بھی ہم نے ان کو اپنا مقالہ پورا سنا دیا، انہوں نے کہیں نہیں ٹوکا، ہم سے کہا کہ آپ 'الف لام' کا استعمال کرنے میں بہت محتاط ہیں، ہندوستانی علماء جا و بے جا 'الف لام' استعمال کرتے ہیں، پھر انہوں نے ایک لطیفہ سنایا کہ ایک ہندستانی عالم ایک عرب عالم کے پاس آئے اور کہا کہ أَنَا ذَاهِبٌ مِنَ الْمَكَّة إِلَى مَدِيْنَة، فَهَلْ لَكَ حَاجَةٌ؟ اس جملہ کو سن کر عرب عالم نے کہا کہ حَاجَتِي الوَحِيْدَةُ أَن تَأْخُذَ الْأَلِفَ وَاللَّامَ مِنْ مَكَّةَ وَتَضَعَهُمَا عَلَى الْمَدِيْنَةِ، 'الف لام' ان عالم صاحب نے مکہ پر لگا دیا، جبکہ اس پر الف نہیں آتا۔

ہم سے بعض عربوں نے شکایت کی کہ ہندوستان کے عالم و داعی آتے ہیں، مساجد میں ان کی تقریر کا اعلان ہوتا ہے، ہم بیٹھ جاتے ہیں، لیکن چند ہی جملوں کے بعد بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کو عرب ممالک نہیں جانا ہے، آپ کو جانا ہے، لیکن ملازمت

کے لیے نہیں، امام وخطیب بن کرنہیں، صرف پیسہ کمانے کے لیے نہیں، بلکہ داعی بن کر یا معلم بن کر جانا ہے، آپ ابھی سے درسی استعداد پختہ کریں تا کہ کوئی اعرابی غلطی نہ ہونے پائے، جو بھی درسی کتاب پڑھیں، پوری توجہ اور انہماک سے اس کی تیاری کریں، اپنے فاضل اساتذہ سے معلوم کریں کہ ان کی مستند شرحیں اور مصادر و مراجع کون سے ہیں، پھر ان کا گہرا مطالعہ کریں، اور بھر پور علمی تیاری کریں۔

آخری بات

آخری بات یہ ہے کہ آپ علوم دینیہ میں رسوخ پیدا کیجیے، یہاں جو علمی و دینی ماحول ہے، آپ کے جو مشفق اساتذہ ہیں، ان سے فائدہ اٹھایئے، یہ فضا اور ماحول اور اساتذہ آپ کو کالجوں، یونیورسٹیوں میں نہیں ملیں گے، ہم نے مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے بارے میں کہا تھا کہ ان کی ایک بڑی خصوصیت رسوخ فی العلم تھی، بہت سے علماء ایسے ہیں جو دوسرے کاموں میں لگ جاتے ہیں تو ان کے علم میں رسوخ نہیں رہتا۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یہاں سے صحیح الفکر بنا کر، کامل مدرس اور پختہ کار مصنف اور مبصر بنا کر، اور داعی بنا کر نکالے، اور جو فتنے اٹھ رہے ہیں جیسے قادیانیت، الحادو دہریت، اور روشن خیالی کے فتنے، کہ دین پر کھلی تنقید کرتے ہیں، اور کفر و ایمان اور حلال اور حرام کی تمیز نہیں کرتے، ان سب فتنوں کا آپ کو مقابلہ کرنا ہے، آخری بات یہ ہے کہ آپ سب کو مجدد الف ثانیؒ، اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مسلک، ان کے مکتب خیال اور مدرسۂ فکر پر چلنا ہے، اور اسی میں اپنی سعادت سمجھنا چاہیے۔ وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین۔ (۱)

---

(۱) دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی مسجد میں طلبہ و اساتذہ کے سامنے ۲۳ رصفر ۱۴۱۸ھ مطابق ۳۰ رجون ۱۹۹۷ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی نے قلمبند کی، اور ''تعمیر حیات'' (شمارہ ۱۰ راگست ۱۹۹۷ء) میں شائع ہوئی، پھر حضرت مولاناؒ کی نظر ثانی اور خفیف ترمیم واضافہ کے بعد علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوئی۔

چراغ سے چراغ جلتے ہیں

عزیز طلبہ! مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر کوئی قیمتی سے قیمتی بات اور مخلصانہ سے مخلصانہ مشورہ ہوسکتا ہے تو اس کے مستحق آپ ہیں، آپ کا یہاں آنا خواہ آپ کی رضا اور آپ کے شعور سے نہ ہو، لیکن یہاں آپ کا طویل قیام، ہماری طرف انتساب اور ہمارے دارالعلوم کی طرف انتساب یہ تمام امور اس بات کے لیے کافی ہیں کہ ہم اپنے سینے میں اس عمر میں جو بہتر سے بہتر چیز رکھتے ہوں وہ پیش کریں، ہمارے اوپر شرعاً واخلاقاً یہ ذمہ داری ہے اور ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ آپ کے سامنے بہتر سے بہتر مشورہ پیش کریں، کئی سال سے اس کے مواقع آتے رہے اور آپ سے کچھ کہنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے، اور ہمیشہ میں دو تین باتوں پر خاص زور دیتا رہا ہوں۔ میں آج آپ سے صرف ایک بات کہوں گا، بقیہ چیزوں کو قصداً بیان نہیں کرتا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سب باتیں بیکار ہیں، نہیں، وہ سب انتہائی مفید اور کارآمد ہیں لیکن یہ وقت اس کے لیے کافی نہیں۔

قانون الٰہی

اللہ تعالیٰ کے بہت سے قوانین ہیں جو ہزاروں لاکھوں برس سے چلے آرہے ہیں، اور ہم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہزاروں برس سے اٹھاتے رہے ہیں، زمین سے فائدہ اٹھانے کا اور زراعت کا ایک قانون ہے، اس سے انسان خواہ وہ دینی معاملے میں نبی کے درجے کا ہو یا دنیاوی امور میں بڑے سے بڑا صاحب تدبیر اور بڑے سے بڑا صاحب شمشیر بادشاہ ہو، کوئی اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا، وہ قانون ہے کہ پہلے زمین کو جوتیے، پھر اس میں

بیج ڈال لیے، محنت کیجیے، آسمان سے بارش ہو، پھر کھیتی آگے بڑھے، تب جا کر کاٹنے کی نوبت آئے گی۔

درختوں کے نشو ونما اور پھلنے پھولنے کا ایک قانون ہے، مثلاً کھجور ہی کو لیجیے، جب تک کہ ایک کو کاٹ کر دوسرے میں نہ لگائیے جس کو عربی میں تلقیح یا تأبیر النخل کہتے ہیں، پیداوار ٹھیک طور پر نہیں ہوگی، چنانچہ دنیا کی اعلیٰ ترین ہستی جس کا اللہ کے نزدیک سب سے اونچا درجہ ہے، جس کے لیے کائنات کا دھارا بدل دیا گیا، اس نے بھی دیکھا تو کہاں ایسا کیوں کرتے ہو؟ لوگوں نے اس تدبیر کو چھوڑ دیا تو پھل خراب آئے، چنانچہ کائنات کی اس سب سے اشرف زبان نے بھی کہہ دیا: "أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ"۔ (١)

اسی طرح دنیا کے ذرے ذرے کا قانون ہے جو ہمیشہ سے جاری ہے، لیکن میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ قانون یہ ہے کہ انسانی زندگی کی تکمیل انسانی زندگی سے ہوتی ہے، فلکیات، طبعیات، عمرانیات اور طبقات الارض غرضیکہ دنیا کے تمام علوم وفنون کے کچھ اصول اور قوانین ہیں، سب نے ان کا احترام کیا اور ان سے فائدہ اٹھایا، اسی طرح اللہ کا قانون ہے کہ انسانی زندگی کا چراغ انسانی زندگی کے چراغ سے روشن ہوا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا، نہ اس کے خلاف ہوا ہے اور نہ ہوگا، انسان ہی انسان کے لیے سب سے بہترین نمونہ ہے جس میں وہ اپنے ہر ہر عمل کو دیکھ سکتا ہے، وہ اپنے ہر ہر نقص کو جانچ سکتا ہے اور پھر اس کو پورا کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

دنیا میں رسول اور نبی سے بڑھ کر نہ کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا، لیکن جب سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ (ﷺ) پر نبوت کا بار ڈالا گیا، تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کا واسطہ بنایا، آپ کے اندر رشد وہدایت کا شعلہ موجود تھا جو ہر وقت بھڑکنے کو تیار تھا، آپ کے اندر اس کی تمام صلاحیت اور استعداد تھی اور کسی استاذ کی ضرورت نہ تھی، لیکن اپنے اسی قانون کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کو بھیجا، وہ آئے، آپ سے پڑھنے کو کہا، آپ نے عذر کیا، اس کی بنا

(١) رواه مسلم في صحيحه، كتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله (الرسول ﷺ)شرعاً دون ما ذكره من معايش الدنيا على سبيل الرأي، حديث رقم ٦١٢٨ ـ

پر انھوں نے سینے سے لگایا پھر کہا: پڑھو، پھر آپ نے معذرت کی، پھر سینے سے لگایا، پھر کہا: پڑھو، پھر آپ نے معذرت کی، پھر سینے سے لگایا پھر کہا: پڑھو، تو آپ نے پڑھنا شروع کیا۔

دنیا کے تمام ماہرین نے اس کو سمجھ لیا ہے کہ انسانی زندگی کی تکمیل کے لیے محض معلومات کافی نہیں ہیں، معلومات اور ایجادات واکتشافات کی جو فراوانی اس وقت ہے وہ تاریخ کے کسی دور میں نظر نہیں آتی، لیکن تاریخ یہ بھی بتارہی ہے کہ اخلاقی پستی جو اس وقت ہے وہ کبھی نہیں تھی، اور یہ بھی خدا کی قدرت ہے کہ یورپ جو ایجادات واکتشافات کا سرچشمہ ہے، جہاں معلومات کی سب سے زیادہ فراوانی ہے، وہیں اخلاقی پستی بھی سب سے زیادہ ہے، اگر علوم وفنون کے لحاظ سے دنیا میں یورپ سب سے بڑھا ہوا ہے تو اخلاقی لحاظ سے دنیا کا سب سے تاریک ترین خطہ بھی وہی ہے، انسانی زندگی کی تکمیل کے لیے کچھ عقائد چاہئیں، کچھ اصول وقوانین چاہئیں، اور کچھ مسلمات بھی ہونے چاہئیں، اور پھر ان اصول وقوانین اور مسلمات پر عمل کرنے کے لیے قوی محرکات کی ضرورت ہے، فطری دوافع اور جذبات کی ضرورت ہے، محبت اور جذبۂ ایثار کی ضرورت ہے، ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی ہونی چاہیے، کچھ ہونے اور حاصل کرنے پر آمادگی کا اظہار ہونا چاہیے، قربانی کا جذبہ چاہیے، اپنے اندر تواضع اور بے نفسی چاہیے، لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے، ایک دوسرے سے تعاون ہونا چاہیے، اپنے مقصد میں فنائیت اور خود فراموشی کا جذبہ چاہیے، یہ سب چیزیں آپ کو صرف کتابوں سے نہیں مل سکتی ہیں، اگر صرف کتابوں اور علمی تحقیقوں سے حاصل ہو جاتیں تو آج یورپ کے مستشرقین میں دنیا کے سب سے بڑے محدث اور مفسر نظر آتے، آج غزالی اور ابن تیمیہ نہ ہوتے بلکہ نیٹشے اور رینان ہوتے، یہ سب چیزیں اگر مل سکتی ہیں تو صرف ایک جگہ سے، اور وہ ہے انسان کا سینہ، اسی سے یہ تمام چیزیں اخذ کی جا سکتی ہیں اور اسی سے انسان انسان بن سکتا ہے۔

آپ تاریخ کے کسی دور کا مطالعہ کر لیجیے، کسی ادارے یا قوم کی تاریخ کو دیکھیے، آپ دیکھیں گے کہ آج جو کچھ نظر آرہا ہے یہ سب انسان ہی کی کاریگری ہے، دنیا میں جتنے انقلابات آئے، جتنی تحریکیں اٹھیں، یہ سب انسان ہی کے ذریعہ سے ہوا، یہ جذبات و

کیفیات صرف انسان سے انسان کی طرف منتقل ہوسکتی ہیں، خدا کے صحیفوں کو دیکھ لیجیے، اللہ کے عارف بندوں کی سوانح پڑھ لیجیے، اور پھر تاریخی شہادتوں کا مطالعہ کر لیجیے، آپ دیکھیے گا کہ جب بھی انسان انسان بنتا ہے وہ ہمیشہ انسان ہی سے بنتا ہے، جب تک اس پر باہر سے انسانی جذبات و کیفیات کا افاضہ نہ ہوگا، یہ سب کچھ نہ ہوگا۔

انسان کے اندر کانوں کے پتھروں کی طرح ہزاروں سال سے بہت سے جواہرات پوشیدہ ہیں، ہزاروں چٹانوں کے نیچے کچھ پتھر مدفون ہیں لیکن وہ انسان کے کام کے نہ ہو سکے، اس کی وجہ ایک ہے، اور وہ یہ کہ ان پر سورج کی کرنیں پڑنی چاہئیں، جب تک یہ کرنیں ان کو جگمگا نہ دیں ان کی کوئی قیمت نہیں، تاریخ میں آپ دیکھیے گا کہ اگر علم و ادب، فلسفہ و فکر کے ذریعے کوئی انسان بن سکتا تو آج دنیا کے یہ بڑے بڑے مفکرین، فلاسفر اور متکلمین الحاد کی وادیوں میں نہ بھٹکتے، وہ دنیا کے عظیم ترین انسان ہوتے۔

آپ ملا نظام الدین کو دیکھ لیجیے، آج ان کا درس نظامیہ عالم اسلام کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا ہے، ان پر جب ملاّ عبدالرزاق بانسوی کی کرنیں پڑیں تو وہی ملا نظام الدین ملا نظام الدین بن گئے، اور آج دنیا میں ان کی شہرت جاودانی ہوگئی، شاہ اسماعیل شہید اور شاہ عبدالحی سے بڑا عالم کون تھا؟ ان کے اندر علم و تحقیق کے خزانے پوشیدہ تھے، لیکن انھیں بھی ضرورت محسوس ہوئی تو سید احمد شہیدؒ کا دامن پکڑا جو علم و ادب میں ان کے ہم پلہ نہ تھے، اور پھر انہی کی صحبت سے وہ بن گئے۔

انسان انسان کی صحبت سے بنا ہے

انسان انسان کی صحبت سے بنا ہے اور اسی سے بنے گا، یہی ایک آئینہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنا دیا ہے، دنیا کا ہر شخص اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، انسان کی ہم نشینی سے اخلاق رذیلہ کا ذہول ہوتا ہے، اور ایک عزم پیدا ہوتا ہے، آپ سے نماز میں سستی ہوتی ہے لیکن آپ ایک ایسے آدمی کے ساتھ رہیں جو کڑاکے کی سردی میں تہجد کی نفلیں نہیں چھوڑتا، وہ برابر اسی سردی میں وضو کرتا ہے، نماز عشاء و فجر باجماعت ادا کرتا ہے، اس کے علاوہ نفلوں اور سنن میں ہر

وقت مشغول رہتا ہے، تو آپ سے کیسے ہوگا کہ آپ دوپہر کے وقت ظہر کی نماز بھی نہ پڑھ سکیں؟ دنیا کے تمام ریاضی دانوں کا اتفاق ہے اور ریاضی کی بنیاد اسی پر ہے کہ دس پانچ سے زیادہ ہوتا ہے اور بیس دس سے زیادہ ہوتا ہے، لیکن ایسی بے شمار مثالیں ہیں جو اس سے ماوراء ہیں، ان کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کس چیز کا نام ہے، اور اسلام کس کو کہتے ہیں، اگر آپ ان کی نمازوں پر غور کریں تو آپ کہہ اٹھیں گے کہ خدا کی قسم! اگر ہماری نماز نماز ہے، تو ان کی نماز نماز نہیں بلکہ کچھ اور ہے، اور اگر ان کی نماز نماز ہے تو خدا کی قسم ہماری نماز نماز نہیں ہوسکتی، ان کے یہاں دشمن کے ساتھ محبت ہے، وہ قاتل کو سینے سے لگاتے ہیں، جو ان کے پاس قتل کے ارادے سے آئے، وہ اس کو دوست بنالیتے ہیں، جو ان کی عیب جوئی کرے، اس کو اپنا محسن مانتے ہیں، اور اپنی برائیوں پر غور کرتے ہیں، جو ان سے دشمنی کرتا ہے وہ اس کے لیے دعا کرتے ہیں، جو شخص ان کے پاس سے گزر جائے خواہ وہ سینے میں ان کی عداوت لیے ہو، خواہ ان کی برائی کرتا پھر رہا ہو، خواہ وہ ان کے قتل کے ارادے سے آیا ہو، وہ اس کے لیے دعا کرتے ہیں، اور اس کا گزرنا بھی فائدے سے خالی نہیں ہوتا ہے، اسے کچھ نہ کچھ حاصل ہوجاتا ہے۔

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ چاہے کوئی کتنا ہی بڑا عالم ہو، اور کتنا ہی بڑا محقق ہو، بغیر کسی کامل یا کامل تر انسان کی صحبت کے اس کی زندگی کی ہرگز ہرگز تکمیل نہیں ہوسکتی، یہ کوئی غلط فہمی نہیں ہے، غلط فہمی زیادہ دن نہیں رہتی ہے، اسلام کے تیرہ سو برس سے یہ قانون خداوندی چلا آرہا ہے، اور اس کی مثالیں موجود ہیں، امام غزالیؒ جیسا آدمی جن کی تعلیم و تحقیق کے سامنے آج بھی یورپ کی گردنیں جھک جاتی ہیں، آج بھی یورپ ان کا لوہا مانتا ہے، ان کی کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں اور عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، لیکن ان کا حال یہ تھا کہ وہ جب اپنے شیخ کی خدمت میں جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا ہے، شیخ ابوعلی فارمدیؒ جن کا نام آپ میں سے اکثر نہیں جانتے ہوں گے، لیکن ان کی صحبت سے امام غزالی کو کیا ملا ع

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید صبا چہ کرد

اتنے بڑے فلسفی، اتنے بڑے متکلم اور محقق کو ایک گمنام شیخ کی خدمت میں جانے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اسی شیخ کا اثر تھا کہ جب وہاں سے نکلے تو وہ چیز لے کر نکلے جس کے سامنے حکومت کا بڑا سے بڑا عہدہ ہیچ تھا، بغداد کا مسند درس جس کے سامنے بغداد کی خلافت بالکل گرد تھی، اس کے ہر فیصلہ کے سامنے حکومت کو سرنگوں ہونا پڑتا تھا، اس کو ٹھوکر مار کر چلے، زبان گنگ ہوئی اور اعضاء معطل ہو گئے، حتیٰ کہ اطباء نے کہہ دیا کہ ان کو ایسی فکر ہے جس نے تمام قویٰ کو معطل کر دیا ہے، تب امام غزالی، امام غزالی ہوئے، ورنہ بغداد میں عالموں، محققوں اور محدثوں کی کمی نہیں تھی۔

امام احمدؒ علم وفن میں کسی سے کم نہ تھے، لیکن وہ اپنے شیخ کے پاس جاتے تھے، اور نہایت ادب سے بیٹھتے تھے، حالانکہ علم وفن میں ان سے کم ہی تھے، ان کے احباب اور ساتھیوں نے کہا کہ آپ فلاں کے پاس کیوں بیٹھتے ہیں، اس سے ہم لوگوں کو غیرت ہوتی ہے، تو انہوں نے کہا: یَجْلِسُ الْإِنْسَانُ حَيْثُ يَجِدُ دَوَاءَ قَلْبِهِ، انسان جہاں دل کے درد کی دوا پاتا ہے وہیں جاتا ہے۔

سید سلیمان ندوی کو دیکھ لیجیے، ان کو کس چیز کی کمی تھی؟ دو مرتبہ خلافت کی تحریک میں یورپ گئے، مؤتمر عالم اسلامی میں ہندوستان کے واحد نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے، علمی تحقیقات وتصنیفات میں وہ مرتبہ تھا کہ علامہ اقبال جیسا قابل اور تعلیم یافتہ آدمی جو مغربی تعلیم کے لیے بھی مایۂ ناز ہے، اپنے خط میں لکھتا ہے: ''یہ سید سلیمان علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کا فرہاد ہے۔'' اقبال سے بڑا کون ہے جس کو اس عصر کی تعلیم نے پیدا کیا ہو، جب ان کے مکاتیب چھپنے لگے تو پاکستان کے لوگوں نے چاہا کہ یہ خط نہ چھپے، ایک عالم دین کی یہ عزت ان سے دیکھی نہ جاتی تھی، لیکن اس کے باوجود، لوگوں نے کہا کہ آپ سے بڑھ کر کون عالم ہے، لیکن آپ فلاں کی مجلس میں کیوں شریک ہوتے ہیں؟ تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ ایک طرف تو مجھ پر تم کو یہ اعتماد کہ مجھ سے بڑا کوئی نہیں ہے، پھر دوسری طرف یہ بے اعتمادی کہ میرا کسی کی مجلس میں بیٹھنا تمہیں ناپسند ہے۔!!

عزیزو! یہاں قدم قدم پر درندے بیٹھے ہوئے ہیں، نفس پرستی، زر پرستی، جاہ پرستی اور نہ جانے کتنے کتنے فتنوں کے جال بچھے ہوئے ہیں، ہم نے دیکھا کہ کتنے لوگ علوم وفنون کے نا معلوم کتنے دریا عبور کر چکے ہیں، لیکن نفسانیت کی ایسی پستی میں مبتلا ہیں کہ خدا کی پناہ، اپنے منہ سے ایسی ایسی پست باتیں کہہ جاتے ہیں کہ سننے والا متحیر ہو جائے، اتنا بڑا عالم اور ایسی پست باتیں۔!! نفس پرستی اور مال و دولت کے ادنیٰ اشاروں پر وہ ملت اسلامیہ کو غارت کردینے پر تیار ہو جاتے ہیں، دین ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں، وہ اپنے ایک ایک جملے میں ہندوستان کی ملت اسلامیہ کی ہلاکت کا اعلان کر دیتے ہیں۔

تم بلا استاذ وشیخ کے تعلق کے کچھ نہیں کر سکتے

میرے عزیزو! یہ ادارے کسی ذات یا کسی شخص واحد کی دعوت نہیں اور نہ کوئی اس کا مستحق ہے، جس طرح تم یہاں رہتے ہو یا دیوبند میں رہتے ہو، یہ کیا کوئی بھی ادارہ ہو، جامعہ زیتونہ ہو، جامع ازہر ہو یا جامع قزوین ہو، یا دنیا کی کوئی بھی درس گاہ ہو، وہاں سے صرف علم حاصل کرنا اور اس کے بعد اس سے بے تعلق ہو جانا کافی نہیں ہے، میں اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ دنیا کے کسی دور میں اور دنیا کے کسی حصہ میں رہو، تم بلا استاذ وشیخ کے تعلق کے کچھ نہیں کر سکتے، اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو تم اپنے معلم کے سامنے سر تسلیم خم کر دو، اس کے جذبات و احساسات کا مطالعہ کرو، تم اس کے روز وشب کے اعمال، اس کے حرکات وسکنات کا بغور مشاہدہ کرو، تب تمہارے اندر اتباع سنت کا عزم پیدا ہوگا، اگر تم چاہو کہ صرف کتابوں سے حاصل کرلو تو ایسا نہیں ہوسکتا، اگر ایسا ہوتا تو آج کیمبرج اور آکسفورڈ والے تم سے بڑھے ہوتے، ان میں نہ معلوم کتنے محدث ومفسر اور فقیہ پیدا ہو چکے ہوتے۔

عزیزو، جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک نظام ہے، اسی طرح یہ بھی ایک نظام ہے، جان لو، انسان انسان سے بنتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو صحابہ کرام آج دنیا میں سب سے افضل نہ ہوتے، یہ صحبت رسول ہی کی کیمیا اثری ہے ورنہ متاخرین میں بھی بہت بڑے بڑے عباد و زہاد گزرے ہیں، فرعون نے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے گروہ سے کہا کہ ہم تمہارے

ہاتھ پیر کاٹ دیں گے، تو انہوں نے جواب دیا: ﴿فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ، إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾ [(۱)]، یہ تھا رسول کی صحبت کا نتیجہ کہ ذرا دیر میں وہ ایمان واعتماد پیدا ہوا جس کے سامنے ہر ابتلا ومصیبت بے اثر ثابت ہوئی۔

اس بات کو یاد رکھو کہ تم اپنے کو ہمیشہ ناقص سمجھو گے، اور انسان کی ہم نشینی کرو گے، خدا ہم کو تم کو اس علم سے نفع پہنچائے، جو بھائی جا رہے ہیں ہم ان کو افسوس وخوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رخصت کرتے ہیں، خدا ہماری اور ان کی طاقتوں کو برقرار رکھے اور تعلقات کو استوار رکھے۔ (۲)

---

(۱) سورة طه:۷۲

(۲) دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلبہ کے الوداعی جلسہ میں ۶ر دسمبر ۱۹۶۴ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا عبدالعلیم بستوی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ، (شمارہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۶۴ء)۔

فضلائے ندوہ اوران کی ذمہ داریاں

عزیزان محترم و برادران عزیز!

مجھے اپنی سیاحتی اور علمی زندگی میں ایسی آزمائشوں سے کئی بار واسطہ پڑا ہے کہ مجھ سے محبت و تعلق کا اظہار کیا گیا اور میری حقیر ذات کے متعلق کوئی لکھی ہوئی چیز پڑھی گئی، لیکن آج مجھے کچھ اس سے زیادہ آزمائش درپیش ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے عزیز بھائیوں نے مجھے مخاطب کیا، اور میرے متعلق کچھ کہا، میں اس کی مثال ایسی ہی سمجھتا ہوں کہ کسی گھر کے بچے اور اس کے افراد یہ طے کرلیں کہ آج گھر کے بزرگ (بزرگ میں اس لیے کہتا ہوں کہ ان سے سن وسال میں اور ندوہ سے تعلق میں مجھے سبقت حاصل ہے) کو جوان کے ساتھ ہر وقت رہتے تھے، جن سے ہر وقت واسطہ پڑتا تھا، سپاس نامہ پیش کرنا ہے اور گھر میں اس کی تیاری ہونے لگے، اس وقت اس فرد خاندان کو جو آزمائش پیش آئے گی اور جو ذہنی کشمکش، محبت و شکایت، ممنونیت و تشکر اور اس کے ساتھ ساتھ تعجب وغیرہ کی جو ملی جلی کیفیت پیش آئے گی، وہی کیفیت اس وقت مجھے پیش آرہی ہے۔

بہر حال میں اس جذبہ کی قدر کرتا ہوں، اور سپاس نامہ کی میرے نزدیک بڑی قدر و قیمت اور اس کی افادیت یہ ہے کہ اس کے بہانہ ایک خاص جماعت کو مخاطب کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور اس کے ضمن میں ایسی باتیں کہی جاتی ہیں جو عام جلسوں میں نہیں کہی جاتیں۔

میرے عزیزو! آپ ایک بڑے ادارے، بڑی دینی درسگاہ کے ساختہ پرداختہ اور ایک بڑے درخت کے برگ و بار ہیں، اس ادارہ کا شجرۂ نسب ایک صاحب دل اہل باطن اور اہل اخلاص پر ختم ہوتا ہے، ویسے تو ہر مدرسہ کا نسب نامہ صفۂ نبوی پر جا کر ختم ہوتا ہے، اس کا شجرۂ

نسب وہیں جا کر ملتا ہے، میں نے ایک بار کہا تھا کہ جس مدرسہ کا نسب ونسبت صفۂ نبوی سے قائم نہ ہو وہ مدرسہ مرکز رشد و ہدایت نہیں، اور جس مسجد کی نسبت ونسب حرم مکی وحرم نبوی پر ختم نہ ہو وہ مسجد 'مسجد ضرار' ہے، الحمدللہ ہمارے مدارس کا شجرۂ نسب ختم ہوتا ہے اصل میں صفۂ نبوی پر اور اسی چراغ کی روشنی ہے جو ابھی تک ان مدارس کو منور کیے ہوئے ہے اور اسی سے اس میں قدر و قیمت بھی پیدا ہوتی ہے۔

اس وقت بلا ارادہ و بالا رادہ اور شاید بلا ارادہ زیادہ زمانہ کے حالات وتغیرات نے علمی ودینی دنیا کی نگاہوں کو دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف متوجہ کر دیا ہے، اور لوگوں نے اس کا ایسا تصور اپنے ذہنوں میں قائم کیا ہے اور اس سے ایسی توقعات وابستہ کی ہیں جو اس کی حیثیت وحقیقت سے کچھ زیادہ ہیں، مجھے اس سے اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے، اس وقت خاص طور سے عالم عربی میں ندوۃ العلماء کا ایک بہت بلند تصور ہے، مجھے یاد ہے کہ میں ۱۹۵۶ء میں پہلی مرتبہ طرابلس گیا جو ایک بہت بڑا علمی ودینی مرکز بھی ہے جو بہت پہلے شام کے جگر کا ٹکڑا تھا، بعض سازشوں اور سیاسی حالات کی بنا پر لبنان میں شامل ہو گیا، وہاں مجھے ایک تعلیم گاہ دیکھنے کی دعوت دی گئی، میں وہاں گیا اور بہت متاثر ہوا، میں نے وہاں کے ذمہ داروں سے کہا کہ بہت شائستہ درس گاہ ہے، تو انھوں نے کہا کہ ہمارا آئیڈیل (Ideal) منتہائے تخیل تو ندوۃ العلماء ہے، مجھے معلوم نہیں کہ وہ اس وقت میری حیثیت سے واقف بھی تھے یا نہیں، میں اس وقت ندوۃ العلماء کا ایسا بڑا ذمہ دار بھی نہیں تھا، میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم حیات تھے، مجھے شرم بھی آئی اور خوشی بھی محسوس ہوئی، اسی طرح کوئی پندرہ بیس برس پہلے کی بات ہے ایک مرتبہ لندن گیا، وہاں کے عرب طلبہ نے اپنے ہاسٹل میں مدعو کیا، میرے عزیز رفیق ومعاون مولوی معین اللہ صاحب بھی ساتھ تھے، طلبہ نے سوالات کرنا شروع کر دیا، اور اکثر باتوں میں پوچھتے تھے کہ اس دینی وتعلیمی نظریہ کے بارے میں ندوۃ العلماء کا کیا خیال ہے؟ وہ اس طرح پوچھتے کہ ندوۃ العلماء جیسے کوئی مستقل مکتب فکر ہے یا جیسے مذاہب فکریہ میں سے ایک مستقل مذہب ہے، میں کہتا کہ بھائی وہ بے شک ایک تعلیم

گاہ اور دانش گاہ ہے، لیکن وہ کوئی ایسا جامع مکتب خیال نہیں کہ جو ہر چیز کے بارے میں ایک مستقل نظریہ رکھتا ہو۔

روحانی تشخص وتفوق

یہ بات جہاں ہمارے لیے بڑی خوشی کی ہے وہاں بڑی ذمہ داری کی بھی ہے، اس لیے ندوۃ العلماء سے نسبت رکھنے والے نوجوانوں کو، اس سے محبت رکھنے والے اس کے فرزندوں کو اس کی شہرت عزت اور نسبت کو قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اپنے کو اس کا اہل ثابت کرنا چاہیے، اسی کے ساتھ ابنائے قدیم جہاں کہیں بھی ہوں انھیں وہاں کے حالات کا برابر مطالعہ کرتے رہنا چاہیے، وہاں کی دینی علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے، اپنے کو مفید بنانے مفید ثابت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اس کی ان خصوصیات کو جو اس کے بلند نظر و بلند نگاہ بانیوں جیسے مولانا محمد علی مونگیریؒ، حکیم عبدالحیؒ، مولانا ظہور الاسلام فتحپوریؒ، ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ کے سامنے تھیں، جو ان کا منصوبہ تھا، جو ان کے مقاصد تھے، ان کو سامنے رکھنا چاہیے، اور فکری، ذہنی رہنمائی کے ساتھ دینی اخلاقی بلکہ روحانی تشخص وتفوق اور تفوق نہیں تو تشخص کا ضرور اظہار کرنا چاہیے کہ وہاں کے گرد و پیش کے لوگوں کو یہ محسوس ہو کہ یہاں ایسے صاحب علم عالم موجود ہیں جو صاحب فکر بھی ہیں اور جو ارجمند فکر اور دردمند دل دونوں کے جامع ہیں، ندوۃ العلماء کی بنیاد میں درحقیقت زبان ہوش منداور ذہن ارجمند کے ساتھ دل دردمند بھی تھا، لیکن ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ اکبر الہ آبادی نے زبان ہوش مند و ذہن ارجمند کا تو اعتراف کیا، لیکن دل دردمند کی مثالیں ان کے سامنے ایسی واضح نہیں تھیں کہ وہ اس کو بھی ندوۃ العلماء کے اوصاف میں شامل کرتے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی، برادر محترم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی کوششوں سے وہ بات وہ خصوصیات بھی ندوۃ العلماء میں پیدا ہونے لگیں لیکن اس کو ابھی بہت بڑھانے کی ضرورت ہے، حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی دانش گاہ، تحریک اور مکتبۂ فکر کا کام زبان ہوشمند اور ذہن ارجمند سے تو چل سکتا ہے لیکن اسلام کے ساتھ دل دردمند بھی

ضرور ہونا چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ یہ میرے عزیز بھائی ان اوصاف کے (جن کو بعض جگہ متضاد سمجھ لیا گیا ہے اور حقیقت میں متضاد نہیں ہیں) جامع ہوں گے، اور عوام سے بھی تعلق رکھیں گے، ابھی تک ہماری کمزوری یہ رہی ہے کہ ہم نے زیادہ تر خواص کو مخاطب کیا، اور ہماری صلاحیتیں کچھ اس طرح کی تھیں یا ہم نے جو صلاحیتیں پیدا کیں اور جن کو ضروری سمجھا کچھ اس طرح کی تھیں کہ وہ خواص کے لیے تو مفید تھیں اور خواص کا لحاظ رکھ کر ان کی پرورش کی گئی تھی، لیکن عوام سے جو رابطہ قائم ہونا چاہیے تھا، وہ ابھی تک قائم نہیں ہو سکا تھا، مگر الحمد للہ اب عوام سے بھی ندوۃ العلماء کا رابطہ قائم ہو رہا ہے اور عوام اس سے نہ صرف متعارف ہو رہے ہیں بلکہ مانوس بھی ہوتے جا رہے ہیں، لیکن اس کوشش کو بڑھانا چاہیے، اور وہاں کے مسائل اور ماحول کو سامنے رکھنا چاہیے۔

ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں

تمام مدارس ہمارے اپنے ہی ہیں، الحمد للہ کسی کے ساتھ کوئی غیریت نہیں، یہاں جو مدارس ہیں ان کے ساتھ ان عزیزوں کو دلچسپی ہونی چاہیے، اور ان سے تعاون کرنا چاہیے، کہ کسی قسم کی مغایرت ہرگز نہیں ہونی چاہیے، اور حقیقت میں کوئی مغایرت ہے بھی نہیں، ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، ایک ہی نسبت کے حامل ہیں، ایک ہی مسلک پر چلنے والے ہیں، جب کبھی یہ جماعت ہدف بنتی ہے تو ہم سب ہدف بنتے ہیں، پہلے بھی کوئی حقیقی مغایرت نہیں تھی اور اب تو کسی مغایرت کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے۔

میں ان عزیزوں کے اس جذبہ کی قدر کرتا ہوں، خواہ اس جذبہ کے اظہار کے لیے انھوں نے کوئی بہت مناسب طریقہ نہ اختیار کیا ہو، لیکن بہر حال جذبہ قابل قدر ہے اور اصل چیز جذبہ ہے جیسا کہ میں نے کل ڈنر کے موقع پر کہا جو محترم سید حامد حسین صاحب (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے اعزاز میں دیا گیا تھا کہ مجھے اس میں تشکر و اطمینان کی اور احسان مندی، محبت و شرافت کی جو بُو نظر آتی ہے، اصل قیمت ایسی تقریبات کی یہی ہے، یہ

تعلق کے اظہار کا ایک طریقہ ہے، کوئی اس کا جواز ہے تو کم از کم یہ ہے کہ اس میں تعلق کا جو جذبہ کارفرما ہے وہ اعتماد و احترام کا جذبہ ہے، اور اس کے بغیر کوئی جماعت کوئی کام نہیں کرسکتی، جب تک کہ اس کو اپنے اداروں، اس کے خدمت گزاروں، اس کے کارکنوں اور اپنے استادوں کے ساتھ تعلق کو قائم رکھنے کی خواہش نہ ہو، میں ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں، اور اخیر میں ان عزیزوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اور دنیا سے بڑھ کر آخرت میں شرمسار نہ کرے، ان کو ہم سے شرمسار نہ کرے اور ہم کو ان سے شرمسار نہ کرے، وَلَا تُخزِنَا یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ، یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُوْنَ، إِلَّا مَنْ أَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ، وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالَی عَلَی خَیْرِ خَلْقِہِ وَ أَصْحَابِہِ أَجْمَعِیْنَ۔ (۱)

(۱) ۲۷/فروری ۱۹۸۳ء کو بستی میں ندوی برادری کے ایک جلسہ میں سپاس نامہ پیش کیے جانے کے بعد کی گئی تقریر، یہ تقریر حکیم ابو الحسن ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/ جون ۱۹۸۳ء)۔

اپنے کو نیلام کی منڈی میں نہ پیش کیجیے!

میرے رفقائے کار اساتذۂ دار العلوم، برادرانِ عزیز، اور فرزندانِ عزیز!

مجھے سب سے پہلے اپنے اس تاثر کا اظہار کرنا ہے کہ میں نے رخصت ہونے والے بھائیوں کے اردو اور عربی مضامین سن کر خدا کا شکر ادا کیا، اور میں برملا اعلان کرتا ہوں کہ الحمد للہ جو کوششیں ہو رہی ہیں، وہ ضائع نہیں ہو رہی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى، وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرٰى﴾ (۱)

میں اپنے عزیز رفقاء اور اساتذۂ دار العلوم کو مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی کوششوں اور دار العلوم کے فضلاء کی تصنیفات کا اثر ان مضامین میں ہے، میں سالہا سال سے الوداعی جلسوں میں شریک ہو رہا ہوں، اور کبھی کبھی ''الاصلاح'' کی مجلسوں میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا ہے، فکری و علمی لحاظ سے بھی، قوتِ تعبیر اور قوتِ بیان کے لحاظ سے بھی، اور قدرتِ تحریر اور اسلوب کے لحاظ سے بھی، اور زبان و ادب کے لحاظ سے بھی نمایاں ترقی نظر آتی ہے، یہ بات بڑی موجب شکر ہے، اور میں اپنے عزیز طلبہ کو ان کی ترقی اور ان کی سعادت مندی پر، ان کے تعلق و احترام پر اور ان کے خلوص و محبت پر مبارکباد دیتا ہوں، اور اپنے ان عزیز طلبہ سے معذرت کرتا ہوں جو اپنے مضامین نہیں سنا سکے، اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں، اور ان کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ان کی یہ محنت ضائع نہیں ہوئی، اس لیے کہ انہوں نے مضامین تیار کرنے میں جو وقت صرف کیا ہے، وہ ان کے لیے ہر حال میں مفید ہے، اس پر زیادہ قلق نہ کریں، ان کی یہ چیز زیورِ طباعت سے آراستہ بھی ہو سکتی ہے جو ان کے لیے بطور یادگار رہو گی۔

(۱) سورۃ النجم: ۳۹-۴۰

اب میں مختصر وقت میں چند ضروری اور وداعی باتیں کرنا چاہتا ہوں، یوں تو وقت کا کوئی اعتبار نہیں، لیکن چونکہ یہ الوداعی جلسہ ہے، اس لیے آپ سے میں وہی باتیں کروں گا جو میرے اپنے عقیدے اور اپنے تجربے اور مطالعے کے لحاظ سے ہیں، اور میں جن کو آپ کے لیے مفید سمجھتا ہوں، آپ کی محبت، آپ کا میرے اوپر حق کے سوا کوئی دوسرا محرک نہیں ہے۔

چار محاذ

اب میں آپ سے چار باتیں عرض کروں گا جو حالاتِ حاضرہ سے متعلق ہوں گی، اور چار باتیں آپ کی ذات سے متعلق عرض کروں گا۔

حالاتِ حاضرہ سے متعلق چار باتوں میں سے پہلی بات جو اگرچہ بہت بڑی ہے اور میری حقیقت اور حیثیت سے بلند ہے، مگر اس کے ذکر میں برکت اور حلاوت ہے، ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) چند چیدہ اور برگزیدہ صحابہ کرام کی مخصوص جماعت میں تشریف فرما تھے، حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ میرے لیے دعا کا وقت ہے، اور ان کی طبیعت میں بھی تقاضا پیدا ہوا جو عارفین میں پیدا ہوا کرتا ہے، اور وہ تو سب عارفین سے بڑھ کر عارف تھے، انھوں نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ آپ سب آزاد ہیں، اپنے لیے دعا کریں اور منہ مانگی مراد مانگیں، تو کسی نے کہا کہ: اے اللہ! اپنے راستے میں نکلنے کی توفیق دے کہ یہ دولت تیرے راستے میں لٹا دوں، اور تیرے بندوں کی خدمت کروں، کسی نے کہا کہ اے اللہ! اپنے راستے میں نکلنے کی توفیق دے کہ میں جہاد کر کے اپنا سر کٹاؤں اور تیرے راستے میں اپنا خون بہاؤں، اسی طرح تمام صحابۂ کرامؓ کی دعائیں منقول ہیں۔ جب حضرت عمرؓ کی باری آئی تو انہوں نے فرمایا کہ میری دعا ہے کہ میرے پاس ابوعبیدہ، سعد بن ابی وقاص، طلحہ، خالد (رضی اللہ عنہم اجمعین) ہوں، اس کے علاوہ اور کئی نام لیے۔ بہر حال یہ سب وہ لوگ تھے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی فتوحات مقدر کی تھیں اور بڑے بڑے کارنامے تقدیر میں لکھے تھے۔ اور کہا: ان میں سے کسی کو کسی محاذ پر اور کسی کو کسی محاذ پر بھیجوں اور ساری دنیا میں ان کے ذریعہ اسلام کا پرچم لہرا دوں، اور پوری دنیا اسلام کے زیر نگیں ہو۔

آج سے پہلے اسلام کے مستقبل کے فیصلہ کن محاذ اتنے متعین اور واضح نہیں تھے، ان پر کہر تھا، کچھ ایسی تاریکیاں تھیں کہ اس وقت متعین کر کے یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ چار محاذ ہیں جن کے ذریعہ اسلام اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے مستقبل کا فیصلہ ہوتا ہے، اور اپنے عقیدہ، اپنے پیغام اور اپنے تشخص کے ساتھ باقی رہ سکتی ہے یا نہیں؟ تو میرا مطالعہ ہے کہ آج سے چند سال پہلے اور خاص طور پر ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ محاذ متعین اور واضح نہیں تھے، لیکن اس میں سیاسی تبدیلیوں، انقلابِ سلطنت اور اسلام کے خلاف موجودہ مہم اور علمی تجربوں نے اس کو بالکل ایک حقیقت بنا دیا ہے، انہیں چار محاذ کا ذکر آپ سے کروں گا جن کے لیے بلند عزائم سپاہیوں، اور دینی درسگاہ کے فضلاء، اور دینی تعلیم کے تربیت یافتہ علماء اور مخلصین کی ضرورت ہے، اور ان کے لیے اس سے بڑی سعادت نہیں ہوسکتی کہ وہ ان محاذ جنگ میں اپنی صلاحیتوں اپنی توانائیوں اور سرگرمیوں کا اظہار کریں۔

نسل نو کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت

ان میں سب سے بڑا محاذ یہ ہے کہ ہماری ملّتِ اسلامیہ کی آئندہ نسل مسلمان رہ جائے ، اور وہ صرف ذہنی، فکری، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے نہیں، بلکہ اعتقادی ارتداد سے بچ سکے۔ اس وقت سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے مدارس سے فارغ ہوں، وہ اس محاذ کو سنبھالیں، اس محاذ کا چارج لیں، اور اپنے کو اس محاذ کے لیے وقف کردیں، اور یہ کوشش کریں کہ مسلمانوں کی آئندہ نسل جو ابھی آٹھ دس برس کے بچے یا بارہ پندرہ برس کے نوجوان کی شکل میں ہیں اسلام کی اصولی، فقہی اور کلامی تعریف پر صادق ہوں، اس کے لیے ضرورت ہے اس بات کی کہ قصبے قصبے، شہر شہر اور گاؤں گاؤں مدارس و مکاتب اور مساجد کی بنیاد ڈالی جائے، اور جہاں ایسا ممکن ہو وہاں صباحی و مسائی درجات ہوں، اور جو لوگ جدید تعلیم یافتہ ہیں، اور اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں میں بھیجنے کے لیے مجبور ہیں، ان کو غذا پہنچائیں، اگر ان کو ابھی سے بچانے کی کوشش نہیں کی گئی تو ڈر ہے کہ اس میں نوخیز نسل کو آگے چل کر کلامی اور فقہی اعتبار سے مسلمان کہنا صحیح ہوگا یا نہیں؟ وہ توحید و شرک اور کفر و ایمان کا فرق کر سکے گی یا نہیں؟

رسالت، منصب رسالت اور رسول اللہ (ﷺ) کو نبی آخر الزماں اور آپ ؐ کی شفاعت کو مانے گی یا نہیں؟ ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ اور ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ پر اس کا ایمان ہوگا یا نہیں؟

آپ کے بلند عزائم اور بلند خیالات، آپ کے مطالعے اور پختہ صلاحیتوں پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، اور اس پر آپ کو مبارک باد دیتے ہیں، لیکن اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ کون کس محاذ کو سنبھالتا ہے، آپ ابھی سے نیت کیجیے کہ ہم اس خطرناک اور نازک محاذ کے لیے سینہ سپر رہیں گے، پھر اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا، اور اسباب مہیا کرے گا، اور آئندہ نسل جو ہماری اور آپ کی اولاد ہوگی، اس کو مسلمان رکھنے کے لیے جو بھی کوشش کی جا سکے کی جائے، جو ہاتھ پیر مارے جاسکیں مارے جائیں، اور جو آبِ دیدہ وخونِ جگر بہایا جا سکے بہایا جائے، یہ سب سے بڑا محاذ ہے۔

امت اسلامیہ کے ملی تشخص کی حفاظت

دوسرا محاذ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ اپنے ملی تشخص کے ساتھ باقی رہے، یعنی اپنے عائلی قانون، قرآن مجید کے نصوص قطعیہ اور احکام قطعیہ، نکاح وطلاق کے احکام، ترکہ وتعلقات کے احکام پر عمل کر سکے، اگر وہ اس پر عمل نہ کر سکے تو بعض وقت وہ ناجائز اور حرام ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:- ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلآئِكَةُ ظَالِمِيْ أَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْأَرْضِ قَالُوْا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَأُولٰٓئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْراً﴾ (۱)

بہت سخت الفاظ ہیں، اگر خدانخواستہ یہ وقت آگیا کہ مسلمان یہاں نماز تو پڑھ سکے، کلمہ تو پڑھ سکے، قرآن شریف کی تلاوت کر سکے، لیکن وہ قرآن مجید کے عائلی احکام پر عمل نہ کر سکے، پھر اس وقت علماء کو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ ہجرت کا فتویٰ دیں، خدا کرے وہ وقت نہ آئے، ہم اس زمین پر اپنا حق سمجھتے ہیں، یہاں کے اہلِ بصیرت، عارفین، مُلہَم مِنَ اللہ اور

(۱) سورۃ النساء:۹۷

اپنے عہد کے مخلص ترین بندوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اس ملک سے اسلام مٹنے والا نہیں ہے، اور اس ملک کی قسمت میں اسلام لکھ دیا گیا ہے، اور اس ملک کے لیے اسلام اَلاٹ ہو گیا ہے، اور تقدیر الٰہی کا فیصلہ ہے کہ اسلام اس ملک میں رہے، اسلام اس کی قیادت بھی کر سکتا ہے اور بچا بھی سکتا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پھر دوبارہ اس کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے، اس لیے ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں، مگر ہمیں واقعات وحقائق کو دیکھ کر اپنی کوششوں کا رخ متعین کرنا چاہیے، کیوں کہ مسلمانوں کا ملی تشخص روز بروز خطرے میں پڑتا جا رہا ہے، اس کی بے حد ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے شاہ بانو کیس سے گویا ایک غیبی مدد فرمائی ہے جس نے سارے مسلمانوں میں اس خطرے کے احساس کو پیدا کر دیا تھا، جس کے لیے ایک مہم چلائی گئی اور وہ ایک مرحلہ پر کامیاب ہوئی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جمہوری اور اجتماعی طریقہ پر اتحاد اور اتفاق کے ساتھ اور خلوص کے ساتھ جو مہم چلائی جائے وہ ضرور کامیاب ہوگی، حالانکہ فیصلہ سے پہلے یہ پیشین گوئی کرنا بہت مشکل تھا کہ مسلمانوں کے حق میں فیصلہ ہوگا یا نہیں، اور ان کا مطالبہ پورا ہوگا یا نہیں؟ لیکن اللہ کے چند مخلص بندوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی سے، قرآن مجید کی روشنی اور تاریخ کے تجربے میں صحیح طریقہ اختیار کیا تو انہیں کامیابی ہوئی۔

پیامِ انسانیت

تیسرا محاذ پیام انسانیت کا ہے، ہم اس ملک میں اس طرح رہیں کہ اپنے دین کو باقی رکھنے کے لیے بھی، اپنے دین پر عمل کرنے کے لیے، اپنے اداروں اور مرکزوں کو محفوظ رکھنے کے لیے بھی، دعوت کا کام کرنے کے لیے بھی، تعلیم وتالیف کا کام انجام دینے کے لیے بھی، با مقصد اور باعزت زندگی گزارنے کے لیے، اپنے مخصوص عقائد کے ساتھ، اپنے پیغام ومقام کے ساتھ اس ملک میں زندگی گزار سکیں، اس کے لیے ضرورت ہے کہ فضا معتدل ہو، مشتعل اور آتش گیر نہ ہو، ورنہ کسی وقت بھی ساری کوششوں پر پانی پھر سکتا ہے، بہت کم لوگ اس کی ضرورت واہمیت کو محسوس کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ چند آدمیوں کے ذہن کی اپج ہے، یا

ان کا ذاتی رجحان ہے، جو کسی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔

آپ یقین مانیے کہ حالات کے حقیقت پسندانہ اور علمی مطالعہ نے میری رہنمائی کی ہے، ہم جیسے اور رفقاء کو اسی مطالعہ نے مجبور کیا کہ وہ کوشش کریں، حالانکہ اس کوشش کا تناسب واقعات کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں، اگر چہ یہ وہ مجمع نہیں ہے جس کے سامنے کہنے سے یہ سمجھوں کہ بات تحریک کی شکل اختیار کرے گی، لیکن کیا تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے وہ کام لے لے، لہٰذا آپ اس کو بھی یاد رکھیے، اور باہمی اعتماد، ایک دوسرے کا احترام ہمارے اندر پیدا ہونا چاہیے۔

اسپین کا المیہ جو پیش آیا، اس پر بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، اس میں ایک بات بہت نازک یہ ہے کہ وہاں علوم دینیہ کی بھی خدمت کی گئی، اور وہاں خدا تک پہنچنے کے لیے ایسے ایسے مجاہدے ہوئے جن سے چوٹی کے اولیاء پیدا ہوئے، بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مشرق اگر انبیاء کی سرزمین ہے تو مغرب اولیاء کی سرزمین ہے، شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ جیسے جلیل القدر مشائخ پیدا ہوئے، اسی طریقہ سے فنونِ لطیفہ کو بھی وہاں بہت ترقی ہوئی، اندلس کا ایک مستقل ادبی دبستان ہے، اس کو المدرسة الأندلسية کہتے ہیں، اسی طرح چوٹی کے مصنفین پیدا ہوئے، 'موافقات' کے مصنف علامہ شاطبیؒ پیدا ہوئے، ابن عبد البرؒ پیدا ہوئے، ایسے ہی بہت سی کتابوں کے مصنف پیدا ہوئے، اور موَطا کی ایسی شرحیں لکھی گئیں، لیکن ایک چیز سے اغماض برتا گیا، وہ یہ کہ وہاں کی اصل آبادی جو آٹے میں نمک کے برابر تھی، اپنی پوری سلطنت واقتدار کے باوجود سنجیدگی کے ساتھ اس کو اسلام سے مانوس کرنے اور اسلام کے دائرے میں داخل کوشش نہیں کی گئی، اس لیے کہ اقتدار میں اکثر یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمارے نام اس زمین کا پٹہ لکھ دیا گیا ہے، مغلیہ سلطنت کے فرامین میں یہ لفظ ملتا ہے کہ ''دولتِ ابد قرار''، یعنی ہم براہِ راست حضرت اسرافیلؑ کو اس ملک کا چارج دیں گے، اور اس وقت تک کوئی خطرہ نہیں ہے، یہ اس کا غلط خیال تھا، اس پھیلی ہوئی آبادی کو اپنے حال پر چھوڑ دینا، اور اس کے جذبات کو غلط تعلیم کے ذریعہ، غلط تاریخ کے ذریعہ، اپنی اخلاقی

کمزوریوں کے ذریعہ، اس سے بڑھ کر مقابل سیاسی تحریکوں کے ذریعہ نشو ونما پانے کا موقع دینا بہت خطرناک ہے۔

ہندوستان میں تو یہ عنصر زیادہ واضح طور پر ہے، مسلمانوں نے ہندوستان پر آٹھ سو سالوں تک علی الرغم حکومت کی ہے، اور جب اخیر میں تصادم اور متضاد سیاسی تحریکیں چلی ہیں، اور انھوں نے غیر مسلموں کے دل میں بڑے بڑے ناسور پیدا کردیے ہیں، اب اس کو 'پیام انسانیت' کے ذریعہ ہی ختم کیا جاسکتا ہے، اس کو میں نے بہت اختصار سے بیان کیا ہے، اس پر پورا لٹریچر تیار ہوگیا ہے، آپ اس کا مطالعہ کریں۔

علوم دینیہ کی بقا کی کوشش اور زمانہ کے ساتھ ان کی تطبیق

چوتھا اور آخری محاذ علوم دینیہ کے بقا کی کوشش کرنا اور زمانے کے ساتھ ان کو تطبیق دینا، اس طرح نہیں کہ زمانہ کے تابع ہوں، بلکہ زمانہ کے جائز اور واجب تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے، اور اس کی زبان وادب کی رعایت کے ساتھ علوم دینیہ کو زندہ رہنے اور اپنا کام کرنے، اور زمانہ کا نہ صرف ساتھ دینے، بلکہ اس کی قیادت کرنے کے قابل بنائیں، اس کے لیے عربی مدارس تو ریڑھ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کو ترقی دیں، اور ان کے لیے اساتذہ تیار ہوں، ندوۃ العلماء کے ملحق مدارس کو اپنی پچاس ساٹھ سے متجاوز تعداد ہونے کے باوجود اساتذہ نہیں ملتے، آپ اس کے لیے بھی تیار ہوں، نئے مدارس قائم کریں، علوم دینیہ میں نئی زندگی اور تازگی پیدا کریں، صرف یہ نہیں کہ آپ فرسودہ چیزوں کو فرسودہ اور بوسیدہ چیزیں سمجھ کر پڑھائیں، بلکہ ان میں نئی روح، نئی توانائی پیدا کریں، تصنیفات نئی ہوں، تشریحات نئی ہوں، نئی ترجمانی ہو، نئی قوّتِ تدریس ہو، نیا ذوقِ تعلیم ہو اور نئی ذہنی صلاحیت، اور اس کے ساتھ ذکاوت، حافظہ اور مطالعہ کی وسعت ہو۔

یہ چار چیزیں جو میں نے اختصار سے بیان کی ہیں، ان کی طرف توجہ کرنا نہایت ضروری ہے۔

طلبہ سے متعلق چار باتیں

اور اب وہ چار چیزیں بیان کرتا ہوں جو آپ کی ذات سے متعلق ہیں، انہیں آپ سرسری نہ سمجھئے گا، یہ ہزاروں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ ہے، اگرچہ خودستائی ہے، اور اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے، محض اپنی بات میں اہمیت پیدا کرنے کے لیے کہتا ہوں کہ بہت کم لوگوں کو علمائے سلف اور علمائے معاصرین اور درمیانی دور کے علماء، خاص طور پر ہندوستان کے علماء کے تراجم پڑھنے کا موقع ملا ہوگا جتنا مجھے ملا ہو، اور اس کے خاص اسباب تھے، کیونکہ میں ایک تاریخی ماحول اور مؤرخین کے گھرانے میں پیدا ہوا، اور گھر میں سارا خزانہ موجود تھا۔

"نزھۃ الخواطر" جس میں ساڑھے چار ہزار سے زائد علمائے ہند کے تراجم ہیں، اس کو میں نے کئی بار پڑھا، مسوّدہ کے مرحلہ سے لے کر طباعت کے بعد تک ہر مرحلہ میں کئی بار پڑھتا رہا، اسی طرح 'وفیات الاعیان' اور طبقات کی جو کتابیں ہیں پڑھیں، علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کی خدمت میں رہنے کا موقع بھی نصیب فرمایا۔

اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھیے!

ا:- سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست ہو، کسی درجہ میں تقویٰ، دیانت داری اور تعلق مع اللہ ہو، یا اس کی فکر ہو، یہ ایسی بنیادی بات ہے کہ جس کے بغیر نہ کسی کام میں برکت ہوتی ہے نہ حرکت، اور ایسا حقیقی نفع اسی وقت ہوگا جب خدا اور رسولؐ کے ساتھ معاملہ درست ہو۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ سب کے سب شب بیدار بن جائیں، صوفی اور عارف باللہ ہو جائیں، یہ ہر شخص کے لیے ضروری نہیں، لیکن جو ضروری حصہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک حد تک تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صحیح ہو اور اس کی فکر ہو، اور اپنی نمازوں کی فکر ہو، دعا کا ذوق ہو، اور اور انابت الی اللہ کسی نہ کسی درجہ میں ضرور ہو، یہ سب سے اہم اور بنیادی چیز ہے، اسے کبھی بھولنا نہیں چاہیے، اور اس کے حصول کے بہت سے ذرائع ہیں، ان میں سے ایک تو

یہی ہے کہ کتاب وسنت اور فقہ کا مطالعہ کریں، اور اس کے مطابق اپنی نمازوں کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

بزرگانِ دین کے حالات پڑھیں!

اس کے علاوہ سب سے مؤثر چیز یہ ہے کہ بزرگانِ دین کے حالات پڑھیں، اور اگر اللہ تعالیٰ نصیب کرے تو کسی بزرگ کی صحبت اختیار کریں، میں تو بے تکلف کہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں سب سے بہتر اور مفید حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی کتابیں، خاص طور سے ان کے ملفوظات ومواعظ ایک اچھا اثر رکھتے ہیں، میں نے الحمد للہ ساری ندویت، اپنے تمام ادبی ذوق اور تاریخی بلکہ انتقادی ذوق کے ساتھ ان سے فائدہ اٹھایا ہے، اور آپ کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ اس سے آپ کو اپنی جاہ طلبی، حبّ مال اور معاملات میں کوتاہی کا علم ہوگا، اور خاص طور پر اخلاق کی اصلاح، اجتماعی کاموں کی اہمیت پر ان کے یہاں بڑا زور دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ان سے یہ کام لیا ہے، آپ اس کی طرف ضرور توجہ دیں، آپ کے اندر اس کی کوئی مقدار ضرور ہونی چاہیے۔

زہد وایثار

دوسری چیز یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں، خاص طور پر اس کی دعوت وعزیمت کی تاریخ اور اس کی اصلاحی تحریکوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عہدِ نبوی سے لے کر آج تک علم اور نفعِ خلائق کا، اصلاح وانقلابِ حال کا اور زہد وایثار کا ساتھ رہا ہے، یہ دونوں بالکل ہم سفر ہیں، آپ اسلام کی پوری تاریخ کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں کا کہیں ساتھ نہیں چھوٹا ہے، اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے ذریعہ امت کو نفع پہنچایا، اور کسی بڑے فتنہ سے محفوظ فرمایا، ان میں سب سے بڑا فتنہ 'ردّت' کا فتنہ تھا، اور دوسرا فتنہ خلقِ قرآن کا تھا، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے:- نَصَرَ اللّٰهُ هٰذِهِ الْأُمَّةَ - یا - أَعَانَ اللّٰهُ هٰذِهِ الْأُمَّةَ بِأَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ يَوْمَ الرِّدَّةِ وَبِأَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ يَوْمَ الْفِتْنَةِ، اور اس کے بعد جو فلسفے کے حملے تھے، جن کے مقابلہ

کے لیے جولوگ آئے، امام غزالیؒ ہوں یا امام ابوالحسن اشعریؒ ہوں، پھر اس کے بعد جو فتنے تھے ان کے مقابلہ کے لیے امام ابن تیمیہؒ وغیرہ آئے، پھر ہندوستان میں صوفیائے کرام جنہوں نے مادیت وغفلت اور سلطنت کے اثر سے جو جاہ پرستی، دولت پرستی اور نفس پرستی پیدا ہورہی تھی، اس کو روکا، پھر اس کے بعد غیر مسلموں کے اثر سے اسلامی معاشرے میں جو بدعات، مشرکانہ عقائد داخل ہوگئے تھے، اور وحدۃ الوجود کا جو اثر فلاسفہ اور صوفیوں سے لے کر ادباء اور شعراء تک کے دماغوں میں سرایت کر گیا تھا، اس کے مقابلے کے لیے حضرت مجدّد الف ثانیؒ آئے، پھر اس کے قرآن مجید کے براہِ راست مطالعہ اور حدیث سے اشتغال نہ ہونے کی وجہ سے جو ایک جاہلیتِ ہندیہ اور مقامی اثرات تھے، اور اتباعِ سنّت کا جو ذوق کم ہوگیا تھا، اور عقیدہ میں رخنہ پڑ گیا تھا، اس کے سدّ باب کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف وخلفاء کو اللہ تعالیٰ نے تیار کیا۔

غرض کہ پوری تاریخ بتاتی ہے کہ اصلاح کا کام، عزیمت کا کام اور سطح سے بلند ہو کر امت کے نفع کا کام اور زہد وایثار، دونوں میں اللہ تعالیٰ نے کوئی فطری اور طبعی رشتہ قائم کر دیا ہے جو اسلام کی پوری تاریخ میں ٹوٹنے نہیں پایا، اس لیے میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اس کے لیے بھی آپ اپنے کو تیار کریں، کیوں کہ دوسری قوموں میں بھی کوئی کام زہد وایثار کے بغیر نہیں ہوا ہے، اگرچہ ان کے مزاج الگ، ان کے نتائج مختلف اور ان کے احکام بھی دوسرے ہیں، اس لیے اپنے آپ کو ارزاں فروشی سے بچائیں، صرف دولتِ دنیا کو اور عہدوں کو اپنا مطمحِ نظر نہ بنائیں، جہاں سے کام آجائے، مانگ آجائے، اور امید ہوجائے، بس آپ آنکھ بند کر کے چلے نہ جائیں اور زہد وایثار سے کام لیں، اسی زہد وایثار کے وعدے سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے، اس وقت نہ میں استیعاب کرسکتا ہوں اور نہ آپ کو ضرورت ہے۔

پوری تاریخ شاہد ہے کہ زہد وایثار سے جو حقیقی آسودگی اور صحیح عزت حاصل ہوتی ہے وہ کہیں نہیں حاصل ہوتی ہے، اور یہی اصل مقصد ہے جو لاکھوں کروڑوں روپے کے مالک کو بھی حاصل نہیں ہے، وہ ایک لقمہ کو حلق سے اتارنے کے لیے بعض اوقات ترستے ہیں، ہنری فورڈ کہتا تھا کہ میری ساری دولت لے لو اور میرا ہاضمہ درست کر دو، اور اس قابل بنادو کہ میں کچھ

کھا پی سکوں، حقیقی ضرورت کا سہولتوں اور عزت کے ساتھ پیدا ہونا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوتا ہے۔

اگر غیر مناسب بات نہ ہوتی تو میں بتاتا کہ میں اور میرے بعض رفقاء کو محض بزرگوں اور اپنے مربّیوں کے فیض سے اور جو کتابوں میں پڑھا تھا، اس کے اثر سے اللہ تعالیٰ نے بچا لیا، تو آج ہم اس قابل ہیں، ورنہ معلوم نہیں کسی یونیورسٹی یا کسی کالج میں رٹائر ہو چکے ہوتے، اور تھوڑی بہت پنشن وغیرہ جو ملتی ہے ملتی ہوتی، اور اپنے قصبہ میں بیٹھے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے، لیکن ہمیشہ ایسے موقعوں پر بزرگوں کے واقعات سامنے ہوتے ہیں، ان میں سے مولانا عبدالرحیم صاحب کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں، جس کی نظیر شاید مشکل سے ملے گی۔

مولانا عبدالرحیم رامپوریؒ کا واقعہ

والد صاحب مرحوم نے 'نزہۃ الخواطر' میں مولانا نجم الغنی صاحب رام پوری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولانا عبدالرحیم صاحب معقولات کے اور ریاضیات کے بہت بڑے ماہر تھے، وہ قدیم درس پڑھاتے تھے اور انہیں ریاست رامپور سے دس روپے ماہانہ ملتے تھے، ان کی اپنے فن میں قابلیت کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، جب بریلی میں پہلی مرتبہ کالج قائم ہوا ہے تو اس کے پرنسپل مسٹر ہاکنس نے ان کو آفر (پیش کش) کی کہ آپ بریلی کالج میں آیئے اور ڈھائی سو روپے آپ کی تنخواہ ہوگی، تو انھوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ ریاست سے مجھے دس روپے ماہوار ملتے ہیں، وہ بند ہو جائیں گے، ہاکنس نے کہا کہ میں تو اس وظیفہ سے پچیس گنا زیادہ پیش کرتا ہوں، اس کے مقابلہ میں اس حقیر رقم کی کیا حیثیت ہے؟ انھوں نے عذر کیا کہ میرے گھر میں بیری کا ایک درخت ہے، اس کی بیری بہت میٹھی اور مجھے مرغوب ہے، بریلی میں وہ بیری کھانے کو نہیں ملے گی، اس نے کہا کہ رام پور سے بیری کے آنے کا انتظام ہوسکتا ہے، آپ بریلی میں گھر بیٹھے اپنے درخت کی بیری کھا سکتے ہیں، مولانا نے فرمایا کہ ایک بات یہ بھی ہے کہ میرے طالب علم جو رام پور میں درس لیتے ہیں، ان کا درس بند ہو جائے گا، اور میں ان کی خدمت سے محروم ہو جاؤں گا، انگریز کی منطق نے اب بھی ہار نہیں مانی، اس نے کہا کہ میں ان کے وظائف مقرر کرتا ہوں تا کہ وہ بریلی میں

آپ سے اپنی تعلیم جاری رکھیں اور اپنی تکمیل کریں، آخر میں انھوں نے اپنی کمان کا آخری تیر چھوڑا جس کا انگریز کے پاس کوئی جواب نہ تھا، مولانا نے فرمایا کہ یہ سب صحیح ہے، لیکن آپ یہ بتایئے کہ کل قیامت میں خدا یہ سوال کرے گا کہ تم رامپور چھوڑ کر بریلی اس لیے گئے تھے کہ یہاں دس روپے ملتے تھے اور وہاں ڈھائی سو روپے ملیں گے، تو میں اس کا کیا جواب دوں گا؟ انگریز بہرحال انگریز تھا، اس نے کہا کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

زہد واستغناء کی مثالیں آج پھر زندہ ہونی چاہئیں!

میرے عزیزو! میں تم سے صاف کہتا ہوں کہ ایسی مثالیں پھر زندہ ہونی چاہئیں، اللہ کا فیصلہ ہے اور اس کی سنت ہے، سارے آسمانی صحیفے بتاتے ہیں، انبیاء (علیہم السلام) کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے، اور مصلحین کی تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو عزت، سکونِ قلب اور روحانی سرور عطا فرماتا ہے، اور اس کے ساتھ جو برکت ہوتی ہے، وہ سب زہد ایثار پر موقوف ہے، اور اب پھر وہ دور آ گیا ہے، خاص طور سے ہندستان کے حالات اس زہد وایثار کے طالب ہیں، یہ بہت بری روایت شروع ہوگئی ہے کہ جہاں زیادہ پیسے ملیں، جہاں زیادہ آسودگی حاصل ہو، اور جہاں اپنے خاندان کی آسانی سے پرورش کرسکیں، وہیں جانا چاہیے، یہ بہت بڑی آزمائش ہے، اس سے بچنے کی دعا مانگنی چاہیے۔

جمہور اہل سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹیے گا!

تیسری بات جو بہت تجربہ کی ہے، وہ یہ ہے کہ میں نے بھی کتابیں پڑھیں ہیں، اسلام کے مذاہبِ اربعہ اور ان سے باہر نکل کر تقابلی مطالعہ کیا ہے، شاید کم ہی لوگوں نے اس طرح کا مطالعہ کیا ہو، ان تمام کے مطالعے کے نچوڑ میں ایک گر کی بات بتاتا ہوں کہ جمہور اہلِ سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹیے گا۔

اس کو لکھ لیجیے، چاہے آپ کا دماغ کچھ بھی بتائے، آپ کی ذہنیت آپ کو کہیں بھی لے جائے، کیسی ہی قوی دلیل پائیں، جمہور کے مسلک سے نہ ہٹیے گا، اللہ تعالیٰ کی جو تائید اس کے

ساتھ رہی ہے، جس کے شواہد وقرائن ساری تاریخ میں موجود ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کو باقی رکھنا تھا، اور باقی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہے، ورنہ بدھ مذہب کیا باقی ہے، عیسائیت کیا باقی ہے، عیسائیت کے بارے میں قرآن کا ''و لا الضّآلین'' کہنا ایک معجزہ ہی ہے، یعنی وہ پٹری سے بالکل ہٹ چکی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے چونکہ اس دین اسلام کے بارے میں فرمادیا ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ إِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ﴾ اور اس کے ساتھ جو تائید ہے، جو قوی دلائل ہیں، جو سلامتِ فکر اور سلامتِ قلب ہے، اس کے ساتھ جو ذہین ترین انسانوں کی محنتیں اور غور وخوض کے نتائج ہیں، اور ان کا جو اخلاص ہے، اور ذہن سوزی ہے، وہ کسی مذہب کو حاصل نہیں ہے۔

یہ وہ بات ہے جو ہمارے اور آپ کے استاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے بعض شاگردوں سے کہا، جیسا کہ مولانا اویس نگرامی صاحب نقل کرتے تھے، اور سید صاحبؒ سے ان کے استاذ مولانا شبلیؒ نے کہی تھی، بعض لوگ چمک دمک والی تحریر پڑھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلْبِهٖ﴾ [(۱)]، اور شہیدوں کا مذاق اڑاتے ہیں، اور کہیں علمائے سلف کا مذاق اڑاتے ہیں، کہیں مفسرین ان کے تیر کا نشانہ بنتے ہیں۔

لہٰذا مسلک جمہور سے اپنے کو وابستہ رکھیے، اس کا بڑا فائدہ ہوگا، اللہ کی خاص عنایت ہوگی، اس کی نصرت وبرکت ہوگی، اور حسنِ خاتمہ بھی ہوگا۔

یہ باتیں ہیں جن کو شاید زیادہ مؤثر طریقہ سے نہ کہہ سکا، لیکن آپ انھیں حقائق سمجھیں، اور یہ مطالعہ اور تجربہ کا ماحصل ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان باتوں تک پہنچا ہوں، اور آپ تک بطور امانت اور وصیت منتقل کرتا ہوں۔

علم سے ہمیشہ اشتغال رکھیں!

اور آخری بات یہ ہے کہ علم سے اپنا اشتغال رکھیے، اپنے کو کبھی فارغ التحصیل نہ سمجھئے،

(۱) سورة البقرة: ٢٠٤

ہمیشہ نئی اور پرانی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہیے، خواہ آپ کہیں رہیں، قرآن مجید کی تفسیریں، حدیث شریف کی شرحیں، تاریخ کی کتابیں، اور جو کتابیں علم کلام پر، اور صحیح عقائد کو پیش کرنے کے لیے صحیح طریقہ پر لکھی گئی ہیں، ان سب سے آپ کا ربط رہے، اور ان کا ہمیشہ مطالعہ کرتے رہیں، اور اپنے مرکز سے برابر تعلق قائم رکھیے۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ (۱)

---

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے فارغ ہونے والے طلبہ کے الوداعی جلسہ میں بتاریخ ۲۴ر فروری ۱۹۸۸ء بروز چہار شنبہ بعد نماز مغرب بمقام جمالیہ ہال میں کی گئی تقریر، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۲۵ر مارچ ۱۹۸۸ء)۔

تحفظ دین کا عہد کیجیے!

رفقائے کرام، برادران عزیز اور دار العلوم کے رشتے سے فرزندان عزیز!

کسی نسبی، حقیقی اور طبعی ماں کے لیے، مادر مشفقہ کے لیے، اور کسی فکری اور تربیتی اور اصلاحی و تعلیمی مادر مشفقہ کے لیے یہ بات کوئی فخر کی اور خوشی کی نہیں ہے کہ وہ اپنے فرزندوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھے، اپنی گود میں بٹھائے رکھے، اور اپنے گھر سے نکلنے نہ دے، کسی حیثیت سے بھی وہ ماں قابل مبارکباد نہیں ہوگی کہ جس نے اپنے بچے کو خون جگر سے پالا، (خواہ وہ مادر نسبی ہو، اور خواہ مادر علمی ہو) وہ اپنے بچوں کو اپنے سے جدا نہ ہونے دے۔

آج کا دن بھی ایسا ہے کہ اس مادر علمی کو اپنے فرزندوں کو الوداع کہنے، معنوی معنی میں الوداع کہنے کا موقع مل رہا ہے، اگر چہ وہ ان شاء اللہ ابھی کچھ دن رہیں گے اور اس کے بعد بھی ان کا تعلق اور ان کا رابطہ یہاں سے قائم رہے گا، جیسا کہ ان ادبی اور انشا پردازانہ مضامین سے، اور ندوۃ العلماء کے سرپرستوں کے اسلوب اور زبان میں جو اظہار خیال کیا گیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے۔

میں آپ کے سامنے دو ماؤں کی مثالیں رکھتا ہوں جنھوں نے اپنے فرزندوں کو جدا کیا، اور ان فرزندوں نے حق مادری نہیں، اور حق پدری نہیں، اور حق نسبی نہیں، بلکہ حق بندگی، حق وفاداری، حق شرافت اور حق ایمانی ادا کیا۔

حضرت خنساء کا واقعہ

ایک مثال جس پر بہت کم غور کیا گیا ہے، اس حیثیت سے اس کی اہمیت بہت کم محسوس

کی گئی ہے، تاریخ ادب کے مطالعہ میں اور دنیا کی ادبیات کے تقابلی مطالعہ میں، وہ حضرت خنساء کی ذات ہے، حضرت خنساء کا یہ امتیاز ہے کہ انھوں نے اپنے بھائیوں کی وفات پر ایسے دل دوز، جگر خراش مرثیے کہے، کہ جن کا میں اپنی محدود واقفیت کی بنا پر جو صرف تین چار زبانوں سے ہے، اور ان میں بھی مراتب ہیں، یہ کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کے لٹریچر میں اس کی مثال نہیں مل سکتی، کہ فرزندوں کے مرثیے، اور دل بندوں کے مرثیے، جگر گوشوں کے مرثیے، بادشاہوں کے مرثیے تو بہت ہیں، لیکن بھائیوں کے، ایک ایک بھائی پر اس طرح رونا اور عمر بھر روتے رہنا، یہاں تک کہ یہ ان کا امتیاز بن گیا ہے کہ وہ مراثی کی بہت بڑی شاعرہ ہیں، جنھوں نے اپنی پوری قوت شاعری، ملکۂ شاعری صرف کردی ہے اپنے بھائیوں کے مرثیہ میں، اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

اور آپ سب (اللہ تعالیٰ آپ کے عزیز و اقارب سب کو زندہ سلامت رکھے، اور آپ ان کے لیے قابل تسلی اور وہ آپ کے لیے قابل فخر ہوں) آپ بھائیوں اور فرزندوں کا فرق خوب سمجھتے ہیں، اس عمر میں بھی سمجھتے ہیں جو عمر اس کی زیادہ سمجھنے کی نہیں ہے، لیکن پھر بھی آپ اپنی فطرت سلیم سے سمجھتے ہیں، کہ بھائی کیسا ہی عزیز ہو، اور کیسا ہی وہ قابل فخر ہو، اور کیسا ہی وہ سرمایۂ حیات ہو، اور کیسا ہی بڑا محسن ہو، لیکن اس میں اور فرزند میں فرق ہوتا ہے۔

حضرت خنساء کا یہ امتیاز ہے کہ ساری عمر ان کی اپنے بھائیوں کا مرثیہ کہنے میں گزری، لیکن اس کا آپ مقابلہ کیجیے، اور میں اپنے ادنیٰ مطالعہ کی روشنی میں کہتا ہوں کہ ایسے مرثیے شاید کسی بھی زبان میں نہیں ملیں گے، جیسے کہ عربی زبان میں یہ مرثیے ہیں، اور وہ تاریخ ادب کا ایک اہم جز و اور عنصر ہے، لیکن یہ بات دیکھنے کی ہے کہ جب بیٹوں کا معاملہ آیا، فرزندوں کا معاملہ آیا، جو اُن کے جسم کے ٹکڑے تھے، آخری بات جو کہی جا سکتی ہے، وہ یہ کہ اُن کے جسم کے ٹکڑے تھے، کہ ایک غزوہ کے موقع پر اُنھوں نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور ایک ایک بیٹے کو رخصت کیا کہ جاؤ، اللہ کے راستے میں جہاد کرو، اور خبر آئی کہ وہ شہید ہو گیا، دوسرے بیٹے کو رخصت کیا، اور خبر آئی کہ وہ شہید ہو گیا، اور پھر تیسرے بیٹے کو، اور اس توقع نہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ بھیجتی تھیں کہ وہ زندہ نہیں آئے گا، اور کہتی تھیں کہ بیٹا کوئی کوتاہی نہ کرنا، اللہ کی راہ

میں جان دینا، اللہ تعالیٰ نے ان کو کئی فرزند عطا فرمائے تھے، جب سب بیٹوں کی شہادت کی خبر سنی تو یہ تاریخ ادب میں انھیں کے لفظوں میں اس بات کو محفوظ کر دیا گیا ہے کہ انھوں نے کہا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَكْرَمَنِيْ بِشَهَادَتِهِمْ"، "اس خدا کا شکر ہے جس نے مجھے عزت بخشی ان کی شہادت سے"۔

مادر علمی کی مثال

تو ایک مثال تو میں جسمانی اور طبعی اور فطری ماں کی دیتا ہوں، اور اسی کے ساتھ آپ مادر علمی یعنی مدارس دینیہ اور مربیان، سر پرستان علمی اور سر پرستان روحانی کے واقعات تاریخ میں دیکھیں گے، اور ہماری پوری تاریخ دعوت اس سے بھری ہوئی ہے، شروع سے لے کر آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ماں کی شفقت رکھنے والے، بلکہ بعض اوقات ماں کی شفقت سے زیادہ شفقت رکھنے والے بزرگوں نے اپنے فرزندوں کو جدا کیا اور اس وصیت کے ساتھ جدا کیا کہ جو حدیث کے الفاظ ہیں: "أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَ أَمَانَتَكَ وَ خَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ"، ان کو یہ وصیت کی کہ علم پھیلاؤ، دین کی حفاظت کرو، اور دین کے تقاضے جو ایک داعی کے لیے، اور دین کے ایک عالم و حامل کے لیے، اور ایک غیور مسلمان کے لیے اور ایک ایمان کی قدر و قیمت، اپنے ایمان کی بھی اور امت اسلامیہ کے ایمان کی بھی قدر و قیمت جاننے والے کا جو فریضہ ہے وہ ادا کرو، اس کی اتنی مثالیں ہیں کہ میں سب مثالیں نہیں دے سکتا، میں صرف دو مثالیں دوں گا، ہندوستان میں جن کو اس وقت کے حالات سے بہت زیادہ مطابقت ہے، اور میں ان کی مثالیں دے کر پھر بتاؤں گا کہ آج اس سعادت مندی کا، اس وفاداری کا، اور اس ایمان پروری کا، دین پروری کا، اور حمیت اسلامی کا تقاضا کیا ہے؟

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور فتنۂ اکبری کا مقابلہ

ایک حضرت مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کی مثال دوں گا، اس جلسہ میں بھی برکت پیدا کرنے کے لیے اور قبولیت پیدا کرنے کے لیے، اور ان کا حق سمجھ کر، کہ حضرت مجدد الف

ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ایک اکیلی ذات تھی، پورا اکبری دربار تھا اور اس کے وسائل تھے، اس کے ذخائر تھے، اس کے لشکر تھے، اور لشکر صرف فوجوں کے نہیں، سپاہیوں کے نہیں، بلکہ ذہین انسانوں کے لشکر تھے، اور میں اپنے تاریخی مطالعہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان ہی نہیں بلکہ اس عہد کے بعض ذہین ترین انسان اس کو میسر آ گئے تھے، ملا مبارک اور اس کے دونوں بیٹے ابوالفضل اور فیضی، اور پھر اس کے بعد ایران سے کئی ذہین لوگ، عبقری، جینئس قسم کے لوگ آ گئے تھے، جنہوں نے اکبر کی اس امیت اور اکبر کی اس عزیمت سے پورا فائدہ اٹھایا۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ جب اُمیت اور عزیمت دونوں جمع ہو جائیں، تو یہ بڑی خطرناک بات ہوتی ہے، اس لیے کہ علم ہے جو جگہ جگہ عنان پکڑتا ہے اور روکتا ہے، اور یا پھر ضعف ارادہ ہے، ارادہ کی، عزم کی کمزوری ہے جو عناں گیر ہوتی ہے اور سدّ راہ ہوتی ہے، لیکن جہاں اُمیت، جہاں لاعلمی اور عزیمت دونوں جمع ہو جائیں اور پھر اس کے ساتھ اس کو ایسے لوگ مل جائیں جو اس کو فکری غذا بھی پہنچاتے ہوں، اور جواز بھی مہیا کرتے ہوں، اس کے جو نتائج ہیں، وہ تصور سے بالاتر ہوتے ہیں، اور یہ نازک ترین گھڑی ہوتی ہے۔

ایک طرف اکبر اپنی ان طاقتوں کے ساتھ تھا، کہ اس کو اس وقت کے جو مابہ الامتیاز اور قابل فخر علوم سمجھے جاتے تھے، ان کے ماہرین یعنی فلسفہ و منطق کے ماہرین اور ادب اور شاعری کے ماہرین کی ایک جماعت مل گئی تھی، اور پھر یہاں کا جو برہمن عنصر تھا، اور یہاں کا ذہین عنصر تھا، وہ بھی اس کے ساتھ تھا، بیربل اور دوسرے جو اس کے ارا کین تھے، یہ سب ایک طرف تھا، اور ایک اللہ کا بندہ جس کا نام احمد بن عبدالاحد السرہندی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارش ہو اُن پر، اُن کی قبر مبارک پر، اُن کی روح مبارک پر، وہ تھے، انھوں نے اپنے فرزندوں کو، اور اپنے خلفاء کو تیار کیا اس فتنے کے مقابلے کے لیے۔

فتنہ کیا تھا؟ یہ وہ فتنہ تھا جس کا سمجھنا اس وقت دوسرے زمانوں کے مقابلے میں بہت آسان ہو گیا ہے، اور یہ بات کوئی خوشی کی نہیں ہے، مسرت کی نہیں ہے، بڑی ہی غم اور فکر کی

بات ہے کہ دور اکبری کا سمجھنا کسی اور زمانے میں اتنا آسان نہیں تھا جتنا اس زمانے میں، کہ جب اقتدار اور انتخاب کے ذریعے سے ملک کی سیاست و طاقت ان جماعتوں کے ہاتھ میں آرہی ہے، اور ان افراد کے ہاتھ میں آرہی ہے جو دور اکبری کا خواب دیکھ رہے ہیں، اور جن کے لیے دور اکبری کا خواب پورا کرنے کے زیادہ امکانات اور وسائل کو حاصل ہیں، مذہب کے رشتے سے بھی، اور ملک کے رشتے سے بھی، اور قدیم تاریخ کے حوالے سے بھی۔

وہ حضرت مجدد سرہندی ایک طرف ہیں، اور پورا اکبر کا دربار ایک طرف، اور اس میں بڑے مسلمان امراء بھی عبدالرحیم خان خاناں، اور سید فرید اور یہ حضرات بھی ہیں، جو بڑے گھرانوں کے چشم و چراغ ہیں اور شریف ترین اور ذہین ترین انسان ہیں، اس وقت کوئی تقابل نہیں تھا۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے جو ہمارے ندوۃ العلماء کے بانیوں اور سرپرستوں میں ہیں، انھوں نے حیدرآباد کی تقریر میں ایک بات کہی اور بڑا نکتہ بتایا، اور پھر اس کی تشریح مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے اپنے اس مضمون میں کی جو حضرت مجدد صاحب پر لکھا ہے اور ''الفرقان'' میں چھپا ہے، کہ لوگ تاریخ پڑھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اکبر کے بعد جہانگیر آیا، اور جہانگیر اکبر سے بہتر تھا، آپ کو معلوم ہے کہ ایک زنجیر عدل اس نے لٹکائی تھی، اور جب اس نے کانگڑہ کا قلعہ فتح کیا تو وہاں سب سے پہلا کام جو کیا ہے، وہ یہ کہ مسجد بنانے کا حکم دیا، اور گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا، یہ بعد میں معلوم ہوگا کہ یہ بات کہاں سے آئی؟ تو اکبر کے بعد جہانگیر آتا ہے جو اس سے کہیں بہتر ہے، اور جہانگیر کے بعد شاہجہاں آتا ہے جو تخت طاؤس پر بیٹھنے پر اتر جاتا ہے اور سجدہ کرتا ہے، اور دو رکعت نماز پڑھ کے کہتا ہے کہ فرعون بڑا اسبک سر اور بہت اوچھا آدمی تھا کہ آبنوس کے تخت پر بیٹھا اور اس نے خدائی کا دعوی کیا، لیکن میں امت محمدیہ کا فرد ہوں، میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں، تو جہانگیر کے بعد شاہجہاں آتا ہے جو اس سے کہیں بہتر ہے، اور شاہجہاں کے بعد پھر محیی الدین اورنگ زیب آتا ہے جو کہ صحیح معنی میں محیی الدین اورنگ زیب ہے، اور آپ تاریخ پڑھ سکتے ہیں۔

تو نواب صدر یار جنگ مرحوم نے فرمایا کہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ بد سے بدتر آتا ہے، اس لیے کہ وہ بدجو ہیں، اس کے اثرات ہوتے ہیں، اور پھر وہ جس حیثیت کا آدمی ہے، اور جو وسائل رکھتا ہے، اس کے مطابق اس کے اثرات پڑتے ہیں، تو اکبر اور اکبر کے اثرات کو، بلکہ اکبر کی جہانگیری کو، اس کی فتوحات کو، اور اس کی شہر کشائی کو، اور لشکر کشی کو دیکھیے کہ اس وقت سلطنت عثمانیہ کے خلیفہ کے بعد سب سے طاقتور سلطنت اس وقت اکبر کی سلطنت تھی، پورے ایشیا میں نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام میں، اور سمجھئے کہ ایک حیثیت سے متمدن دنیا میں، تو اکبر کے بعد اس سے بدتر آدمی آنا چاہیے تھا، اس لیے کہ عام طور پر زمانہ انحطاط کی طرف چلتا ہے، اور برے اثرات کو قبول کرتا ہے، اور نشیب کی طرف جانا آسان ہوتا ہے، اور بلندی کی طرف جانا مشکل ہوتا ہے، کیا بات ہے کہ اکبر کے بعد جہانگیر آتا ہے جو اس سے بہتر، اور جہانگیر کے بعد شاہجہاں آتا ہے جو اس سے بہتر، اور شاہجہاں کے بعد محیی الدین اورنگ زیب آتا ہے جو اس سے کہیں بہتر، جس کو علی الطنطاوی کہتے ہیں کہ وہ سادس الخلفاء الراشدین ہیں، ان کو چھٹا خلیفۂ راشد ماننا چاہیے، اور پورا مضمون ہے بقية الخلفاء الراشدين کے عنوان سے، جس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ وہ خلفاء راشدین کا ایک نمونہ تھے، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد ایسی مثال ملنی مشکل ہے۔

تو نواب صدر یار جنگ نے کہا کہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا یہ فطرت انسانی کے، تجربۂ انسانی کے، تاریخ انسانی کے، نفسیات انسانی کے خلاف ہو رہا ہے، کہ ایک غلط آدمی ہے، اور وہ پورے اپنے غلط ہونے کا سایہ پھیلاتا ہے، اور وہ بالکل ڈھالنا چاہتا ہے اس سانچہ میں، لیکن اس کے برخلاف ہوتا ہے کہ اس سے بہتر آدمی آتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ حضرت مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اندر اندر ایسا انقلاب کیا کہ جو بعد میں آتا ہے وہ بہتر ہوتا ہے، چنانچہ سب کو معلوم ہے محیی الدین اورنگ زیب ان میں سب سے بہتر تھا، اور اس کے حالات بالکل اولیاء اللہ کے سے ہیں، یعنی اس کے حالات کیا بیان کیے جائیں!، انتقال کے وقت اس نے وصیت کی کہ یہ ڈیڑھ روپے دو روپے جو ہیں یہ میرے کفن میں صرف کیے جائیں، اس سے زیادہ

میرے کفن میں صرف نہ کیا جائے، اس لیے کہ ٹوپی سی سی کر میں نے اس کی قیمت جمع کی ہے، اور باقی میرا جو ترکہ ہے اتنے سوا تنے ہزار کا، وہ میں نے قرآن شریف لکھ کر اس کو حاصل کیا تھا، وہ غریبوں میں تقسیم کردیا جائے، پھر روزے کی جو شان لکھی ہے سوانح نگاروں نے، اور میں اپنے والد صاحب کی کتاب کا حوالہ نہیں دوں گا، کہ بہر حال وہ عالم دین تھے، اور ان کے جذبات اور خاندانی اثرات تھے، لیکن منشی ذکاء اللہ صاحب اور پھر فاروقی صاحب کی کتاب جو انگریزی میں ہے، بہرائچ کے ایک وکیل تھے، سب سے بہتر کتاب ہے انگریزی میں، اور اس کے علاوہ ہمارے بشمبر ناتھ پانڈے صاحب، جو کل تک یہاں موجود تھے اور کل کے جلسے میں تھے، انھوں نے اپنی کتاب میں اورنگ زیب کا جو کیریکٹر دکھایا ہے، اس سب سے معلوم ہوتا ہے، یہ کیا بات ہے؟ یہ بالکل خرق عادت ہی ہے یا اس کو اتفاق پہ محمول کیا جائے؟ یہ حضرت مجدد صاحب کا اثر ہے کہ وہ اور ان کے تربیت یافتہ خلفاء اور سب سے بڑھ کر ان کے صاحب زادے حضرت خواجہ محمد معصوم، ان کی روحانیت، ان کا درد دل، ان کا سوز جگر، اور ان کی فکر اور دین سے ان کا عشق کام کر رہا تھا، کہ جو اب آتا تھا وہ پہلے سے بہتر ہوتا تھا، یہ حضرت مجدد صاحب کا میں ایک حوالہ دیتا ہوں۔

جہاں تک اورنگ زیب کا تعلق ہے، تو خیر وہ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی سے بیعت تھے، انھوں نے خواجہ محمد معصوم کو بلانا چاہا، تو وہ تو کہاں آتے، انھوں نے اپنے صاحب زادے خواجہ سیف الدین کو بھیج دیا، وہ قصر سلطنت میں رہے، وہاں پہلے جاتے ہی وہاں کے ان منکرات کو دور کیا جو پہلے سے چلے آرہے تھے، اور پھر اپنے والد صاحب کو خط لکھا کہ بادشاہ میں آثار ذکر ظاہر ہو چکے ہیں، اور خود حضرت خواجہ محمد معصوم کے مکاتیب دیکھیے جو بادشاہ کو لکھے ہیں، تو اس میں وہ ان کو شہزادۂ دیں پناہ لکھتے ہیں، جب وہ شہزادہ تھے، یہ ان کی فراست ایمانی اور ان کی روحانیت ہے کہ اس وقت جب اس کا کوئی امکان نہیں تھا، وہ لکھتے ہیں شہزادۂ دیں پناہ، وہ شہزادۂ دیں پناہ سلطان دین پناہ بن گیا، تو نواب صدر یار جنگ مرحوم نے فرمایا کہ لوگ نہیں دیکھتے کہ یہ کیوں ہو رہا تھا، یہ انحطاط کے بجائے ترقی کیوں ہو رہی تھی، بہتری کی طرف کیوں جا رہا تھا یہ خاندان مغلیہ؟ یہ اثر تھا حضرت مجدد الف ثانی کا۔

ایک ماں وہ تھی جس نے ایسے فرزند پیدا کیے، اور انھوں نے یہ کرامت دکھائی، اور یہ میں ایک اعجاز نہیں کہتا، معجزہ نہیں کہتا، لیکن یہ بالکل ایک خارق عادت چیز دکھائی، کہ تاریخ انسانی کے دفتر میں ایک نیا تجربہ ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور خدمت حدیث

اس کے بعد میں دوسرا نام لوں گا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا، اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقت میں یہ دار العلوم ندوۃ العلماء اور دوسرے مدارس جن میں دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم، اور اس کے ہم مسلک جتنی درسگاہیں ہیں، وہ سب حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے مدرسۂ فکر پر قائم ہوئے ہیں، سن لیں فضلاء جو جا رہے ہیں کہ آپ اسی خاندان کے نونہال ہیں، آپ اسی شجرۂ طوبی کی شاخیں ہیں، اور پتے ہیں، آپ کو کبھی اس شجرۂ طوبی سے اپنا رشتہ نہیں توڑنا چاہیے، آپ کی سب سے بڑی کامیابی اور سعادت مندی اور آپ کی سعادت فرزندی یہ ہے کہ آپ اس شجرۂ طوبی سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی شاخ ہم سمجھتے ہیں کہ کم سے کم ہندوستان میں ہر صحیح العقیدہ، توحید خالص اور سنت سنیہ کی پیروی کرنے والے کے گھر میں ضرور ہوگی۔

اِس مادرِ علمی نے کیا کیا؟ مجھے معاف کیا جائے، میں یہ لفظ بولتا ہوں کہ اس سے زیادہ شفقت کا لفظ اور فطری تربیت کا لفظ اور جس کے لیے عربی میں بھی اُمومۃ سے بڑھ کر، حنانِ اُم سے بڑھ کر کوئی لفظ نہیں ہے، اس ولی اللّٰہی درسگاہ اور مادرِ علمی نے کیا کیا، کہ حدیث تقریباً ہندستان سے ناپید ہو چکی تھی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی باہر سے حدیث لے کر آئے، لیکن وہ ان کے فرزندوں کے دائرہ میں محدود تھی، اور آپ اگر پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کی کتاب جوان پر ہے، اس کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات کیا پڑے، ان کے اثرات پڑے، اور وہ بہت ہی قابل اعتراف اور قابل شکر ہیں، اور وہ مستحق دعا ہیں۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ حدیث کے درس کی عمومیت، حدیث کی تحقیق، حدیث کی

خدمت، اور صحاح ستہ کا درس، اور اس سے بڑھ کر سنت سنیہ کی اشاعت اور اس کی رغبت پیدا کرنا اور بدعات کے خلاف جہاد، اور بدعت کے خلاف محاذ آرائی، ایک پورا محاذ قائم کرنا، علمی محاذ، فکری محاذ، اعتقادی محاذ، عملی محاذ قائم کرنا، یہ فیض ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کی درسگاہ کا۔

انھوں نے دہلی کے ایک محلّہ میں، ہم نے اس محلّہ کی زیارت کی ہے، اور اگر آپ والد ماجد مرحوم (رحمۃ اللہ علیہ) کا سفرنامہ ''دہلی اور اس کے اطراف'' پڑھیں، جو حضرت سید سلیمان ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے حواشی کے ساتھ 'معارف' میں سب سے پہلے شائع کیا، اور پھر اس کے بعد وہ انجمن ترقی اردو (دہلی) کی طرف سے شائع ہوا، اور اس کے کئی ایڈیشن نکلے ہیں، تو (اب تو مکان بھی معلوم نہیں اس کے نشان ہیں یا نہیں) دہلی کے غریبوں کے ایک محلّہ میں، ایک بالکل دُنیا کے سامان آرائش سے خالی، (محروم تو نہیں کہتا) ایک گوشہ میں ایک مکان تھا، وہاں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کا درس دینا شروع کیا، اور وہیں حجۃ اللّٰہ البالغۃ اور یہ کتابیں لکھی گئیں، یا کچھ سفر میں، اور وہاں صحاح ستہ کا درس دیا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے درس دیا، اس درس سے کیسے لوگ پیدا ہوئے؟ شاہ اسحاق صاحب محدث اور حضرت شاہ محمد یعقوب محدث، شاہ عبدالغنی محدث، جن کے تلمذ کا سلسلہ دیوبند تک پہنچتا ہے، اور حضرت مولانا علامہ حیدر علی رامپوری مقیم ٹونک اور ایسے بڑے محدث اور عالم پیدا ہوئے، پھر اس کے بعد اِن لوگوں نے وہاں حرمین شریفین میں جا کر، حجاز میں جا کر حدیث کا درس دیا، اور حدیث عام ہوئی۔

تو میں نے یہ مثالیں مادر علمی، مادر روحانی، مادر تربیتی کی دیں، ان کے کارنامے کو میں نے بیان کیا، ایسی کئی اور مادر علمی کی مثالیں دی جاسکتی ہیں، اور ایک خنساء کا واقعہ بیان کیا جنھوں نے اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹوں کو میدان جنگ کے لیے رخصت کیا، یہ جانتے ہوئے کہ یہ شہادت زار ہے، یہاں آدمی اسی لیے جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں سر کٹائے، اور ان کی شہادت پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

آج کا فتنہ کیا ہے؟

اب میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ کے لیے سعادت مندی کی بات، اور آپ کے لیے انتہائی شرافت کی بات، اور شکر گزاری کی بات، اور بلکہ خوش قسمتی اور بلند طالعی کی بات یہ ہے کہ آپ اس وقت یہاں سے نکلنے کے بعد اس وقت کے فتنے کو آپ سمجھیں، آج کیا ہے؟ میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے استیصال (اور جس کو عربی میں حــرکة الإبــادة کہتے ہیں)، یعنی ان کی معنوی، اعتقادی، تہذیبی، ثقافتی نسل کشی کا پور انقشہ تیار ہے، پورا منصوبہ تیار ہے، اور چونکہ مجھے دینی تعلیمی کونسل کی خدمت کا شرف حاصل ہے، اور شروع سے اس سے تعلق ہے، اور اس کے ذریعے سے بہت سی ایسی چیزوں پر نظر پڑ جاتی ہے جن پر عام لوگوں کی نظر نہیں پڑتی، کہ اس وقت بی جے پی کے پاس بھی، اور جو ہندو فرقہ پرست لیڈر ہیں اور جن کو اپنی قوم میں مقبولیت حاصل ہے، اور وسائل حاصل ہیں، امکانات بھی ان کے لیے آسان ہیں، ان کے پاس پورا نقشہ بنا ہوا ہے کہ بہت ہی دل پہ پتھر رکھ کر اور بڑی اذیت کے احساس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ اس ملک کو (اس سے زیادہ اور میں نہیں کہہ سکتا)، اس ملک کو اسپین بنا دینا چاہتے ہیں، یہ نقشہ بالکل تیار ہے، اس میں کسی قسم کا تردد اور ابہام نہیں ہے، فیصلہ شدہ بات ہے، اور اسی کے لیے سب یہ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ بابری مسجد کی شہادت، اور ان کے اس وقت جو جذبات ہیں، اگر آپ ہندی کے اخبارات پڑھتے ہوں یا کم سے کم انگریزی ہی کے اخبارات پڑھتے ہوں، یا ان کے کسی جلسہ کی روداد آپ کو معلوم ہو، اور ان کی تقریروں کے اگر آپ خلاصے سن لیں، یا وہاں آپ شریک ہو سکیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس پر پورا اتفاق رائے ہو گیا ہے، پورا اجماع جیسے ہوتا ہے، کہ اس ملک میں اب یہ ایک نیا دور شروع ہوگا، اور اب یہاں مسلمانوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں، ان کو باہر چلا جانا چاہیے، اور اگر یہ رہیں تو اپنے ہر قسم کے ملی تشخص سے محروم نہیں، بلکہ بے زار ہو کر رہیں، ہر قسم کا تشخص جو ان کو ممتاز کرتا ہے غیر مسلموں سے، ان لوگوں سے جو مسلمان نہیں، ان سب خود دستبردار ہوں اور بے زار ہوں، اس کی تفصیلات میں میں جانا نہیں

چاہتا اور اس کی طبیعت متحمل بھی نہیں ہے، لیکن اس کی تفصیلات آتی رہتی ہیں، اور اندیشہ ہے کہ اور زیادہ آئیں۔

آج پورا ایک دور اکبری شروع ہو رہا ہے

تو اس وقت یہ ایک پورا دور اکبری شروع ہو رہا ہے، لیکن دور اکبری سے زیادہ اس کے پاس اسلحہ اور سہولتیں اور مقبولیت کے ذرائع ہیں، اور یہاں کی تاریخ اور یہاں کی سرزمین اور یہاں کے جو تاثرات اور جذبات ہیں، ان سے زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے، کہ اکبر نے تو ایک ایسی چیز شروع کی تھی جس کے لیے ملک پورے طور پر تیار نہیں تھا، لیکن اب صحافت کے ذریعے، ایڈمنسٹریشن کے ذریعے، لٹریچر کے ذریعے، اور سب سے بڑھ کر پھر سیاسی انتخابات و الکشن کے ذریعے ملک کو تیار کر دیا گیا ہے کہ یہاں کی اکثریت اس پر تلی ہوئی ہے کہ اس ملک سے اسلام کا اخراج کر دے، یا کم سے کم مسلمان اس ملک کو چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو جائیں، جن میں ذرا بھی دینی حمیت ہے۔

اب میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں، اور اپنے اوپر حق سمجھتا ہوں کہ آپ سے یہ کہوں کہ اس وقت آپ کے لیے، بغیر کسی معذرت کے کہتا ہوں، اور اپنے عقیدے اور اپنے تجربے اور الحمدللہ اپنے اور اپنے متعدد ساتھیوں کے عمل و کردار کے اعتماد پر بھی کہتا ہوں کہ یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں، ایسی بات نہیں جو صرف خیالی ہے، اور جو صرف آپ سے کہی جا رہی ہے، اور اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے کہ آپ کی کامیابی اس میں نہیں ہے، آپ کے حق فرزندی ادا کرنے کا یہ مظہر نہیں ہے کہ آپ یونیورسٹیوں میں جائیں، اور وہاں سے گریجویشن کریں، صاف صاف کہتا ہوں، میں انگریزی زبان کا مخالف نہیں، الحمدللہ انگریزی زبان سے واقف ہوں، انگریزی زبان سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، اور اپنی مجلسوں میں کہتا رہتا ہوں کہ تھوڑی سی انگریزی جاننی چاہیے، تاکہ آپ اسلامیات پر ایسا تقابلی مطالعہ پیش کر سکیں اور ان کتابوں کے حوالے دے سکیں، اور یہاں انگریزی نصاب درس میں داخل ہے، لیکن آپ اس کو مقصد بنائیں، آپ اس کو اپنی کامیابی کا معیار سمجھیں کہ آپ یونیورسٹیوں میں جائیں، اور بی.

اے ، ایم .اے .کریں ، اور اس کے بعد آپ کو کہیں لکچررشپ مل جائے ، کہیں اور آپ کو کوئی جگہ مل جائے ، یہ آپ کی سعادت مندی اور حق فرزندی نہیں ۔

یہ بھی صفائی سے کہتا ہوں کہ آپ کی سعادت مندی اور حق فرزندی یہ نہیں ہے کہ آپ خلیج عرب میں جائیں اور آپ وہاں نوکریاں تلاش کریں ، جو آپ کو آسانی کے ساتھ مل سکتی ہیں اور آپ کے بہت سے بھائی ، یہاں کے فضلاء وہاں ہیں ، لیکن میں صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے کسی ایک چیز کے ذریعے بھی آپ یہاں کا حق نہیں ادا کرسکیں گے جس حق کا اظہار آپ نے بڑی بلاغت کے ساتھ ، اور بڑی ادبیت کے ساتھ ، اور بڑے اعادہ اور تکرار کے ساتھ اپنے قابل قدر مضامین میں کیا ہے ، اور میں سنتا رہا ہوں کہ آپ نے اس دارالعلوم سے ، اس کے اساتذہ سے ، اپنے کس شریفانہ تعلق کا ، اپنے فرزندانہ تعلق کا اور رابطہ کا اظہار کیا ہے ، اس کا حق اس سے نہیں ادا ہوگا ۔

اگر یہی کرنا تھا میرے عزیزو ، پھر انگریزی پڑھتے اور آپ انگلینڈ اور امریکہ جاتے ، اور وہاں بھی نوکریاں مل رہی ہیں اور ہمارے لاکھوں لاکھ پاکستانی ہندوستانی وہاں موجود ہیں ، آپ نے عربی پڑھی ، آپ نے قرآن ، سب سے آخری چیز جو اللہ کا کلام پڑھا ، اور پھر اس کو براہ راست اسی زبان میں جس زبان میں اترا تھا ، اس میں سمجھنے کی اہلیت پیدا کی ، اور آپ نے حدیث پڑھی ، اللہ کے رسول کا محفوظ کلام پڑھا ، اور پھر آپ نے یہاں رہ کر مجددین کے حالات ، مصلحین کے حالات پڑھے ، انھوں نے کیسے کیسے نازک زمانے میں ملکوں کو سنبھالا ہے ، معاشرے کو سنبھالا ہے ، اور بعض اوقات پورے پورے براعظم میں دین پھیلا دیا ہے ، حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی کے خلفاء تھے ، اس کا انگریز مؤرخین بھی اعتراف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ افریقہ میں جو اسلام پھیلا ہے ، زیادہ تر قادری سلسلے کے مشائخ سے پھیلا ہے ، ابھی انڈونیشیا ، ملیشیا جو آپ کے قریب ہمسایہ ملک ہیں ، یہاں اسلام کس کے ذریعے سے پھیلا ؟ حضرموت کے سادات ، اور حضرموت کے تجار اور یہ عرب کے ساحل کے قریب کے بسنے والے ، وہاں گئے ، یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس کا ایک ثبوت بھی نہیں ہے کہ کوئی اسلامی لشکر انڈونیشیا اور ملیشیا وغیرہ گیا ہو ، اور وہاں اس کے ذریعہ سے اسلام پھیلا ہو ،

نہ کوئی اسلامی لشکر نہ چین گیا ہے اور نہ ہی یہاں ان ملکوں میں گیا ہے، جن کا میں نے ابھی نام لیا، جنوبی ایشیا کے یہ ملک ہیں، یہ ان مسلمان تاجروں اور سادات، اور طریقۂ غزالیہ کے شیوخ اور دوسرے شیوخ کے ذریعے سے مسلمان ہوئے۔

تحفظ دین کا عہد کیجیے!

تو آپ کی اس میں جو کچھ کہیے، کہ جیسے برّ بالوالدین ہوتا ہے، برّ بالمدرسۃ، برّ بالاساتذہ اور دین کی نعمت کی قدردانی اور شکرگزاری یہ ہے کہ آپ یہ بات طے کرلیں کہ یہاں سے نکلنے کے بعد اسلام کو اس ملک سے مٹنے نہیں دیں گے، اور ملت کو اپنے پورے تشخصات کے ساتھ، یہاں تک کہ آج لوگ کہتے ہیں، یہ کہنے لگے ہیں کہ پرسنل لا کے مسئلہ پر اتنا اڑنے کی کیا ضروت تھی؟ کیا تھا اگر ہو جاتا اور دائمی نفقہ ملتا؟ یہاں تک لوگ کہنے لگے ہیں، بعض ایسے لوگ جو صاحب فکر سمجھے جاتے ہیں۔

لیکن نہیں! اُمتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب تک کہ ان چیزوں پر آدمی نہ جمے جن میں تھوڑی بہت اجازت ہے ہٹنے کی، اس وقت تک ان چیزوں کی بھی حفاظت نہیں ہوسکتی جن کی پوری پوری حفاظت، کلی حفاظت ضروی ہے۔

تو آپ یہاں سے ارادہ کرکے نکلیں، وقت ہوگیا ہے، میں زیادہ طول بھی نہیں دینا چاہتا، کہ اگر صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے اعتماد پر کہتا ہوں کہ اگر صرف یہ مجمع، یہاں سے نکلنے والے یہ فضلاء یہ طے کرلیں کہ ہم اپنی زندگیاں، اپنی توانائیاں، اپنی ذہانتیں، اپنی محنتیں سب اس پر صرف کردیں گے کہ یہاں سے اسلام باہر جانے پر مجبور نہ ہو، اور یہ اپنے پورے تشخص کے ساتھ رہے، اور اپنے علم دین کے ساتھ رہے، یہاں مدارس ہوں، مکاتب ہوں، اور قرآن وحدیث کی تعلیم ہوتی ہو، تو بالکل ممکن ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حالات میں انقلاب پیدا کردے، اور اس کا سہرا آپ کے سر بندھے، یا اس دارالعلوم کے بانی، اور دارالعلوم دیوبند کے بانی، میں ان سب کو کہتا ہوں، ان سب کو ایک کنبہ اور ایک خاندان سمجھتا ہوں، کہ ان کے بانیوں کو اس کا ثواب ملے گا، اور اب جو کچھ امید ہوسکتی ہے وہ ان مدارس کے فضلاء ہی سے

ہوسکتی ہے، باقی سب کا تجربہ ہو چکا، ہمارا اپنے رہنماؤں کا، اپنے مفکرین کا، اور اخبار نویسوں کا، مضمون نگاروں کا، سب کا تجربہ ہوگیا کہ اس پر ان میں وہ ثابت قدمی، اور وہ استقلال نہیں ہے جو ہونا چاہیے، جس کی اگر امید کی جاسکتی ہے تو مدارس عربیہ کے فضلاء سے۔

آپ اپنے طور پر اللہ سے عہد کریں، یہاں نہ کسی اعلان کی ضرورت ہے، اور نہ کسی اظہار کی ضرورت ہے، آپ اللہ سے دعا بھی کریں، اور اللہ سے عہد و پیمان بھی کریں کہ ہم ان شاء اللہ اس دین کے تحفظ کی پوری کوشش کریں گے، اور اپنی پوری صلاحیتیں اس پر لگادیں گے۔

رزق کا اللہ متکفل ہے

اور یہ میں آپ سے، اذان ہورہی ہے، اس اذان کی برکت وحرمت کے سایہ میں، اس کی آواز کے سایہ میں کہتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو فاقے سے نہیں رکھے گا، اور آپ کو دوسروں سے زیادہ عزت کے ساتھ کھلائے گا ان شاء اللہ، اور آپ کے دسترخوان پر وہ لوگ ہوں گے کہ جو رئیسوں کے دسترخوان پر نہیں ہوتے، ان گنہگار آنکھوں نے دیکھا ہے، مولانا مدنی کا دسترخوان دیکھا ہے، حضرت شیخ الحدیث کا دسترخوان دیکھا ہے، اپنے بزرگوں کے دسترخوان دیکھے ہیں، کیا کسی امیر کو نصیب ہوں گے ایسے معزز مہمان، اور ایسے کثیر التعداد مہمان، اور ایسے کثیر الانواع اطعمہ، کہ جو اُن کو نصیب تھے۔

تو آپ بالکل اطمینان رکھیے کہ رزق کا اللہ تعالیٰ متکفل ہے، اور اس کے لیے آپ اپنی یہ بضاعت، اپنا یہ سرمایہ جس کا آپ نے بڑے تفاخر کے ساتھ اور بڑے تشکر کے جذبہ کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس کو آپ ان چھوٹی چھوٹی نوکریوں پر جو خلیج میں، سعودی عرب میں مل جاتی ہیں، یا یہاں جو آپ انگریزی پڑھ کر کے کہیں کسی کالج میں لگ جائیں، کسی اسکول میں آپ لگ جائیں، اس پر آپ اس کو قربان نہ کریں، اس کی قیمت صرف اللہ ادا کرسکتا ہے، اور اس کی قیمت صرف اللہ کے پاس ہے، اور وہ کیا ہے؟ ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ (۱)

---

(۱) سورة التوبة: ۷۲

بس میں اس پر ختم کرتا ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ توفیق دے ہمارے ان عزیزوں کو، کہ ان میں سے جی تو چاہتا ہے کہ کل سو فیصدی، لیکن اس میں سے ان کی بیشتر تعداد، ان کی اکثریت اس بات کا عہد کرے کہ ہم انشاء اللہ اپنی ساری توانائیاں لگادیں گے دین کی حفاظت میں، اور ملت کے تشخص کی حفاظت میں، اور اس ملک کو اسپین نہیں بننے دیں گے، بلکہ ہوسکتا ہے ہم اللہ سے دعا کریں گے کہ یہاں اسلام کے قبول کرنے کا دروازہ کھلے، اور اس کے بھی آثار ہیں، میں آپ کو صاف بتادیتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ بالکل خارق عادت طریقے پر یہ بات ظاہر ہو، اس سلسلے میں اتنا عرض کردوں کہ میرے پاس خطوط آرہے ہیں اور اخبارات بھی کہ جن لوگوں نے بابری مسجد کو شہید کیا، اُن میں بڑی تعداد پاگل ہورہی ہے، اور پھر ان میں سے بہت سے وہ جو دعاؤں کے ذریعے پھر ٹھیک ہوگئے، تو وہ اسلام قبول کررہے ہیں، اس کے لیے اس کی بھی شہادتیں پیدا ہورہی ہیں، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت سے، اور اس کا جو دین سے تعلق ہے، اس کے لحاظ سے یہ بات کوئی بعید از قیاس نہیں ہے، اور ناممکن نہیں ہے، لیکن آپ ارادہ کریں اور اپنی زندگیوں کے متعلق فیصلہ کریں، پھر اللہ تعالیٰ ہر چیز کا متکفل ہے وھو خیر الرازقین، و صلی اللّٰہ تعالی علی خیر خلقه سیدنا و نبینا محمد و علی آله و صحبه أجمعین۔[1]

---

(۱) تعلیمی سال کے اختتام کے موقع پر ۲۵/ جنوری ۱۹۹۳ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلبہ کے سامنے کی گئی تقریر، یہ تقریر ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے قلمبند کی گئی۔ (مرتب)

وقت کا جہاد

ایک وصیت

فرزندانِ عزیز! میں اس مجلس کے لیے اور یہاں سے فارغ ہوکر جانے والوں کے لیے اس سے بہتر پیغام اور اپنے مطالعہ و معلومات اور اپنے علمی ذوق و جستجو میں اس سے بڑھ کر کوئی وصیت نہیں پاتا جس میں حضور اکرم (ﷺ) نے سفر پر جانے والے صحابہ کرامؓ سے فرمایہ تھا: ''أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَأَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ '' (میں اللہ کے حوالے کرتا ہوں تمہارا دین، اور تمہاری امانت، اور تمہارے خواتیم اعمال)۔

ان الفاظ میں 'امانت' کا لفظ ایسا ہے جس کے مفہوم کو ایک مفرد لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، ضمیر کی بیداری، احساسِ فرض، فرائض کی ادائیگی، اللہ تعالیٰ کا خوف، انسانوں سے محبت، احکامِ الٰہی کا احترام اور ان پر عمل، یہ سب مفاہیم اسی ایک لفظ میں شامل ہیں، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً﴾ (۱) (ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا، اور اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھالیا، بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا)۔

دین، امانت اور حسن خاتمہ

عزیزو! میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ ان تینوں چیزوں کو گرہ میں باندھ لیجیے، بلکہ لوح

(۱) سورة الأحزاب:۷۲

دل پر لکھ لیجیے: دین، امانت اور حسن خاتمہ۔ ان میں خواتیم اعمال کی ذمہ داری آپ پر اس طرح کی نہیں ہے جس طرح کی دین وامانت کی ذمہ داری آپ پر ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے کرنے کی چیز ہے، لیکن اس کے لیے بھی کچھ اسباب ہیں، کچھ صفات وخصوصیات ہیں جن کا آپ کے اندر ہونا ضروری ہے، وہ ہے آپ کا طرزِ عمل، آپ کا عقیدہ اور آپ کا عمل ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حسن خاتمہ کا فیصلہ ہوگا، وہی حسن خاتمہ نصیب کرے گا، شرط یہ ہے کہ ان بنیادی صفات سے آپ متصف ہوں جن پر حسن خاتمہ کا انحصار ہے۔

عزیزو! میں صاف صاف آپ سے کہتا ہوں، اور اس میں کسی اشارے کنایے سے کام نہیں لیتا، کہ آپ نماز پنجگانہ کی پابندی کریں، نوافل وتسبیحات کو بھی ترک نہ کریں، تاکہ معلوم ہو کہ آپ کسی دینی درسگاہ سے پڑھ کر آئے ہیں، مسجد کی طرف جانے میں، بلکہ تمام کاموں میں ثواب کی نیت کریں، میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کی جو منزلیں اور جو امتحانات اور آزمائشیں آپ کو پیش آنے والی ہیں، اور یہ ملک، بلکہ ملت اسلامیہ جس راستہ سے گزر رہی ہے، پھر معاشی ذمہ داریاں، خاندان کی پرورش کا مسئلہ ہے، پھر جو اخلاقی بیماریاں اور امراض ہیں، وہ سب نماز کی ادائیگی میں فرق پیدا کر سکتے ہیں، اور اس کی طرف سے توجہ ہٹا سکتے ہیں۔

مسلک ولی اللہی کو اپنا دستور العمل بنائیں!

مگر اس نماز سے بھی پہلے بنیادی اہمیت عقیدۂ توحید کی ہے کہ آپ کا عقیدہ خالص اور بے آمیز توحید کا عقیدہ ہو، اس سلسلہ میں مسلک ولی اللہی آپ کا معیار اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی کتاب 'تقویۃ الایمان' آپ کا دستور العمل ہو، اسی عقیدہ پر ہماری جماعت کی بنیاد پڑی ہے، اس دور میں کم سے کم ہندوستان بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایشیا اور پورے مشرق میں جو فکر سب سے زیادہ عمیق، اور علمی بنیادوں پر استوار اور اسلام کی کلی تعبیر اور صحیح تعبیر کے لحاظ سے، نیز سب سے زیادہ مفید، قابل عمل اور وقت کے اعتبار سے زندہ اور طاقتور بھی ہے، وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی فکر اور ان کا مسلک ہے، شاہ ولی اللہ کے مسلک سے بہتر کوئی مسلک نہیں۔

آپ 'حجۃ اللہ البالغۃ' کا مطالعہ بھی کریں جس میں نظام عبادات کی مربوط تشریح کی

گئی ہے، ہماری کتاب 'تاریخ دعوت وعزیمت' کا وہ حصہ خاص طور پر پڑھیں جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے متعلق ہے، اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ فکر ولی اللہی سے بڑھ کر ترقی یافتہ، عالمانہ، محققانہ، حقیقت پسندانہ کوئی اور مکتب تجدید و اصلاح اور مکتب دعوت نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ پورے عالم اسلام میں نہیں، پورے عالم اسلام میں اس کی نظیر نہیں، آپ اس مسلک کو اپنائیں اور اس کو دستور العمل بنائیں۔

زہد واستغناء

تیسری بات یہ ہے کہ آپ زہد واستغناء کی ایسی مثال قائم کریں کہ بڑی سے بڑی حکومت وسلطنت آپ کو نہ خرید سکے، اس دین کے اب تک باقی رہنے کا ایک راز یہ بھی ہے کہ ربانی وحقانی علماء کو آج تک کوئی خرید نہیں سکا، شیخ سعید حلبی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ جامع اموی میں بیٹھے درس دے رہے تھے، ان کے پاؤں میں تکلیف تھی جس کی بنا پر پاؤں پھیلائے ہوئے تھے کہ اتنے میں شام کا گورنر آیا جو بڑا سفاک اور جبار قسم کا حکمراں تھا اور معمولی بات پر گردن اڑا دیا کرتا تھا، شیخ اسی حالت میں درس دے رہے تھے کہ گورنر اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ آیا، وہ کچھ دیر تک حلقۂ درس کے پاس کھڑا دیکھتا رہا، شیخ بے نیازی سے اپنے کام میں مصروف تھے، یہ صورت حال دیکھ کر طلبہ نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے کہ کہیں اس مجلس میں ہمارے شیخ کی گردن نہ اڑا دی جائے جس کے خون کے چھینٹے ہمارے کپڑوں پر پڑ جائیں، گورنر تھوڑی دیر کھڑا رہ کر واپس چلا گیا، اس نے وہاں سے اشرفیوں کا توڑا شیخ کو بھیجا کہ یہ قبول کرلیں، شیخ نے یہ توڑا یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ اپنے آقا سے سلام کہنا اور یہ کہنا کہ ''جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا'' 'سَلِّمْ عَلَى مَوْلَاكَ وَ قُلْ لَهُ: مَنْ يَمُدُّ رِجْلَهُ لَا يَمُدُّ يَدَهُ!'۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا واقعہ

اسی طرح کا ایک قصہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ہے، کہ ان کو سردیوں میں دھوپ

لینے کی ضرورت تھی، سڑک کے کنارے کی طرف پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے، معلوم ہوا کہ بادشاہ کی سواری گزرنے والی ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! ابھی بادشاہ کی سواری گزرنے والی ہے، آپ پاؤں سمیٹ لیتے تو اچھا تھا، آپ نے یہ سن کر بڑا بلیغ جملہ کہا: "جو ہاتھ سمیٹ لیتا ہے، اس کو پاؤں سمیٹنے کی ضرورت نہیں"، یعنی بادشاہ کی مدد سے جو ہاتھ سمیٹ لے، اس کی کوئی مدد قبول نہ کرے، تو پھر اس کو پاؤں سمیٹنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

اپنے ضمیر کو آزاد رکھیں

آپ اپنے کو پوری طرح آزاد رکھیے، کسی حکومت کی سرپرستی اور کسی مالی سرچشمہ اور سرپرستی سے آزاد رہیے، اس وقت یہ عام ہوا چلی ہوئی ہے کہ عربی پڑھنے والے خلیجی ملکوں میں اور خاص طور پر سعودی عرب جاتے ہیں تاکہ بڑی نوکری تلاش کریں، میں بڑی صفائی سے کہتا ہوں کہ اس ملت کا سب سے بڑا فریضہ اور وقت کا جہاد یہ ہے -جس کی اللہ کے یہاں بڑی قدر و قیمت ہوگی- کہ آپ بلاد عربیہ دعوت دینے کے لیے جائیں، جہاں سے ہمیں ایمان کی دولت ملی، ان عربوں کو ان کا فریضہ یاد دلانے کے لیے جائیں، آپ کے عربی پڑھنے کی یہی قیمت ہے، الحمدللہ یہاں ایسا لٹریچر تیار ہو گیا ہے جس نے وہاں تک ہماری آواز پہنچائی، عرب قوم پرستی کے خلاف سب سے زیادہ مؤثر اور طاقتور آواز ندوۃ العلماء سے بلند ہوئی۔

عزیزو! آپ اپنے ضمیر کو آزاد رکھیں، اور اپنے جسم کو بھی آزاد رکھیں، اس وقت بہت بڑا خطرہ پیدا ہو گیا ہے، وہ خطرہ یہ ہے کہ اماموں اور مؤذنوں کی تنخواہوں کے لیے باقاعدہ تحریک چلائی جا رہی ہے کہ انہیں حکومت کے خزانے سے تنخواہیں اور تمام سہولتیں دی جائیں، اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اماموں سے الیکشن کے موقع پر کام لیا جائے گا، مسلم پرسنل لا بورڈ کے خلاف کام لیا جائے گا، اس لیے کہ جب مساجد محکمۂ اوقاف کے ماتحت ہوں گی، اور وہ سرکاری ملازم قرار پائیں گے، تو ایسے ائمہ مساجد کے منبروں سے آزادی کے ساتھ دین کی بات نہیں کہہ سکیں گے، اس لیے آپ اپنے دین کی حفاظت کیجیے، عقائد کے لحاظ سے بھی، اور اعمال کے لحاظ سے بھی، حقوق کے لحاظ سے بھی، اور فرائض کے اعتبار سے بھی۔

اصلاح معاشرہ اور آپ کی ذمہ داریاں

أَمَــانَتَكَ کا مطلب یہ ہے کہ ملت کی طرف سے، اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف سے آپ پر کیا ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں، ملت کن خطرات سے گزر رہی ہے، کس وادی پرخار سے وہ گزر رہی ہے، آج مسلم پرسنل لا بورڈ کو مٹانے کی کیسی کیسی کوششیں کی جارہی ہیں، مشرکانہ تعلیم کے ذریعہ، جبری طور پر نئی نسل کو کس طرح نئے سانچے میں ڈھالنے کی سرتوڑ کوشش ہورہی ہے، اور یہ منصوبہ ہر جگہ تیار ہے کہ مسلمان صرف نام کے باقی رہیں، باقی ان کی تمام خصوصیتیں ختم ہوجائیں، اس ملک کو اسپین بنانے کی زبردست سازش کی جارہی ہے۔

آپ کو اصلاح معاشرہ کا کام بھی کرنا ہے، کہ یہ بھی (دِيْـنَـكُـمْ) میں شامل ہے، اس وقت جاہلی رسوم ورواج وبا کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ دولت پرستی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ معمولی چیز کی خاطر جانیں لی جارہی ہیں، آپ کو اس کے خلاف بھی مہم چلانی ہے، بلکہ اس مہم کی پوری ذمہ داری آپ کو قبول کرنی ہے، پھر ثقافتی اور فکری لحاظ سے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی آپ کو حفاظت کرنی ہے، رسم الخط اور کلچر کے لحاظ سے بھی اور زبان کے اعتبار سے بھی، اگر آپ قربانیاں دیں گے، زہد واستغناء سے کام لیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا، یہ ملت اپنے تشخصات کے ساتھ باقی رہے گی۔

حفاظت دین کا وعدہ

اور یہ دین باقی رہنے ہی کے لیے آیا ہے، اس وقت یہودیت، عیسائیت، ہندوازم، بودھ ازم، یہ تمام ادیان و مذاہب نہ صرف بدل گئے، بلکہ ان کی اصل شکل ایسی بگڑ گئی کہ ان کو پہچاننا ناممکن ہوگیا ہے، پھر ان مذاہب وادیان میں طویل عرصہ سے اصلاح وتجدید کی کوئی تحریک نہیں اٹھی، اسی وجہ سے یہ سب مٹ گئے، صرف اسلام اپنی اصل شکل میں روح کے ساتھ باقی ہے، عقائد سے لے کر فرائض تک، سنن سے لے کر مستحبات تک، اخلاق سے لے کر معاملات اور اور تہذیب تک سب باقی ہے، قرآن باقی ہے اور اس کی زبان باقی ہے، اس

کے ایک ایک حرف بلکہ حرکات وسکنات تک باقی ہیں۔

اس کی بنیادی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بقا کی ذمہ داری لی ہے اور فرمایا کہ اسلام ایک مکمل اور پسندیدہ دین ہے: ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ [1] (دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے)، اور ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْناً﴾ [2] (آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کردیا، اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مجددین اور مصلحین کا تسلسل ہے جو اس امت کی تاریخ میں کبھی ٹوٹنے نہیں پایا، یہ واحد دین ہے جس میں کوئی صدی اور کوئی ملک خالی نہیں رہا، اگرچہ اس کا پورا استیعاب نہیں کیا گیا لیکن ہندوستان کی حد تک استیعاب سے کام لیا گیا ہے، ہماری کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' میں دوسرے ملکوں کے مجددین کا بھی ذکر ہے۔

علم کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا

آخر میں آپ سے کہوں گا کہ اپنے ادارے سے تعلق رکھیے، بہت سے لوگ ہیں جو فارغ ہونے کے بعد یہاں آئے بھی نہیں، اس کا منہ نہیں دیکھا، اور نہ معلوم کیا کہ اس پر کیا گزری اور گزر رہی ہے۔

اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ اپنا مطالعہ جاری رکھیے، کہ علم کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا، علم برابر تازہ ہوتا رہتا ہے، اس میں ترقی بھی ہے، تغیر بھی ہے، پھیلاؤ بھی ہے، یہاں کے ترجمان 'البعث الإسلامي'، 'الرائد' اور 'تعمیر حیات' کا مطالعہ کیجیے، 'دارالمصنفین' اور 'مجلس تحقیقات ونشریات اسلام' نے ماشاء اللہ اچھا خاصا لٹریچر تیار کردیا ہے، آپ ان کو پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں۔

ندوۃ العلماء کے قیام میں وقت اور نبض شناسی اور ملت کی حاجت جیسے محرکات شامل ہیں، یہی محرکات تھے جنھوں نے عالم ربانی مولانا محمد علی مونگیریؒ کے دل میں تحریک پیدا کی،

(۱) سورة آل عمران:۱۹ (۲) سورة المائدة:۳

چونکہ وہ عیسائیت کے رد میں مناظرے بھی کرتے تھے، اس سے ان کو اندازہ ہوا کہ انگریزی زبان سے اور انگریزی مصنفین کے اسالیب سے واقفیت ضروری ہے، چونکہ مستشرقین ایک خاص مقصد کے لیے کام کر رہے تھے، اور بڑی ذہانت اور ہوشیاری سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کر رہے تھے، اس لیے کہ وہی طبقہ اقتدار میں آتا ہے، بلاد عربیہ میں اس وقت وہی طبقہ برسر اقتدار ہے جو یورپ و امریکہ کا تعلیم یافتہ ہے، اس لیے ایسی صورت میں ہمیں اس کی خاص طور سے تیاری کرنی ہوگی کہ ایسا لٹریچر تیار کریں جو تعلیم یافتہ ذہنوں کو متاثر کرے، اور اسلام کی ہر دور میں انسانی قیادت کی صلاحیت پر ایمان ان کے دل و دماغ میں راسخ کرے، اس طبقہ کو مطمئن کرنے کی تیاری بھی آپ کے ذمہ ہے، حالات اور رجحانات کا برابر محاسبہ کرتے رہنا بھی ندوی فضلاء کی ذمہ داری ہے، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ طبقہ کون سی زبان سمجھتا ہے، کون سے دلائل اس کے سامنے پیش کرنے چاہئیں، کس اسلوب میں اس سے گفتگو کرنی چاہیے۔

اس مجلس میں جن عزیزوں نے اپنے تأثراتی مقالے عربی اور اردو میں پیش کیے اور تقریریں کی گئیں، وہ ہماری توقع سے بڑھ کر تھیں، امید ہے کہ استعداد نہ صرف قائم رہی گی، بلکہ مزید ترقی کرے گی۔(۱)

---

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلبہ کے سامنے ۸ دسمبر ۱۹۹۶ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا عبدالمقیت قاضیا ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات'' لکھنؤ (شمارہ ۲۵ ردسمبر ۱۹۹۶ء)۔

فارغین ندوہ کی ذمہ داریاں

برادران گرامی قدر اور عزیز فرزندانِ دارالعلوم ندوۃ العلماء!

عرصہ سے یہ خیال دل میں آرہا تھا کہ آپ سے غائبانہ باتیں کروں، غائبانہ اس لیے کہ آپ اتنے شہروں بلکہ دور دور ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں کہ سب کا جمع ہونا ناممکن ہے، آپ میں کچھ ایسے حضرات ہوں گے جن کو دارالعلوم چھوڑے ہوئے چالیس پچاس سال ہو چکے ہوں گے، کچھ کو دوبارہ دارالعلوم آنے اور دیکھنے کا موقع ملا ہوگا، کچھ کو نہیں، دارالعلوم چھوڑے ہوئے جو مدت بھی گزری ہو، لیکن طالب علمی کے زمانے کی باتیں اور یادیں اب بھی طالب علم ہی بن کر سامنے آتی ہوں گی، اور طالب علمانہ شوخیوں اور شرارتوں، باہمی نوک جھونک، کھیل کود بلکہ اچھل کود، بحث و مباحثہ، مطالعہ و مذاکرہ، 'الاصلاح' کے اسٹیج پر تقریری مقابلے اور ہماہمی، دارالاقامہ کا ایک خاص ماحول اور درجوں میں آنے جانے کے مناظر سبھی کچھ نگاہوں میں اسی طرح پھر رہے ہوں گے جیسے ابھی کل کی بات ہے۔

جو جانے کے بعد اب تک نہ آسکے، ان کے تصور و خیال میں دارالعلوم اپنے ظاہر میں پودہ ہی نظر آرہا ہوگا جو اب تک ایک تناور درخت بن چکا ہے، اور معنوی اعتبار سے عرب و عجم میں اس کا چرچا ہے، اس کا نام ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے، آپ جب یہاں رہے ہوں گے تو آپ کو کچھ شکایتیں بھی رہی ہوں گی جو طبعی بات ہے، ایسی کہ گھر اور خاندان کے بہت محدود ماحول میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے، لیکن گھر بہر حال اپنا گھر ہوتا ہے، اس کے نقوش ذہنوں سے محو نہیں ہوتے، اور نہ ہی اپنے گھر سے کسی ذی شعور کو بیر ہوتا ہے، آپ اپنے مادر علمی سے نکل کر دنیا کے مختلف ملکوں، اور زندگی کے مختلف شعبوں میں پھیل گئے ہیں، آپ

امریکہ میں بھی ہیں، برطانیہ میں بھی، آپ ترکی وافریقہ میں بھی ہیں اور مصر وحجاز میں بھی، خلیج و امارات میں بھی ہیں، انڈونیشیا وملیشیا میں اور نیپال و پاکستان میں بھی، آپ یونیورسٹی اور کالجوں میں بھی ہیں اور مدارس ومکاتب میں بھی، آپ میں سے کچھ مختلف ملکوں میں مسجدوں کے خطیب وامام بھی ہیں، آپ میں مصنف ومؤلف بھی ہیں جو ذہنوں کی تشکیل اور اسلام کی وکالت کا فریضہ انجام دیتے ہیں، کسی ادارہ کے لیے یہ بڑے شرف کی بات ہے کہ اس کے ہونہار سپوت زندگی کے مختلف حساس شعبوں میں اس طرح کام کر رہے ہوں۔

آپ نے دار العلوم میں رہ کر ندوۃ العلماء کے معتدل ومتوازن فکر پر بار ہا تقریریں کی اور سنی ہوں گی، لیکن اب جبکہ آپ زندگی کے میدان میں ہیں، اس معتدل اور متوازن فکر سے کتنا کام لے رہے ہیں، اس پر غور کرنا چاہیے، اس کا جائزہ بھی لینا چاہیے کہ اس فکر پر حالات اور ماحول کا گرد وغبار تو نہیں پڑ گیا ہے، اور اسی کے ساتھ اس کو تازہ کرنے کے لیے اپنے مادر علمی سے ایک فرزند صالح کی طرح تعلق ورابطہ رکھنا چاہیے، اور یہاں کے پیغام ولٹریچر کو دوسروں تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے، کہ اس کی ضرورت آج کل سے بھی زیادہ ہے، اور جتنا زمانہ آگے بڑھتا جائے گا ندوۃ العلماء کے مسلک اور اسلوبِ دعوت کی ضرورت بڑھتی جائے گی ،ذہن میں تازہ رکھنے کے لیے ندوۃ العلماء کے مسلک کو ہم پھر سے دہراتے ہیں۔

ندوۃ العلماء کا مسلک

’’دین وعقائد کے معاملہ میں ندوۃ العلماء کے مسلک کی بنیاد دین خالص پر ہے، جو ہر قسم کی آمیزش اور آلائش سے پاک ، تاویل اور تحریف سے بلند، ملاوٹ اور فریب کی دسترس سے دور اور ہر اعتبار سے مکمل اور محفوظ ہے۔

دین کی فہم اور اس کی تشریح اور تعبیر میں اس کی بنیاد اسلام کے اولین اور صاف وشفاف سرچشموں سے استفادہ، اور اس کی اصل کی طرف رجوع پر ہے۔

اعمال اور اخلاق کے شعبہ میں دین کے جوہر ومغز کو اختیار کرنے، اس پر مضبوطی سے

قائم رہنے، احکام شریعہ پر عمل، حقیقت دین اور روح دین سے زیادہ قربت اور تقویٰ اور اصلاح پر ہے۔

تصورِ تاریخ میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اسلام کے ظہور اور عروج کا دورِ اول سب سے بہتر اور قابلِ احترام دور، اور وہ نسل جس نے آغوشِ نبوت اور درس گاہِ رسالت میں تربیت پائی، اور قرآن و ایمان کے مدرسہ سے تیار ہو کر نکلے، سب سے زیادہ مثالی اور قابلِ تقلید نسل ہے، اور ہماری سعادت و نجات اور فلاح و کامرانی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کریں، اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

نظریۂ علم و فلسفۂ تعلیم میں اس کی اساس اس پر ہے کہ علم بذاتِ خود ایک اکائی ہے، جو قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کی جا سکتی، اگر اس کی کوئی تقسیم ممکن ہے تو وہ صحیح اور غلط، مفید اور مضر، اور ذرائع اور مقاصد کے اعتبار سے ہوگی۔

استفادہ اور افادہ اور ترک و قبول کے شعبہ میں اس کا عمل اس حکیمانہ نبوی تعلیم پر ہے کہ ''حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے، جہاں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے''، نیز قدیم حکیمانہ اصول ''خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدِرَ'' پر، (یعنی جو صاف و نظیف ہو، اس کو لے لو، اور جو آلودہ اور کثیف ہو، اس کو چھوڑ دو)۔

اسلام کے دفاع اور عصرِ حاضر کی بد دین قوتوں کے مقابلہ میں اس کی اساس اس ارشادِ ربانی پر ہے کہ ﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ﴾ [1] (ان کے مقابلے کے لیے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے، تیار کرو)۔

دعوت الی اللہ، اسلام کے محاسن اور فضائل کی تشریح، اور ذہن و عقل کو اس کی حقانیت و صداقت پر مطمئن کرنے میں اس کا عمل اس نبوی حکیمانہ وصیت پر ہے کہ ''كَلِّمُوا النَّاسَ عَلَى قَدْرِ عُقُولِهِم، أتريدون أن يُكَذَّبَ اللّٰهُ و رسولُهُ؟'' (لوگوں سے ان کی عقلوں کا خیال رکھتے ہوئے گفتگو کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ خدا اور رسول کو جھٹلا دیا جائے؟)۔

عقائد و اصول میں وہ جمہور اہل سنت کے مسلک کی پابندی اور سلف کے آراء اور

(۱) سورۃ الأنفال: ٦٠

تحقیقات کے دائرہ میں محدود رہنا ضروری سمجھتا ہے، فروعی وفقہی مسائل کے بارے میں اس کا مسلک واصول یہ ہے کہ حتی الامکان اختلافی مسائل کو چھیڑنے اور ہر ایسے طرز عمل سے احتراز کیا جائے جس سے باہمی منافرت بڑھے، اور امت کا شیرازہ منتشر ہو، سلف صالحین سے حسن ظن رکھا جائے، اور ان کے لیے عذر تلاش کیا جائے، اسلام کی مصلحتِ اجتماعی کو ہر مصلحت پر ترجیح دی جائے۔

مختصراً یہ کہ وہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے علمی وفکری اور کلامی وفقہی مدرسۂ فکر سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، اس لحاظ سے ندوۃ العلماء ایک محدود تعلیمی مرکز سے زیادہ ایک جامع اور کثیر المقاصد دبستانِ فکر اور مکتب خیال ہے"۔

آپ کی ذمہ داریاں

ہماری خواہش وتمنا یہ رہتی ہے کہ آپ جہاں کہیں بھی ہوں، اپنے مرکز اصلی اور مادر علمی سے برابر رابطہ قائم رکھیں، اس کے حالات وضرورتوں سے باخبر رہیں، یہاں سے نکلنے والے اخبار ورسائل کا مطالعہ ضرور کرتے رہیں کہ یہ رابطہ کا ایک مناسب ترین ذریعہ بھی ہے، اور اس سے ندوۃ العلماء کا کام وپیغام بھی تازہ ہوتا رہے گا، ندوۃ العلماء حالات وخطرات کا جس طرح مقابلہ کرتا ہے، فکر اسلامی کو نمایاں اور واضح کرتا ہے، اٹھنے والے ہر نئے فتنے کا بلاخوف لومۃ لائم جس طرح مقابلہ کرتا ہے، اس کا نہ صرف یہ کہ آپ کو علم ہوتا رہے گا، بلکہ اس سے آپ کی بجھی اور دبی ہوئی امنگوں میں حرارت وزندگی بھی پیدا ہوگی، جس کو زندگی کی ہنگامہ خیزی متاثر کرتی رہتی ہے۔

اس وقت دنیا میں اسلام ومسلمانوں کے خلاف جو تند وتیز ہوائیں چل رہی ہیں، اس سے آپ بخوبی واقف ہیں، ایسے میں آپ جہاں کہیں بھی رہیں اپنی بساط بھر پور 'ندویت' کی ذمہ داری کو نبھایئے، اور اپنے مادرِ علمی کے دودھ کا حق ادا کیجیے۔

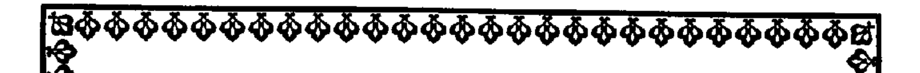
کیا اچھا ہوتا کہ آپ جہاں کہیں بھی ہیں، اور جو کچھ بھی ہیں، اس سے اپنے مادرِ علمی کو باخبر کریں، اور مشورہ کی ضرورت ہو تو مشورہ لیں، خود آپ سے وقت ضرورت پر اس علاقہ سے

متعلق، وہاں کے حالات سے متعلق مشورہ لیا جاسکے، جہاں آپ رہتے ہیں۔

اس امید کے ساتھ آپ کو یہ سطریں لکھی جارہی ہیں کہ آپ مادرِ علمی سے ایک عرصۂ دراز سے بے تعلق رہنے کے حجابات کو ختم کر کے اپنے ربط و تعلق کی تجدید کریں گے، اور اس پر خوب غور کریں گے کہ موجودہ حالات میں جہاں صرف مال و جاہ کی ریس ہے، ایک عالمِ دین کی حیثیت سے، اپنے سر پر وراثتِ نبوت کا تاج رکھنے کی حیثیت سے، آپ پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب (۱)

(۱) ماخوذ از پندرہ روزہ "تعمیر حیات"، لکھنؤ، (شمارہ ۱۰/ اکتوبر ۱۹۹۱ء و ۱۰/ جنوری ۱۹۹۴ء)۔





اہمیت وضرورت اور مقاصد

مدارس اسلامیہ کا مقام ومرتبہ، معاشرہ میں اس کی اہمیت وافادیت،
اس کے خلاف ریشہ دوانیوں کے دفاع کی تدابیر، اس کی جانب
منسوب افراد کی کوتاہیاں اور ان کی ذمہ داریوں کا ایک جامع مرقع







سید احمد شہید اکیڈمی
دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی